۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں

اسلامی تحریکیں

ڈاکٹر اقتدار محمد خاں

انتساب

اپنی ماں محترمہ رفعت اقبال کے نام

ماں ——————

جس کے تخلیقی کرب کی ایک کراہ کا بدل ساری
زندگی کی خدمت نہیں ہو سکتی۔ (قرآن)

ماں ——————

جس کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ (حدیث)
جس کا حق باپ سے تین گنا زیادہ ہے۔ (حدیث)

ہاں ——————

پاکیزہ جذبوں کی حامل
صبر و رضا کی پیکر
ایثار و قربانی کا اعلیٰ نمونہ
آج بھی جس کی آغوشِ محبت میں سمٹ کر میں سارے جہان کی
مسرتوں سے ہمکنار ہو جاتا ہوں۔

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش
لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

ترتیب مضامین

باب اوّل۔ جماعت اسلامی

باب دوم۔ تبلیغی جماعت

باب سوّم۔ جمعیۃ العلماءِ ہند

باب چہارم۔ دارالعلوم دیوبند

باب پنجم ۵ دارالعلوم ندوۃ العلماء

باب ششم۔ اسلامی تحریکوں کے مسلم معاشرے پر اثرات کا جائزہ

غالباً یہ ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔ اس زمانہ میں عزیزم نوید اقبال (اقتدار محمد خاں) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی میں بی۔ اے۔ آنرز کر رہے تھے۔ اُن کا دوسرا سال تھا۔ میں اُن سے ملنے کے لئے یونیورسٹی گیا ہوا تھا اپنے قیام کے دوران میں نے اسلامیات پر ان کے تیار کئے ہوئے نوٹس دیکھے۔ نوٹس پڑھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ان نوٹس سے اسلام کی بہت ہی پست تصویر اُبھر کر میرے سامنے آئی تھی۔

میں نے ان نوٹس کے حوالے سے عزیزم نوید اقبال سے بات کی اور کہا کہ تم اسلام کی صحیح تعلیمات سے اچھی طرح واقف ہو پھر اس طرح کے نوٹس کس لئے تیار کئے ہیں۔ عزیزم نوید اقبال نے بتایا کہ یہ نوٹس میں نے نہیں بنائے ہیں بلکہ میرے ایک ساتھی کے ہیں اور یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق ہیں۔ امتحان میں اچھے نمبروں کے حصول کے لئے یہی نوٹس سودمند ہوں گے۔

میری حیرت و استعجاب میں اور اضافہ ہو گیا۔ مسلم یونیورسٹی میں مسلمان طلبا کو اسلام کی ایسی ناقص تصویر سے واقف کرایا جا رہا ہے۔ دینی درسگاہیں جو کبھی اسلام کا قلعہ ثابت ہو رہی تھیں۔ بقول ایک اسلامی مفکر اب ایک عرصہ سے اپنا کلنڈر بدلنا بھول گئی ہیں اور مسلم یونیورسٹی نے اپنا کلنڈر ایسا بدلا ہے کہ سبھی کچھ بدل دیا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے غالباً اسی احساس کی بنیاد پر یہ شعر کہا تھا۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا

عزیزم نوید اقبال نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی میں بی۔ اے آنرز کرنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں ایم۔ اے اسلامیات میں داخلہ لیا۔ یہاں بھی نصاب کا تقریباً یہی حال تھا۔

میں نے ان ہی ایام میں طے کیا کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے کچھ ہوش مند اسلامیات کے استادوں کے حوالے سے اسلام کی صحیح تصویر مسلمان طلباء کے سامنے لانے کی کوشش کی جائے۔

میں اسی جستجو میں تھا کہ اللہ رب العزت نے عزیزم نوید اقبال کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں تدریس کا موقع عنایت فرمایا اور اس سلسلہ میں عزیزم نوید اقبال نے میری دیرینہ خواہش کو بروئے کار لانے کے لئے ہندوستان کی اسلامی تحریکوں پر تحقیق کا کام شروع کیا اور اس التزام کے ساتھ شروع کیا کہ جب یہ تحقیقی کام مکمل ہو کر کتاب کی صورت میں منظر عام پر آئے تو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے علاوہ دوسرے مسلم تعلیمی اداروں کے طلبار کے لئے اسلام پر ایک بہتر نصابی کتاب کا کام دے سکے۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تحریکوں

پر تحقیقی کام مکمل ہو کر کتابی صورت میں اب ہمارے سامنے ہے۔ چند اہم باتیں جو ہمیں اس تحقیقی مقالہ کے مطالعہ سے پہلے اور مطالعہ کے دوران اپنے پیش نظر رکھنا ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

اوّل دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جمعیۃ العلماء ہند، تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی ہند اب اپنی ہیئت اور کردار سے کیسے کچھ نظر آتے ہوں لیکن ان اسلامی تحریکوں نے اپنے اپنے وقت میں اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی بہت زبردست خدمت انجام دی ہے اور اپنے اپنے طور پر مسلمانوں کے تمام شعبہ ہائے زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔

دوم ہندوستان کی ان تمام اسلامی تحریکوں میں ایک معنوی ربط اور نظم ہے۔ تحریک دارالعلوم دیوبند سے لے کر جماعت اسلامی ہند تک، ان کے درمیان جو بظاہر فرق نظر آتا ہے۔ وہ بعض تحریکی قائدین اور ارکان میں تحریکی شعور نہ ہونے کے سبب پیدا ہوا ہے اور مصنوعی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی ساری اسلامی تحریکیں ایک ہی روح اور ایک ہی جذبہ کی حامل ہیں کہ اس ملک میں اسلام اور مسلمان نہ صرف زندہ رہیں بلکہ غالب ہو کر رہیں۔

سوم۔ ملّت اسلامیہ کے عروج و زوال کا معاملہ پوری طرح اسلام سے وابستہ ہے۔ یعنی ملّت اسلامیہ جب بھی اسلام سے بے تعلقی اور دوری کا رویّہ اختیار کرے گی اور اسلام سے اپنی وابستگی صرف اپنے آباؤ اجداد کی میراث سمجھ کر رکھے گی تو یقیناً زوال و انحطاط کا شکار ہوگی۔ اور جب اسلام سے اپنا تعلق مضبوطی کے ساتھ استوار کرے گی۔ اسلام کو اپنی پوری زندگی کا لائحہ عمل بنائے گی تو پھر حقیقی سربلندی اور کامیابی و کامرانی اس کا مقدر بن کر رہے گی۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ چودہ سو سالہ پوری اسلامی تاریخ

اس کی گواہ ہے ؎

خلاف پیغمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز منزل نخواہد رسید

چہارم۔ اسلام ہر دور میں دنیا کی رہنمائی کرنے اور ہر منزل پر تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ـــــ

"آج کے دن میں نے تمھارے لئے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمھارے لئے پسند کر چکا۔" (سورہ المائدہ۔ ۳)

محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :

"اس دین کی بنیاد اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہے۔ مگر یہ زندگی سے پُر ہے اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے۔ یہ کسی دور کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہے جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو اور اپنی زندگی کھو چکا ہو بلکہ یہ ایک زندہ دین ہے۔"

محترم عبدالقادر عودہ شہید سابق چیف جسٹس مصر اپنی کتاب "قانونِ الٰہی یا انسانی" میں لکھتے ہیں :

اسلامی شریعت کسی ایک وقت، کسی ایک دور یا کسی ایک زمانے کے لئے نہیں ہے بلکہ رہتی دنیا تک ہر وقت، ہر دور اور ہر زمانے کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ شرعی احکام اس طرح وضع کئے گئے ہیں کہ وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تروتازگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اور بدلے ہوئے حالات کے زیر اثر ان کے بنیادی قواعد وضوابط میں کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

یہ قواعد وضوابط اتنے ہمہ گیر ہیں کہ کوئی بھی نئی صورت حال ان کے دائرہ کار سے باہر نہیں رہ سکتی۔"

آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ عزیزم مقالہ نگار نے دینی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے اسلام کے پس منظر میں ہندوستان کی تمام اسلامی تحریکوں کے حوالے سے اصل اور زندۂ جاوید اسلام پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

وہ اپنے اس عظیم مقصد میں کس حد تک کامیاب ہے اس کا فیصلہ مقالہ کے مکمل مطالعہ اور اخلاص ہی سے ممکن ہے۔

مقدمہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی تقریباً ایک ہزار سالہ تاریخ ہے اس ایک ہزار سالہ مدت میں مسلمانوں نے اس ملک اور اس ملک کے رہنے والوں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس ملک اور اس کے رہنے والوں کو بہت کچھ دیا بھی ہے آج زندگی کا کوئی گوشہ کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، دین و علم کے نہ مٹنے والے نقوش ثبت نہ ہوں۔

عہد سلطنت (Sultanat e Period) کی ابتداء سے لے کر مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر تک اس ملک کے بیشتر حصوں میں مسلمانوں کی حیثیت فاتحانہ اور حکمرانہ رہی ہے۔ اس باعث ان کی مذہبی روایات بھی بڑی حد تک محفوظ رہی ہیں بلکہ ان میں اضافہ بھی ہوا ہے۔ پھر مسلمانوں نے اس ملک میں تنہا نئی ہندوستانی تہذیب کو پروان نہیں چڑھایا ہے بلکہ زندگی کے ہر میدان میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ یہی طرز عمل مسلمان حکمرانوں نے بھی اپنایا کہ ایک طرف اگر انھوں نے مسلمانوں کو زندگی کے مختلف میدانوں میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے تو غیر مسلموں کے لئے بھی بالکل اس طرح آگے بڑھنے اور ترقی کے راستے پر گامزن ہونے کے لئے راستے ہموار کیے ہیں۔

یہی وجہ ہے مسلمان حکمرانوں کے یہاں بہت سے قابل لحاظ عہدے جاگیریں غیر مسلم حضرات کو بھی دی گئیں۔ ان کی مذہبی روایات کا تحفظ کیا گیا' ان کی عبادت گاہوں کے لئے جاگیریں وقف کی گئیں۔

لیکن جب سے انگریزوں نے اس ملک میں اپنے قدم جمائے تو انھوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" (Divide & Rule) کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے یہاں کے دو بڑے مذہبی فرقوں کے درمیان خوب جم کر نفرت کے بیج بوئے جس کے نتیجے میں ان دونوں فرقوں کے درمیان دوری پیدا ہوئی اور اب دونوں ہی ایک دوسرے پر شک وشبہ کا اظہار کرنے لگے ہیں۔

پھر انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت براہ راست مسلمانوں سے حاصل کی تھی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمان ہی آگے آگے تھے اس وجہ سے انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنا حقیقی دشمن سمجھتے ہوئے انھیں زندگی کے ہر میدان سے بے دخل کرنے کی پوری پوری کوشش شروع کر دی۔

نتیجتاً ہندوستان میں مسلمان تیزی کے ساتھ تنزّل کا شکار ہونے لگے ، اور پسماندگی ان کا مقدر بننے لگی۔

ان حالات کے نتیجے میں مسلمانوں میں کچھ ایسی شخصیات پیدا ہوئیں جنھوں نے مسلمانوں کے سیاسی تعلیمی مذہبی معاشرتی اور تمدنی حالات کا جائزہ لیا اور ان کی پسماندگی دور کرنے کی تدابیر اختیار کیں اس وجہ سے ہندوستان میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں کئی اہم اسلامی تحریکیں وجود میں آئیں جن کا جائزہ اس مقالہ کا موضوع ہے۔

لیکن اس سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی، مذہبی، معاشرتی حالات کیا تھے ان کا ایک سرسری سا جائزہ لے لیا جائے۔

اُنیسویں[19] صدی عیسوی اور بیسویں[20] صدی کے پہلے نصف میں ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی حالات

انیسویں[19] صدی عیسوی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے انتہائی کش مکش کا دور تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کی تکمیل اس صدی میں ہوئی اورنگ زیب عالم گیر کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی ساتھ سو سالہ حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ مرکزی حکومت کمزور ہو کر جو ہمیشہ سے ہندوستان کا مقدر رہا ہے، صوبوں اور خود مختار ریاستوں میں تبدیل ہونے لگی۔

محترم سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں ـــــ

"کس قدر عجیب اور افسوس ناک بات ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر جیسا ہمہ صفت موصوف بادشاہ تقریباً اکیاون[51] سال بکمال دبدبہ و حشمت ہندوستان کے تخت پر متمکن رہ کر حکومت کرتا ہے لیکن جب وہ دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ حکومت کی عمارت کو گھن لگ چکا ہے، اور اب وہ زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکتی"[1]

چنانچہ حکومت کی باگ ڈور ایک کے بعد ایک ایسے نااہل حکمرانوں کے ہاتھوں میں آنے لگی جنھوں نے مرکزی حکومت کے کمزور ہونے میں بتدریج اضافہ کیا اور اپنوں او

---

[1] سعید احمد اکبر آبادی، مسلمانوں کا عروج و زوال، ص ۳۲۵

پرایوں کی سازشوں کا شکار ہوتے رہے۔ مرکزی حکومت کی اس کمزوری سے مرہٹوں جاٹوں، سکھوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ یہ لوگ نہ صرف مرکزی حکومت سے برسرِ پیکار رہے بلکہ آپس میں بھی جنگ وجدل میں مبتلا رہے جس کے نتیجے میں خود ان کی اپنی قوت میں بھی کمزوری پیدا ہوئی۔

اس عرصہ میں ایک نئی طاقت سامنے آئی جو ایک طرف اپنے بازو کو مضبوط کر رہی تھی اور دوسری طرف ہندوستان کی سیاست کے آثار چڑھاؤ کا بغور مطالعہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنے زور وبازو کی پہلی نمائش "پلاسی" کے میدان میں کی۔ یہ طاقت انگریزوں کی تھی جو ایک تاجر کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے تھے۔ پلاسی کی کامیابی سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ حالانکہ اس کے بعد ۱۷۵۶ء میں سراج الدولہ نے انگریزوں کو کلکتہ سے باہر کر دیا تھا مگر بعد میں باغیوں کو معاف کر دیا گیا لہٰذا پھر سے انگریزوں کو موقع فراہم ہوگیا اور انھوں نے ایک طویل مدت تک ہندوستانیوں کی کمزوریوں کا جائزہ لینے کے بعد ملک کے انتظامی معاملات میں مداخلت شروع کر دی اور جن راستوں سے داخل ہونا ممکن نہ تھا ان سے اندر آ گئے۔[1]

انگریزوں کی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب خورشید مصطفیٰ رضوی تحریر کرتے ہیں:

> "یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ہندوستان کو انگلستان نے اپنی تلوار سے فتح نہیں کیا بلکہ خود ہندوستانیوں کی تلوار سے رشوت، سازش اور دورُخی پالیسی پر عمل کر کے ایک جماعت کو دوسری سے ٹکرا کر یہ ملک حاصل کیا تھا۔"[2]

---

[1] باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۲۲۵ بحوالہ ڈاکٹر اقبال حسن خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے ص ۲۹

[2] خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۳۴ بحوالہ اقبال حسن خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے ص ۲۹، ۳۰

اگر ہم دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انگریز جب تک یہاں رہے تو ان کی یہی کوشش رہی کہ یہاں کے باشندوں میں اتحاد کی فضا پیدا نہ ہونے پائے اس کے لئے انھوں نے فرقہ وارانہ منافرت پھیلائی۔ ہندو اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرائے۔ خود مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرایا جس کے نتیجے میں نہ صرف مسلمان ہمہ پہلو زوال سے دوچار ہوئے بلکہ پورا ملک مختلف حصوں اور خطوں میں تقسیم ہوکر کمزور ہوا اور یہی انگریزوں کا اصل مقصد تھا۔ بہر حال اس وقت مسلم عوام آپسی اختلاف کا شکار تھے اور بادشاہ و امراء ہر خطرے سے بے خبر ہوکر عیش و عشرت میں مصروف تھے۔

دوسری طرف سکھوں، مرہٹوں، راجپوتوں، جاٹوں، نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے مغلیہ حکومت کو پوری طرح کمزور و بے آسرا کر دیا۔ انگریزوں کے لئے ملک کے یہ حالات بہت سازگار ثابت ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں نے ہندوستان کی سیاسی فضا کو سازگار پاکر تجارت سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد سیاسی میدان میں زور آزمائی شروع کر دی۔ ان کے مقابلے کے لئے والیٔ میسور ٹیپو سلطان اٹھے اور ایک زمانے تک انگریزوں کو روکے رہے مگر خود اپنے لوگوں کی غداری کی وجہ سے ۱۷۹۹ء میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید کر دئے گئے[۱]

سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں کے لئے میدان خالی ہوگیا۔ "پلاسی" کے بعد یہ دوسری اہم فتح انگریزوں کو ہوئی جس نے ان کے حوصلے اور بلند کر دئے۔ بادشاہ دہلی کے اختیارات روز بروز کم ہوتے جا رہے تھے لیکن پھر بھی ہندوستان کی عام رعایا کی نظر میں بادشاہ کا ایک وقار اور اس کے لئے جذبہ ہمدردی برقرار تھا۔ بنگال میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی[۲]۔ ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم بادشاہ

---

[۱] ندوی، سید ابوالحسن علی، ہندوستانی مسلمان، لکھنؤ، ص ۱۳۸

[۲] ڈاکٹر محمد اشرف، ہندوستانی مسلم سیاست پر ایک نظر، ص ۱۳ بحوالہ، ڈاکٹر اقبال حسن خاں شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے ص ۳۳

دہلی کے زمانے میں لارڈ لیک (Lord Lake) دہلی میں فاتحانہ داخل ہو گیا اور مرکزی حکومت کا نام نہاد بادشاہ شاہ عالم انگریزوں کا پنشن خوار بن گیا۔ ہندوستان پر مسلمان صدیوں سے حکومت کر رہے تھے لیکن اب ان کی حیثیت صرف ایک مغلوب قوم کی رہ گئی تھی۔ پلاسی کی ہار اور ٹیپو سلطان کی موت نے مسلمانوں کو انگریزوں سے بہت زیادہ بددل کر دیا تھا۔ اس کے بعد رہی سہی کسر ۱۸۰۳ء میں دہلی پر لارڈ لیک (Lord Lake) کی فتح اور بادشاہ کا پنشن خوار بننے نے پوری کر دی جس سے مسلمان عوام اور خواص کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے مزید نفرت کے جذبات اُبھرے۔

پنشن خواری کے بعد شاہان مغلیہ سے انتہائی توہین آمیز برتاؤ کیا جانے لگا تاکہ عوام کے دلوں میں ان کی عزت کم ہو جائے۔ اس کی انتہا یہ ہوئی کہ ۱۸۴۷ء[۵] میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں اعلان کر دیا گیا کہ اب مغل خاندان کو قلعہ سے نکال دیا جائے گا اور شاہ کے لقب کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء[۶] میں ڈلہوزی کی آمد مسلمانوں کے لئے پریشانی کا باعث بنی۔

الغرض انگریزوں کا یہ طرزِ عمل قدرتی طور پر ہندوستان کے عام باشندوں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا۔ کیوں کہ اس گئی گذری حالت میں بھی ان کی نگاہوں میں شاہانِ مغلیہ کا احترام باقی تھا۔

۱۸۵۶ء میں ڈلہوزی نے حکومت کی باگ ڈور کے ننگ کے حوالے کی تو بغاوت کا آتش فشاں پھٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ آزادی کے حصول کے لئے جگہ جگہ کوششیں جاری تھیں کہ ۱۸۵۷ء کا سال شروع ہوا تو بغاوت کے آثار سامنے آئے جو دراصل آزادی کی جنگ تھی جس کی ابتدا فوج سے ہوئی۔ سرسید احمد خاں نے "اسباب بغاوت ہند" میں

---

۵ خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگ آزادی ۱۸۵۷، ص ۷۰ بحوالہ ڈاکٹر اقبال حسن خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے، ص ۴۴

۶ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، ص ۳۲۲ بحوالہ ڈاکٹر اقبال حسن خاں شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے، ص ۴۴

لکھا ہے:

"باغی کہتے تھے کہ اگر ہم یہ نہ کرتے تو کیا کرتے۔ ایک نہ ایک دن سرکار ہم کو تباہ کر دیتی" [۱]

اصلاً بغاوت اور انقلاب کی تیاری چل ہی رہی تھی کہ چربی آمیز کارتوس کی ایجاد ہوئی اور فوجیوں میں یہ بات پھیل گئی کہ اس میں خنزیر اور گائے کی چربی استعمال ہوتی ہے۔ لہٰذا ہندوستانی فوجیوں نے اس کارتوس کو استعمال کرنے سے منع کر دیا۔ انکار کرنے والوں کو انگریز افسروں نے سخت سزائیں دینی شروع کر دیں۔ اس نے فوجیوں کو اور بھی متنفر کر دیا اور بغاوت کی مقررہ تاریخ سے پہلے ہی بغاوت پھوٹ پڑی۔ سب سے پہلے آزادی کی جنگ میرٹھ میں شروع ہوئی اور جلد ہی یہ جنگ آزادی جنگل کی آگ کی طرح دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی جب میرٹھ کے سپاہیوں نے اپنے آپ کو دہلی آکر بہادر شاہ ظفر کے سامنے پیش کیا تو عوام اور جاگیرداروں کی حمایت ملی۔ حمایت حاصل ہوتے ہی یہ فوجی بغاوت عوامی جنگ کی شکل اختیار کر گئی نتیجتاً آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے نام پر اور ان کے جھنڈے کے نیچے ملک کے کونے کونے میں یہ جنگ شروع ہوئی اور ہندو، مسلمانوں نے مل کر ایک ہی بار اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کی ٹھان لی۔ سکھوں اور پارسیوں کے علاوہ ہر مذہب کے لوگوں نے دل کھول کر اس جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ تین ہفتہ میں سارا ملک اس کی لپیٹ میں آگیا۔

"ہندوستانی عوام و فوج نے بغاوت کے دوران انگریز حکام و افسران کو قتل کیا لیکن اس درندگی کا مظاہرہ نہیں کیا جو انگریزوں

---

[۱] سرسید احمد خاں، اسباب بغاوت ہند، ص ۵۵

[۲] کنہیالال، محاربہ عظیم، ص ۱۲۶ بحوالہ، ڈاکٹر اقبال حسن خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے، ص ۴۴

کی خصوصیت ہے۔ انگریز عورتوں اور بچوں پر عام طور سے ہاتھ نہیں اٹھایا گیا۔"[1]

لیکن انگریزوں کی سازش اور دورُخی پالیسیوں کی وجہ سے آزادی کی تحریک کو کامیابی حاصل نہیں ہوسکی، اور سخت مقابلے کے بعد بالآخر جنگ آزادی ناکام ہوئی۔ انقلاب کا جب یہ طوفان تھما تو انگریزوں نے اہل ملک سے خاص کر مسلمانوں سے آزادی کی جنگ کا انتقام لینا شروع کیا۔ انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا گیا اور ان کی بستیوں اور آبادیوں کو تباہ و برباد کیا گیا۔ کاشت کاروں پر لگان اور ٹیکس کی بھرمار کی گئی۔ اس طرح انگریز فوج جب دہلی میں داخل ہوئی تو اس کو تین دن تک دہلی لوٹنے کی عام اجازت دے دی گئی۔ لہٰذا فوجیوں نے انتہائی درندگی کا ثبوت دیا۔ شہزادے قتل کیے گئے، بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلا اور آخر رنگون میں نظر بند کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد پورے طور پر انگریز ہندوستان کے مالک بن گئے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کا خاتمہ اور ان کی تباہی و بربادی یوں بھی ایک عظیم حادثہ تھا۔ لیکن اس سے بھی بہت آگے بڑھ کر برطانوی حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کو نہ صرف سیاسی اور معاشرتی تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ یہ نیا اور بیرونی اقتدار عقیدہ و عمل، اصول و مبادی اخلاق و معاشرت کی بنیادوں کو منہدم کرنے والا اور ان کے ملبے پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنے والا تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ عیسائی مذہب کی تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت کے لئے جبراً کوششیں کی گئیں۔ جس کے باعث مسلمان انگریزوں سے اور بھی دل برداشتہ ہوئے اور اب عزت و آبرو اور جان کی حفاظت کے ساتھ عقائد کو درست رکھنے کا مسئلہ بھی مسلمانوں کے سامنے آیا اور اس کے نتیجے میں انگریزوں کے خلاف اٹھنے والی

---

[1] کنہیالال، محاربۂ عظیم، ص ۱۲۶ بحوالہ، ڈاکٹر اقبال حسن خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے، ص ۴۴

ہر تحریک کا ساتھ دل کھول کر دینا مسلمانوں نے اپنا فرض سمجھا۔ کیوں کہ انگریزوں نے جنگ آزادی کا اصل محرک مسلمانوں کو قرار دیا تھا اور دراصل بات بھی یہی تھی۔ لہٰذا انگریزوں نے مسلمانوں کی تمام ترقی کی راہیں مسدود کر دیں اور معمولی سی معمولی بات پر بھی مسلمانان ہند کو سخت سے سخت سزائیں دی جانے لگیں جن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک انگریز مصنف ہنری میڈ (Henry Mead) کہتا ہے:

"اس سرکشی کو موجودہ مرحلے میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا تھا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت کھل گئی کہ یہ اسلامی بغاوت تھی۔" [1]

مختصر یہ کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی قیمت مسلمانوں کو ادا کرنی پڑی اور جان و مال عزت و آبرو سب کچھ انگریزوں کی درندگی کی نذر ہو گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو معاشی طور پر کمزور کرنے کی تدبیریں شروع کر دی گئیں۔ گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا گیا کہ:—

"جو آسامیاں خالی ہوں ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کو نہ رکھا جائے مسلمان اگر اس کی قابلیت رکھتے بھی ہوں تو ان کو خاص سرکاری احکام کے ذریعہ ملازمت نہیں دی جائے۔" [2]

الغرض مسلمانوں کی ہر طرح سے ذلیل و خوار اور بے حیثیت بنانے کی ساری تدبیریں اختیار کی گئیں۔

بعض انگریز مورخین نے اپنی قوم کے ان مظالم اور انسانیت سوز طرز عمل کا خود بھی اعتراف کیا ہے جیسا کہ لارڈ الفنسٹن نے لارنس کو لکھا تھا:—

---

[1] ندوی، مولانا ابوالحسن علی، ہندوستانی مسلمان، ص ۱۴۵

[2] سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۱۵۹

"محاصرہ ختم ہونے کے بعد ہماری فوج نے جو ظلم کئے ہیں انھیں سن کر دل پھٹنے لگتا ہے دوست دشمن کی تمیز کئے بغیر سب سے یکساں بدلہ لیا گیا۔ لوٹ میں تو ہم نادر شاہ سے بھی بڑھ گئے تھے"[1]

ایک اور انگریز مورخ مسٹر لیکی نے لکھا ہے :

"اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے تو وہ ہندوستانیوں کی بغاوت ہے"[2]

بہر حال ان حالات میں مختلف تحریکیں حصول آزادی کے لئے وجود میں آنے لگیں اور انھوں نے اپنے اپنے طرز پر کام شروع کر دیا۔ ہندوستانی عوام کے بڑھتے ہوئے اس اضطراب کو دیکھ کر ملکہ وکٹوریہ تک کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ اہل ملک کو اطمینان دلائیں۔ چنانچہ زمینوں کے استحصال کا خاتمہ، ملازمتوں میں انصاف سزاؤں میں معافی وغیرہ امور کا اعلان ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے ہوا[3] ماضی کے تلخ تجربات نے گو ہندوستانی عوام کی نظروں میں انگریزوں کو بالکل بے اعتماد کر دیا تھا لیکن مذکورہ بالا اعلان میں ایسے عناصر موجود تھے جس سے کچھ اطمینان پیدا ہوا۔ البتہ یہ اطمینان زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوا۔

عوامی اضطراب بدستور باقی رہا جس کے نتیجے میں بالآخر انڈین نیشنل کانگریس کی تنظیم ایک منظم تحریک کی صورت میں سامنے آئی[4] اس کا پہلا اجتماع بمبئی میں ہوا۔

---

[1] منشی ذکاء اللہ، تاریخ ہند، ص ۶۴۹ بحوالہ، ڈاکٹر اقبال حسن خاں، شیخ الہند محمود حسن حیات اور علمی کارنامے، ص ۹۵

[2] ہیی، حکومت خود اختیاری، ص ۳۲ بحوالہ، ڈاکٹر اقبال حسن خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے، ص ۹۵

[3] مولانا حسین احمد مدنی، نقش حیات دوم، ص ۶۵ بحوالہ، ڈاکٹر اقبال حسن خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسن، حیات اور علمی کارنامے، ص ۹۶

[4] ڈاکٹر اقبال حسن خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ حیات اور علمی کارنامے، ص ۹۶

اس تنظیم کے ممبران بغیر کسی مذہبی تفریق کے بنائے گئے لہٰذا ایک بڑی تعداد میں مسلمان شریک ہوئے۔ ہندوستانی عوام کو کانگریس کے قیام پر تقویت حاصل ہوئی اب تمام مذہب و ملت کے لوگ مل کر ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کانگریس کے جھنڈے تلے کرنے لگے ———— اور یہ مقصد تھا برطانوی اقتدار سے آزادی!

لیکن انگریز اپنی دورُخی پالیسی کے تحت وقتاً فوقتاً لوگوں کو آپس میں ٹکراتے رہے۔

انیسویں صدی کا آخری دور انتہائی کشمکش کا دور تھا۔ نہ تو ہندوستانیوں کی حصول آزادی کی کوشش یکسر کامیاب ہو رہی تھی اور نہ ہی انگریزوں کو اطمینان نصیب تھا۔ آزادی کی تحریک کو ناکام بنانے کے لئے انگریزوں نے اپنی شاطرانہ چالوں کے ذریعے ہندوستانی عوام میں مذہبی اختلاف پیدا کر دیے تھے جس کے باعث تحریک آزادی کے علمبرداروں کو روز نت نئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

ایک طرف علما مسلمانوں کو سیاست سے جوڑنا چاہتے تھے دوسری طرف سر سید احمد خاں اور ان کے ہم عصر اس وقت سیاسی حالات سے زیادہ تعلیمی اور معاشی حالت کو سنبھالنے پر زور دے رہے تھے۔ جس کی وجہ سے سر سید احمد خاں پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔

بہر حال ان حالات میں کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کے تعاون کے باوجود اس کا دامن مسلمانوں کیلئے تنگ ہوتا گیا۔ ادھر مسلمانوں کو بھی یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ کانگریس مسلمانوں کو صرف انگریزوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتی ہے اس کو مسلم عوام کے جذبات اور احساسات کی پرواہ نہیں ہے لہٰذا اس بے اطمینانی نے مسلمانوں کے اندر "مسلم قومیت" کے احساس و شعور کو جنم دیا اور مسلمانوں کے اس قومی شعور کا مظہر بن کر "مسلم لیگ" وجود میں آئی۔

دوسری طرف ۱۹۰۰ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ ـــــ

"کانگریس لڑکھڑا کر گرنے والی ہے۔" [1]

وہ ہمیشہ کانگریس کو "گندی چیز" ہی کہا کرتا تھا اور مسلمانوں کو اس سے متنفر کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ حکومت کے اس طرز عمل نے اپنا برابر اثر دکھایا اب جہاں ان کی کوششوں سے چند لوگوں میں علیحدہ مسلم قومیت کا احساس وشعور پیدا ہوا وہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے مل جل کر ملک کو آزاد کرانے کی کوشش اور تیز کر دی۔ ان مجاہدین آزادی میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

حسرت موہانی نے کانگریس کے اکیسویں اجلاس کی کارروائی جنوری ۱۹۰۶ء کے رسالے "اردوئے معلیٰ" میں چھاپی [2] اور مسلمانوں کو اس میں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی بھرپور ترغیب دی ہے۔

پہلی جنگ عظیم

حصول آزادی کی ان کوششوں اور کشمکش کے دوران ۱۹۱۴ء میں جرمنی اور برطانیہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور جلد ہی یہ دو ممالک کی جنگ ایک عالمی جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ ہندوستانی لیڈروں نے اس خیال وارادہ سے اس جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دیا کہ بعد میں انگریز حکومت سے کچھ رعایتیں مل جائیں گی لیکن بہت سے لوگ اس کہاوت کے تحت کہ "دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے" انگریزوں کے

---

[1] غلام حیدر، آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی، ص ۱۶۳

[2] ایضاً، ص ۱۶۹

مقابلے میں جرمنی کی ہی فتح چاہی کچھ عرصہ بعد جب یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس جنگ کا مقصد صرف اتنا ہے کہ دوسرے چھوٹے چھوٹے ملک بھی برطانوی اقتدار کے زیر اثر آجائیں تاکہ وہاں بھی انگریز اپنی تجارت کو فروغ دے سکیں تب تمام ہندوستانیوں نے مدد کرنے سے انکار کر دیا اور انگریزوں سے نجات پانے کا ایک خفیہ منصوبہ بنایا مگر راز کھل جانے کی وجہ سے اس پر عمل نہیں ہو سکا چنانچہ ۱۹۱۷ء میں جنگ ختم ہونے کے بعد حصول آزادی کا منصوبہ بنانے کے جرم میں فوجیوں کو سخت سے سخت سزائیں دی گئیں۔ جنگ عظیم کے غیر معمولی اخراجات کے بوجھ کو ہندوستان کے عوام سے وصول کرنے کے لئے طرح طرح کے ٹیکس عائد کئے جس کے باعث مہنگائی میں اضافہ ہوا اور ہندوستان کے غریب عوام مزید مصائب میں مبتلا ہو گئے۔[1]

الغرض پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کی سیاست میں ایک نیا موڑ آیا، اور روس میں سوشلسٹ حکومت قائم ہو گئی جس کا اثر چھوٹے بڑے غلام ملکوں پر بہت گہرا پڑا۔ نتیجتاً ہندوستان کے نوجوانوں نے ایک بار پھر انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کی ٹھان لی اور مولانا محمد علی جوہر و مولانا شوکت علی کی قیادت میں تحریک خلافت قائم ہوئی۔ گاندھی جی نے بھی اس تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ سب نے مل کر ایک بار پھر ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور برطانوی حکومت کے خلاف مختلف انداز کے مظاہروں سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا جانے لگا۔

۱۳ اپریل کو اس جدوجہد کے دوران ایک ایسا الم ناک واقعہ پیش آیا۔ جسے جلیانوالا باغ کا قتل عام کہا جاتا ہے۔ بہر حال وقت کے ساتھ ساتھ کانگریس اب ایک طرح سے ایک ایسی سیاسی جماعت تھی جو جنگ آزادی کی راہ میں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور جس نے حکومت کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس طرح سے ۱۹۲۰ء میں ایک بار پھر فوجی تحریک میں

---

[1] غلام حیدر، آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی، ص ۱۸۷

اتحاد پیدا ہونے کے آثار نظر آنے لگے اب برطانیہ کی پارلیمنٹ نے ایک کمیشن ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا اس کمیشن کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ اس بات کا جائزہ لے کر ہندوستانی عوام کو برطانوی حکومت کی جانب سے اور کیا کیا آسانیاں فراہم کی جاسکتی ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں جب یہ کمیشن ہندوستان آیا تو اس وقت ڈاکٹر مختار احمد انصاری کانگریس کے صدر تھے۔ کانگریس کے اجلاس میں اس کمیشن سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا گیا چنانچہ کانگریس نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ غیر کانگریسی مسلمان قائدین نے بھی اس کمیشن کے بائیکاٹ میں کانگریس کا ساتھ دیا۔ ۳ر فروری ۱۹۲۸ء کو جب یہ کمیشن بمبئی میں داخل ہوا تو کالے جھنڈوں کے ساتھ اس کے خلاف زبردست مظاہرہ ہوا۔

اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں کانگریس کا تاریخی اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس اجلاس میں دو انتہائی اہم فیصلے کئے گئے اوّل یہ کہ کانگریس نے برطانوی حکومت کے تحت رہتے ہوئے خود مختار سرکار کی مانگ کے بجائے مکمل آزادی کی مانگ کی ــــــ دوم اب کانگریس کی صدارت نئی نسل کے ہاتھ میں آگئی' اور پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر منتخب ہوئے چنانچہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کی رات بارہ بجے جواہر لال نہرو نے راوی دریا کے کنارے قومی ترنگا جھنڈا لہرایا اور تقریر کی۔ اس درمیان برطانیہ میں انتخابات ہوئے اور لیبر پارٹی (Labour Party) کو کامیابی حاصل ہوئی۔ لیبر پارٹی ہندوستان کی آزادی کی اتنی سخت مخالف نہیں تھی جتنی کنزرویٹو پارٹی (Conservative Party) تھی۔

کانگریس نے مکمل آزادی کی تجویز اور اس کے لئے جدوجہد کو سول نافرمانی تحریک کا نام دیا۔ اور ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو لوگوں نے پورے ملک میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کردی۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد نے اس تحریک کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تحریک سول نافرمانی کے دوران گاندھی جی نے سب سے پہلے "نمک قانون" کو توڑنے کا اعلان کیا' اور یہ اعلان پورے ملک میں جنگل کی آگ

کی طرح پھیل گیا۔ اس وقت انگریز حکومت میں بھی کچھ کمزوری آچکی تھی لہٰذا کوشش کے باوجود ہندوستانیوں کو قانون توڑنے سے روک نہیں پائی ۔

۱۹۳۴ء میں حکومت برطانیہ نے مجبوراً انڈیا ایکٹ پاس کیا جس کے تحت قانون ساز صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب کرانے اور اس میں مخصوص لوگوں کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا۔ اس ایکٹ کا مقصد ہندوستانی عوام کے اختیارات میں کچھ اضافہ کرنا تھا لیکن صوبوں میں گورنروں کے تقرر کا حق صرف برطانوی حکومت کو تھا۔ اسمبلیوں کو اس سلسلے میں کوئی اختیار حاصل نہ تھا بلکہ گورنروں کو اسمبلیوں کے معاملات میں مداخلت کے مکمل اختیارات حاصل تھے۔ ابتدا میں کانگریس نے حکومت کے اس ڈھانچے کی مخالفت کی مگر بعد میں برطانوی حکومت پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ ملکی عوام پر اس کا کتنا اثر ہے، حصہ لیا اور جولائی ۱۹۳۷ء میں گیارہ میں سے سات صوبوں میں اپنی حکومت بنائی۔ بعد میں دو اور صوبوں میں دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر حکومت بنائی۔ حالانکہ ان وزارتوں کے ہاتھ انگریزوں کی مرکزی حکومت سے بندھے ہوئے تھے پھر بھی وزراء نے جواہرلال نہرو کے ذریعہ دلائے گئے حلف کے مطابق اپنے عہدے سنبھال کر اس عہد کو نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی جس کی وجہ سے آنے والے دنوں میں پوری آزادی کی امید نظر آنے لگی ۔

۱۹۳۹ء میں ہٹلر کی فوجوں نے پولینڈ پر حملہ کر دیا تو مجبوراً انگلستان کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑا اور ایک بار پھر ہندوستانیوں کی رائے لئے بغیر ہندوستان کو انگریزی حکومت کے ایک حصہ کی حیثیت سے عالمی جنگ میں ملوث کر دیا گیا لیکن اس بار ہندوستانی لوگ اس بات کے لئے تیار نہیں تھے کہ ان کی رضامندی کے بغیر برطانوی حکومت اس دوسری عالم گیر جنگ میں انھیں ملوث کرے۔ چنانچہ ۱۴ ستمبر کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اعلان کیا ــــــ

؎ غلام حیدر، آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی، ص ۲۰۹

"اس ملک کے لئے جنگ اور امن کا مسئلہ خود ہندوستانیوں کو طے کرنا چاہیئے۔ باہر کی کوئی طاقت اس پر اپنا فیصلہ نہیں تھوپ سکتی"[1]

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان انگلستان کے ساتھ اس جنگ میں البتہ تعاون کر سکتا ہے لیکن صرف برابر کے حصّہ دار کی حیثیت سے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ دہلی میں فوراً قومی سرکار بنائی جائے تاکہ جنگ میں لوگوں کی مدد حاصل ہو سکے اور ہندوستان کو جنگ کے بعد آزادی مل سکے۔ اس کے جواب میں لارڈ لنلتھگو نے کہا ــــــ

"جنگ کے بعد ۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر نظرِ ثانی کر کے سدھار کیا جائے گا اور مناسب وقت آنے پر انگلستان ہندوستان کو انگریزی حکومت کے تحت ایک خود مختار ریاست کی حیثیت دے دے گا۔"[2]

اس جواب سے کانگریس کی تسلی نہیں ہوئی اس لئے اکتوبر و نومبر ۱۹۳۹ء کے دوران کانگریسی وزرا صوبوں میں وزارتوں سے مستعفی ہو گئے اور جنگ میں انگریز حکومت کے تعاون سے انکار کر دیا لیکن پھر بھی ملک کو اس کی مرضی کے خلاف جنگ میں گھسیٹ لیا گیا۔

دوسری جانب صدر مسلم لیگ مسٹر محمد علی جناح نے مسلمانوں کے سلسلے میں کانگریسی قائدین کے قول و عمل میں تضاد کو پوری طرح محسوس کر لیا تو ۱۹۴۰ء[3] میں لاہور کے سیشن میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ریاست یعنی پاکستان کے قیام کی مانگ کا اعلان کیا۔

۸ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی کے اجلاس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے

---

[1] نین تارا سہگل، مترجم ظہور محمد خاں، ہندوستان کی تحریک آزادی، ص ۱۰۰

[2] " " " " " " " ص ۱۰۱

[3] ایضاً ص ۱۰۹

بھارت چھوڑو تحریک چلانے کا فیصلہ کیا تاکہ فوری طور پر ہندوستان پر انگریزی اقتدار ختم ہو۔ لہذا گاندھی جی کی قیادت میں اس تحریک نے عدم تشدد کے اصول کو اپناتے ہوئے بڑے پیمانے پر جدوجہد شروع کرنے کا اعلان کیا تاکہ جلد از جلد ملک کو برطانوی حکومت کے تسلط سے آزاد کرایا جا سکے لیکن اس اجلاس کے ختم ہونے کے بعد ہی انگریز سرکار نے گاندھی جی، جواہرلال نہرو، آصف علی مولانا ابوالکلام آزاد، سید محمود، نریندر دیو اور دوسرے لیڈران کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ ان لیڈروں کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی سارے ملک میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ لوگوں نے غصہ میں آکر انگریزی سرکار کے تھانوں، ریلوے اسٹیشنوں اور ڈاک خانوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ ٹیلی فون کے تار کاٹ دئے گئے بہت سی ریلوے لائن اکھاڑ دی گئیں۔

ان ہنگاموں کو دبانے کے لئے نہتے لوگوں پر ہوائی جہازوں سے گولیاں برسائی گئیں، آنسو گیس کے گولے پھینکے گئے اور کروڑوں ہندوستانیوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ الغرض برطانوی وزیر اعظم چرچل کے مطابق ـــــ

"ہندوستان میں بڑی تعداد میں فوجی طاقت بھیج کر سرکار نے اپنی پوری طاقت سے ہنگاموں کو دبایا۔"

گاندھی جی نے ۵ مئی ۱۹۴۴ء کو جیل سے اپنی رہائی کے بعد سب سے پہلے محمد علی جناح سے ملاقات کر کے اس بات کی کوشش کی کہ مسلم لیگ اور کانگریس متحد ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کریں۔ مگر کوئی معاہدہ نہیں ہو سکا کیونکہ جناح صاحب نے زور دیا کہ انگریزوں کے جانے سے پہلے مسلمانوں کے مستقبل کے سلسلے میں کوئی قابل اطمینان فیصلہ ہونا چاہیئے۔ گاندھی جی اس بات پر تو راضی ہو گئے کہ ہندوستان کے اندر جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ ان جگہوں پر اپنی سرکار بنالیں مگر وہ اس پر تیار نہیں ہوئے کہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ ملک پاکستان قائم کیا جائے چنانچہ ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہونے کے بعد تمام کانگریسی لیڈر رہا کر دئے

گئے اور ہندوستان کی حکومت کے ڈھانچے میں چند تبدیلیوں کے اعلان کے ساتھ وزیر اعظم اٹیلی کے حکم کے مطابق وائسرائے نے ۱۴ ممبران کی عبوری مرکزی حکومت بنانے کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر محمد علی جناح کو اپنے اپنے ممبران کی فہرست کے ساتھ شامل ہونے کے لئے دعوت دی۔ نہرو جی نے چھ ممبروں پر مشتمل اپنی فہرست پیش کی لیکن جناح صاحب نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا۔ بہر حال جن نمائندگان پر مشتمل عبوری سرکار بنائی گئی ان کے نام اس طرح ہیں :۔۔۔

"پنڈت نہرو (نائب صدر) سردار پٹیل، راجندر پرشاد، راج گوپال اچاریہ، آصف علی، ڈاکٹر جان میتھائی، جگ جیون رام اور دو غیر مسلم لیگی مسلمان علی ظہیر اور سر شفاعت خاں، سکھوں کے نمائندے بلدیو سنگھ اور پارسیوں کے نمائندے سی۔ جی۔ بھابا بنے۔ بعد میں شرت چندر بوس بھی شامل کر لئے گئے تھے۔"[۱]

کچھ عرصہ بعد مسلم لیگ نے عبوری سرکار میں شرکت کر لی لیکن پھر بھی مسلم لیگ اور کانگریس کا اختلاف کم نہیں ہوا تنازعہ بڑھتا ہی رہا۔ آخر کار انگریز حکومت نے مارچ ۱۹۴۷ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا آخری وائسرائے بنا کر دہلی بھیجا اور ساتھ ہی ۱۹۴۸ء میں ہندوستانیوں کو اقتدار سونپنے کی تاکید کی لیکن بعض سفارشات کی بنا پر ملک کو تقسیم کر کے اگست ۱۹۴۷ء میں ہی ہندوستان کو آزاد کر دیا گیا۔

انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی و معاشرتی زندگی

ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام کے ابتدائی دور میں مسلمان معاشرت کا اعلیٰ

---

[۱] نین تارا سہگل (مترجم، ظہور محمد خاں) ہندوستان کی تحریک آزادی، ص ۱۲۰

طبقہ ایرانیوں، افغانیوں، ترکوں اور تھوڑے بہت عربوں پر مشتمل تھا۔ بعدازاں ہندوستان کے قدیم باشندوں نے بڑی تعداد میں مذہب اسلام قبول کر کے ہندوستان میں مسلم عوام کے معاشرے کو جنم دیا۔ یہ معاشرہ مقامی تہذیب کے بہت سے اجزاء کے امتزاج سے ترتیب پایا تھا اور اس نئے مسلم معاشرہ پر غیر اسلامی تہذیب کے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے اس لئے آہستہ آہستہ مسلم معاشرے کے اندر طرح طرح کے بگاڑ آنا شروع ہوئے جن کے سدباب کے لئے نہ صرف مختلف اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں بلکہ بہت سے مصلحین بھی پیدا ہوئے۔

انیسویں (۱۹) صدی میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں ایک وجہ ان کے معاشرے کا بگاڑ بھی ہے۔ مغل بادشاہوں نے اپنے دورِ حکومت میں یہاں جس طرح کا معاشرہ قائم کیا وہ نہ تو ہندوستانی تھا اور نہ ہی خالصتاً اسلامی معاشرہ تھا بلکہ یہ ایک الگ ہندوستانی مسلم معاشرہ تیار ہوا تھا۔ اورنگ زیبؒ کے انتقال کے بعد جہاں مسلم حکومت زوال پذیر ہوئی اس سے کہیں زیادہ معاشرہ زوال کی طرف بڑھنے لگا اور بہت سی معاشرتی برائیاں، غلط رسم و رواج مسلمانوں میں پیدا ہونے لگے۔ عوام کے ساتھ ساتھ امراء اور بادشاہ بھی اس بگاڑ میں برابر کے شریک تھے۔

اخلاقی ابتری :۔

عالمگیر اورنگ زیبؒ کے بعد اخلاقی برائیاں برابر بڑھتی رہیں اور یہ برائیاں محمد شاہ کے زمانے میں اپنے عروج پر تھیں۔ سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں :

> "عیاشی کے پیش نظر بہت سی ادویہ اور منشیات امیروں کی خوراک کا حصہ بن گئی تھیں۔"[1]

عالمگیر اورنگ زیبؒ کے بعد شراب کا عام رواج ہو گیا تھا۔ دل بہلانے کے

---

[1] ابو سلیمان شاہجہان پوری، شاہ ولی اللہؒ کے عہد کے اخلاقی و مذہبی حالات، رسالہ الرحیم نومبر ۱۹۶۶ء ص ۴۴، بحوالہ اقبال حسن خان، شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے ، ص ۴۰

لئے جوان عورتوں کا رقص امیروں کی شان سمجھا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے طوائفوں کی ایک پوری قوم وجود میں آگئی تھی۔ شہروں کے علاوہ قصبات تک میں ان کے اڈے قائم ہو چکے تھے۔

فسق و معصیت لازمہ حیات بن چکے تھے۔ بازاری عورتیں مجالس کی زینت بن چکی تھیں حد یہ کہ بعض شرفا اپنے لڑکوں کو زبان و اداب مجلس سکھانے کے لئے ان کے پاس بھیج دیتے تھے[۱]

ایک امریکی مصنف ڈاکٹر لوتھراپ اسٹارڈو نے اس عام اخلاقی و دینی ابتری کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

"اٹھارویں صدی کے آخر تک اسلامی دنیا اپنے ضعف کے انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ صحیح قوت کے آثار کسی جگہ پائے نہیں جاتے تھے ہر جگہ جمود تنزل نمایاں تھا۔ آداب، اخلاق قابل نفرت تھے۔ فی الجملہ اہل اسلام کی جان نکل چکی تھی اور محض بے روح رسمیات اور متبدل توہمات کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ اگر محمدؐ پھر دنیا میں آتے تو وہ اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے"[۲]

مذہبی حالت :۔

مذہبی اعتبار سے معاشرہ جس زوال کو پہنچ چکا تھا اس کا اندازہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"شرک اور بت پرستی مختلف ناموں سے مسلمانوں میں گھر کر چکی

---

[۱] ندوی، سید ابو الحسن علی، سر سید احمد شہید، ص ۲۹، ۳۰

[۲] ڈاکٹر لوتھراپ اسٹارڈو، ترجمہ: محمد جمیل الدین، جدید دنیائے اسلام، ص ۴۲، ۴۱
بحوالہ، اقبال حسن خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے، ص ۴۸

تھی۔ قبروں اور مردوں کا ایک مستقل جہاں شریعت تھا۔ ان پر سجدہ کرنا، نذریں ماننا اور چادریں چڑھانا، عورتوں کا وہاں جمع ہونا وغیرہ اس شریعت کے خاص اجزا ہیں۔ غرض یہ کہ مذہب کے نام پر وہ ساری چیزیں مسلمانوں میں پیدا ہو چکی تھیں جو یہودی اور نصرانیوں کے یہاں پائی جاتی تھیں۔ ہندو مذہب کے رسم و رواج مسلم ثقافت کے دامن میں جگہ پا چکے تھے۔" [1]

انیسویں صدی میں مسلمانوں کی حالت اس قدر ابتر ہوگئی کہ شعائرِ اسلام میں سلام کی جگہ آداب اور تسلیمات نے لے لی تھی اور امرار کے یہاں اگر کوئی سلام علیک کہہ دیا کرتا تو ناراض ہو جاتے۔ مزید مذہبی اور اخلاقی گراوٹ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض نام نہاد صوفیار جن کے دَر سے ناواقف خلقِ خدا فیضیاب ہونے کا دعویٰ کرتی تھی اب ان کا دَر شر و فساد کا منبع بن گیا انھیں خلقِ خدا کی فکر نہیں تھی بلکہ اپنے حال میں مست تھے۔

الغرض صوفیار کا وہ طبقہ جس کی نگاہ فیض سے زندگیاں بنتی تھیں اب اس حلقہ میں ایسے نام نہاد صوفیار بھی پیدا ہو چکے تھے جن کے سائے سے زندگیاں بگڑ رہی تھیں۔

مولانا گیلانی تحریر فرماتے ہیں :-

"غلط تصوف اور جھوٹے تمشیخ کی راہوں سے اقتصادی اور علمی تباہیوں کا سیلاب مختلف شکلوں میں ملک کے مختلف گوشوں میں مسلمانوں کی خالص اسلامی و دینی زندگی کو دھمکیاں دے رہا تھا۔" [2]

---

[1] ندوی، سید ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہیدؒ ص ۲۸

[2] مولانا مناظر احسن گیلانی، تذکرہ شاہ ولی اللہ، ص ۱۴۶

دوسری طرف انگریز قوم کے اقتدار میں آنے کے باعث مسلمانوں میں احساس کمتری اور پست حوصلگی جیسی بدترین برائیاں پیدا ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ انگریز حکومت کے ذریعہ رائج قوانین سے مسلمانوں کے عقائد وافکار پر بھی ضرب لگنے لگی۔ عیسائی پادریوں نے زبردستی مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش شروع کردی۔ انگریزی نظام تعلیم کے زیر اثر یورپ کے الحادی فلسفہ کو ایک ترقی پذیر قوم کے علم وفلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا جس کے نتیجے میں اسلامی تعلیمات کے سلسلے میں مسلمانوں کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

ان اثرات کے تحت مسلم سماج میں چار نظریات[1] کے لوگ سامنے آئے۔ پہلا طبقہ جو محدود تھا یہ بنیادی عقائد توحید، رسالت، وحی، آخرت، جزا و سزا کے بارے میں شک وشبہ کا شکار ہوگیا اور اسلامی عبادات کی اہمیت کو ختم کر کے اسلامی طرز معاشرت کی طرف سے احساس کمتری میں مبتلا ہوگیا۔ اسلام سے کنارہ کشی اختیار کرکے مغرب کے مفکرین اور رہنماؤں کی تقلید کرنے لگا۔

دوسرے طبقہ نے یقیناً اپنے عقائد کو محفوظ رکھا لیکن سیاسی، معاشی اور تمدنی زندگی میں جدید مادی علوم سے رہنمائی حاصل کرنے لگا۔ گویا انھوں نے مذہبی دائرے کو ذاتی زندگی تک محدود کرلیا۔ مگر تیسرے طبقہ نے مغربی تعلیمات کی مخالفت کو اپنا مقصد بنالیا۔ ان لوگوں نے اپنے ایمان وعقائد کو تو محفوظ کرلیا مگر سماجی زندگی سے اپنے کو بالکل کاٹ لیا۔ ان کی ساری سرگرمیاں ان کی زندگی کے نجی دائرے تک محدود ہوگئیں۔ علمی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی امور سے اپنے کو دور رکھ کر تصوف کی جانب توجہ دیتے۔ ان کے خیال میں اخلاقی حالت کو سنبھالنے کے لئے تصوف سے بہتر کوئی راستہ نہیں تھا۔ لہذا انھوں نے سیاست اور تمدن کا میدان دوسرے طبقات کے لئے چھوڑ دیا۔

---

[1] شعبہ نشر واشاعت، جماعت اسلامی ہند ایک تعارف، ص ۱۰، ۱۱

آخر میں سب سے بڑا طبقہ غیر تعلیمی یافتہ مسلمانوں کا تھا جنھوں نے دین کے معاملے میں تیسرے طبقے سے تعلق رکھا اور دیگر دنیاوی معاملات میں پہلے و دوسرے طبقات سے تعلقات پیدا کیے۔

لہذا انھوں نے بھی دین کو اپنی ذات تک محدود کر لیا۔

اسلامی معاشرتی زندگی کا مطالبہ

اگرچہ انسان اپنے معاشرہ کا ایک مکمل جز ہے پھر بھی اپنی فطرت کے اعتبار سے اجتماعی زندگی کا محتاج ہے وہ دنیا میں آتے ہی اپنے خاندان (ماں، باپ بہن، بھائی) کا محتاج ہوتا ہے اور جیسے جیسے پروان چڑھتا جاتا ہے اس کی احتیاج کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اپنی بہت سی ضروریات لباس، خوراک، مکان وغیرہ کے حصول کے لئے وہ سماج کے بہت سے افراد پر منحصر رہتا ہے اور معاشرے کے تعاون کے بغیر وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں ناکام رہتا ہے۔ چنانچہ انسان ہر طرح سے معاشرے کا محتاج ہے اور سماجی زندگی کے بغیر اس کی کوئی حیثیت نہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنے وجود کی برقراری کے لئے معاشرے پر انحصار کے باوجود ایک انسان کا نفع و نقصان عمل اور ردعمل پورے سماج پر اثر انداز ہوتا ہے اس لئے ایک فرد کا کوئی اچھا کام ساری جماعت کی قدر و قیمت بڑھا دیتا ہے اور ایک ہی شخص کے کسی غلط عمل سے پوری جماعت کی ذلت و رسوائی ہوتی ہے۔

طلبا، مدرسین، تاجر، کاشت کار، مزدور، صنعت کار وغیرہ سب قوم کے اجزا ہیں جو اس کا جسم سنوارتے اور بناتے ہیں اس کے نفع و نقصان پر اثر انداز

ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے ایک الگ اور مکمل معاشرتی نظام کا خاکہ پیش کیا ہے۔

اسلام کا نظام معاشرت :-

اسلام نے اپنا ایک مضبوط اور پائیدار نظام معاشرت پیش کیا جس کے اصول و ضوابط مستقل اور محکم ہیں اور اس کا پورا نظام عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ اسلام نے یہ ایک ایسا نظام پیش کیا ہے کہ زندگی کی تمام سرگرمیاں اس کے دائرے میں آجاتی ہیں۔
جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ معاشرہ انسانوں کے مجموعہ کا نام ہے اس لئے اسلام نے معاشرتی یا جماعتی نظام پیش کرنے کے ساتھ ساتھ فرد کی اصلاح کو نقطہ آغاز قرار دیا ہے کیونکہ فرد معاشرے کا ایک جز ہے اور اس کی اصلاح معاشرے کی اصلاح ہے۔
اسلام ہر شخص کی انفرادی حیثیت کا قائل ہے وہ انسانوں کو صرف معاشرے کا ایک بے جان اور معطل پرزہ نہ سمجھ کر معاشرے کا ایک اہم جزء قرار دیتا ہے۔ وہ انسانوں میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ انسان اپنے اعمال اور اپنی پوری زندگی کا خدا کے سامنے خود جواب دہ ہے چنانچہ اس اہم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے اسلامی معاشرہ فرد کی شخصیت کے تحفظ اور نشو و نما کا پورا پورا موقع فراہم کرتا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اللہ، اس کے رسولؐ اور آخرت پر انسان کا ایمان مضبوط و مستحکم ہو۔ لہذا علم دینی سے واقفیت سب سے اہم ہے اس لئے اسلام دین کا علم حاصل کرنے کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔
اسلام نے انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کے لئے بھی واضح ہدایات پیش کی ہیں۔ اس کے نزدیک معاشرے کی اصلاح بھی اتنی ضروری ہے جتنی کہ خود فرد کی ہے اس کے برخلاف جدید مغربی تحریکات کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے فرد کو نظر انداز کر کے صرف اجتماعی زندگی کی درستگی کے لئے پروگرام بنائے جس کی بنا پر کامیاب نہیں ہوئے۔ دوسری طرف مشرقی

مذاہب کے نظاموں نے صرف فرد کی اصلاح کی لیکن اجتماعی زندگی سے صرف نظر کیا اور نتیجتاً یہ نظام بھی ناکام رہا لیکن اسلام دونوں کو برابر کی اہمیت دیتا ہے اور دونوں کی اصلاح کے لئے الگ الگ طریقے پیش کرتا ہے۔

"مجموعی طور پر اسلام ایک ایسے معاشرے کا طالب ہے جو ہمہ گیر، مصنوعی اختلافات سے پاک، تعصبات و مکروہات سے منزہ، نسل و رنگ، وطن اور زبان کی حد بندیوں اور جغرافیائی سرحدوں سے پرے، مساوات، اجتماعی عدل و انصاف اور ایک عالم گیر برادری کی بنیادوں پر قائم ہو اور ایک فکری اخلاقی نیز اصولی معاشرہ ہو جس کے افراد میں باہم ہمدردی، انسانیت اور مواساۃ کا رشتہ ہو۔" لہٰذا اس اہم مقصد کے حصول کے لئے اسلام حسب ذیل بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

۱۔ مساوات :

اسلامی معاشرے کی سب سے پہلی اور اہم بنیاد یہ ہے کہ تمام انسان ایک ماں باپ (آدمؑ و حواؑ) کی اولاد ہیں اس لئے رنگ و زبان، نسل و قبیلہ، برادری وطن وغیرہ باہمی تعارف کے لئے ہے لیکن ان اختلافات کی وجہ سے امتیاز، تعصب یا تفریق کرنا غلط ہے ہاں اس وجہ سے ضرور امتیاز کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہوں اور وہ خدا ترسی میں دوسروں سے زیادہ بڑھا ہوا ہو۔

۲۔ اخوت :۔

اسلام کا کہنا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" اس لئے اللہ پر ایمان رکھنے والے ایک دوسرے سے رحم اور محبت کا برتاؤ کریں گے اگر معاشرے کے ایک فرد کو تکلیف ہو تو سارے لوگ اس کو محسوس کریں گے جس طرح جسم کے کسی حصہ میں چوٹ لگے تو سارا جسم اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس طرح ایک عقیدے کو اور ایک نظام حیات کو تسلیم کرنے والا

خواہ کسی نسل کا ہو کسی ملک و رنگ کا ہو اس معاشرے میں شامل ہوگا اور اس کو معاشرے کے تمام ارکان کے برابر حقوق حاصل ہوں گے کسی طرح کا کوئی فرق نہیں کیا جائے گا اور اس طرح ایک عالم گیر برادری وجود میں آئے گی۔

۳۔ رشتۂ نکاح :۔

عورت اور مرد معاشرے کے دو ستون ہیں دونوں کی اپنی اپنی الگ حیثیت ہے لہٰذا دونوں میں قانونی مساوات ہے دونوں کے ایک دوسرے پر کچھ حقوق و ذمہ داریاں ہیں عورت اور مرد کا نوعی رشتہ بہن بھائی کا ہے لیکن نکاح کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے جائز ہیں اور اس جائز رشتہ سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔

۴۔ خیر خواہانہ ماحول :

اسلامی معاشرے کی عام فضا خیر خواہی، تعاون اور ایثار کی ہونی چاہیئے صاحب ایمان لوگ جب آپس میں ملیں تو ایک دوسرے پر سلامتی بھیجیں۔ ظلم و غیبت چغل خوری، کینہ پروری، دھوکہ دہی، حسد، بغض، الزام تراشی اور آپس میں ایک دوسرے کو بے عزت کرنے سے پرہیز کریں۔ نیکیوں میں ایک دوسرے کی مدد کریں بلکہ آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور برائیوں سے ایک دوسرے کو روکیں۔

۵۔ ذمہ داری کا تصوّر :۔

اسلام ایک طرف فرد کے تمام حقوق کی مکمل حفاظت اور نگہداشت کرتا ہے تو دوسری طرف فرد میں اجتماعی ذمہ داریوں کا شعور بھی پیدا کرتا ہے کہ فرد کو اپنے معاشرے میں برائیوں کو روکنے اور نیکیوں کو پھیلانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اور اس کام کے لئے ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کرنا چاہیئے۔

انیسویں [۱۹] صدی عیسوی و بیسویں [۲۰] صدی کی ابتدا میں دینی تحریکیں

۱۔ تحریک سید احمد شہیدؒ :-

۱۹ ویں صدی کا زمانہ مسلمانوں کے لئے ایک زبردست کش مکش کا دور تھا۔ ایک طرف ان کے سیاسی تنزّل کی تکمیل اس دور میں ہوئی تو دوسری طرف یہی دوران کے مذہب کے احیاء کے آغاز کا زمانہ بھی تھا۔ معاشرہ و مذہب کی وہ تمام خامیاں اور کمزوریاں جن پر مسلم حکومت کے زمانے میں پردا پڑا ہوا تھا اب بے نقاب ہوگئی تھیں مسلم عوام کی مذہبی حالت نہایت خراب تھی انھوں نے ہندو مذہب کو چھوڑ کر اسلام ضرور قبول کرلیا تھا مگر ان کی طرز حیات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی وہ پہلے مندروں میں مورتیوں کے سامنے سر جھکاتے اور پجاریوں و برہمنوں کو اپنا رہنما تسلیم کرتے تھے اب قبروں اور مزاروں کے آگے سر خم کرتے اور مسلمان پیروں فقیروں سے عقیدت رکھتے۔ تعویذ گنڈوں کا عام رواج ہو چلا تھا۔ شادی بیاہ میں عام طور پر غیر اسلامی طریقے اختیار کئے جاتے۔ توہم پرستی اور بدعت کا بول بالا تھا۔ ایک خدا کے ماننے والے بہت سے جھوٹے خداؤں کے پرستار بن گئے تھے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء[۱] کو رائے بریلی

---

[۱] شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ص ۱۵

میں مولانا سید احمد بریلوی پیدا ہوئے اور ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد والیٔ ٹونک نواب امیر خاں کے یہاں سواروں میں بھرتی ہو گئے[۱]۔ اس کے بعد آپ دہلی تشریف لائے اور یہاں ہدایت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا لوگوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور پھر آپ اپنے وطن لوٹے اور کچھ مدت کے بعد وعظ نصیحت کے لئے رام پور گئے وہاں[۲] ولایتی افغانیوں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ لاہور کے سکھ حکمراں نے وہاں آس پاس کے مسلمانوں پر جینا حرام کر رکھا ہے لہٰذا آپ نے سکھوں سے جہاد کی نیت کی اور مسلمانوں کو عام جہاد کی دعوت دے کر سات ہزار مسلمانوں کے ساتھ ۱۸۲۶ء کو جہاد کے ارادے سے نوشہرہ تشریف لے گئے[۳]۔ یہاں سے آٹھ میل کے فاصلے پر اکوڑہ نام کی جگہ پر بدھ سنگھ کی فوج سے مقابلہ کیا جس میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی[۴]۔ اس کے بعد ۱۸۳۰ء میں پشاور کو فتح کیا لیکن جلد ہی افغانی مسلمان سکھوں کی چالاکی کی وجہ سے سید احمد بریلوی کے مخالف ہو گئے اور غداری پر اتر آئے۔ بالآخر سید احمد بریلویؒ ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے معرکہ میں شہید ہو گئے[۵] اور اس طرح اس خالص دینی و اصلاحی تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔ اس تحریک سے بعد کی ابھرنے والی بہت سی دوسری تحریکیں بھی متاثر ہوئیں۔

۲۔ دارالعلوم دیوبند:

انگریزوں نے چونکہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہندوستان کی حکومت چھینی

---

[۱] [۲] شیخ محمد اکرام موج کوثر ص ۱۵ ص ۲۱

[۳] ایضاً ص ۲۵

[۴] ایضاً ص ۲۵

[۵] ایضاً ص ۳۳

تھی لہٰذا وہ اپنا اصل حریف مسلمانوں کو ہی سمجھتے تھے اور اس وجہ سے ہر اس پالیسی کو اپناتے تھے جس سے مسلمانوں کی ذلت و خواری میں اضافہ ہو اور جب ۱۸۵۷ء کا خونی واقعہ ہوا تو انگریزوں نے پوری طرح سے اس کا محرک مسلمانوں کو ٹھہرایا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ لہٰذا ہر طرح سے مسلمانوں کو برباد کرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ مذہبی معاملات میں بھی مداخلت پیدا کرنی شروع کی اور نیا مغربی تعلیمی نظام قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی جس میں مسلمانوں کے دینی علوم کو کہیں جگہ نہیں دی گئی۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتے ہیں :۔

"ہمارے طریق تعلیم میں مسلمان نوجوانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے بلکہ وہ قطعی طور پر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے۔" [1]

اس کے علاوہ اوقاف ضبط کر لئے گئے جن کی وجہ سے مدارس جو برسوں سے اسلامی علوم و فنون کی ترقی کے لئے کام کر رہے تھے اور مسلمانوں کو دینی علوم سے سیراب کر رہے تھے۔ تقریب قریب ختم ہو گئے اور دہلی جیسا علم کا بڑا مرکز اب تباہ ہو چکا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر برک نے اپنی اس یادداشت میں جو پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تھی لکھا ہے کہ ـــــ

"ان مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا اور جہاں دور دور سے طالب علم پڑھنے کے لئے آتے تھے آج وہاں علم کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔" [2]

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۲۵۲

بحوالہ، سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص ۱۳۹

[2] مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، جلد اول ص ۳۹۲

بحوالہ، سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص ۱۳۸

الغرض برطانوی حکومت کا مقصد تھا کہ عوام کو زیادہ سے زیادہ نصرانیت کی طرف لایا جائے تاکہ مذہبی سطح پر برطانوی حکومت کی مخالفت کم ہو جائے۔ اس لئے انھوں نے اپنا جو جدید نظام تعلیم جاری کیا اس نے مسلمانوں کا اپنا علمی اور عملی شیرازہ منتشر و پراگندہ کر دیا۔ عقائد و فکر سے لے کر عمل و کردار تک متاثر ہو گیا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے ضرورت تھی کہ بڑے پیمانے پر کوئی تحریک چلائی جائے تاکہ مسلمانوں کو اس تباہ کن صورت حال سے بچایا جا سکے۔

"چنانچہ اس وقت بنیادی طور پر اس نقطہ نظر کو اپنایا گیا کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کی ملی شیرازہ بندی کے لیے ایک دینی و علمی درس گاہ کا قیام ضروری ہے۔ اس مرکزی فکر کی روشنی میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقار خاص مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ طے کیا کہ اب دہلی کے بجائے دیوبند میں یہ دینی درس گاہ قائم ہونی چاہیئے۔"[1]

بہر حال ان ہمدردان ملت کی مسلسل جد وجہد کے نتیجے میں ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء بروز پنجشنبہ[2] چھتے کی پرانی مسجد کے کھلے ہوئے صحن میں انار کے درخت کے سائے میں بغیر کسی رسمی تقریب کے اس دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا اور بے پناہ خدمات اور کوششوں کے ذریعہ ادارہ مسلسل ترقی کی منازل طے کرتا گیا اور اب از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کے نام سے پوری دنیا میں مشہور و معروف ہے اور علوم دینیہ کی دفاع میں حصار کی حیثیت سے اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

تحریک دیوبند کا سرسید احمد خاں پر اثر:

دارالعلوم دیوبند کے قیام سے مسلمانوں کے علوم دینیہ اور عقائد کی تو حفاظت

---

[1] [2] محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، اول، ص ۱۴۹، ص ۱۵۵

ہوگئی کیونکہ اس مدرسہ کی بنیاد محض علوم دین کے احیار کے لئے رکھی گئی تھی لیکن جدید علوم سے عدم واقفیت اور انگریزی زبان سے یکسر بے تعلق ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دئے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی تھی چنانچہ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی اس معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لئے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ دے کر جدید تعلیم کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا۔ سرسید احمد خاں نے ۱۷ر اکتوبر ۱۸۵۹ء کو مراد آباد میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ پھر ۱۸۶۳ء کو غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کا مقصد مغربی علوم کو ہندوستان میں رائج کرنا تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب سرسید احمد خاں علی گڑھ منتقل ہوگئے تو سائنٹفک سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں انگلستان کے سفر سے واپس پر انھوں نے ایک کمیٹی "خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی[۱] اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج کھولا جائے گا بالآخر فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے مجوزہ کالج کے متعلق مکمل اسکیم پیش کی جس میں طے پایا کہ کالج سے پہلے ایم۔ اے۔ او ہائی اسکول قائم کیا جائے۔ چنانچہ سر ولیم میور نے ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء کو اسکول کا افتتاح کیا۔ سرسید احمد خاں ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوگئے۔ اپنی ملازمت ختم کرنے کے بعد انھوں نے علی گڑھ میں ہی سکونت اختیار کرلی اس دوران انھوں نے ایم۔ اے۔ او ہائی اسکول کو ترقی دے کر ایم۔ اے۔ او کالج کی بنیاد ڈالی جس کا افتتاح ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لیٹن کے ہاتھوں ہوا۔ یہ کالج کامیابی کی منزلیں طے کرتا ہوا بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔

۳۔ تحریک ندوۃ العلماء :۔

سرسید احمد خاں کی جد وجہد کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی حالت کسی حد

---

[۱] شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ص ۸۸

تک درست ہوئی مگر حالات نے علمار دین کو انگریزوں کے خلاف اتنا برانگیختہ کردیا تھا کہ انگریزوں کی لائی ہوئی تمام چیزوں کو قابل نفرت سمجھتے اور کھل کر مخالفت کرتے تھے اس نفرت کی وجہ سے بعض علمار دین نے سرسید احمد خاں کی بھی مخالفت شروع کر دی جس کے باعث مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے پہلا گروہ صرف دینی علوم کا حامی اور علمار (بالخصوص علمار دیوبند) کا پیرو ہو گیا اور دوسرا گروہ جدید خیالات کا حامی اور سرسید احمد خاں کا ہمنوا تھا۔ الغرض دونوں گروہوں میں کش مکش بڑھتی رہی اور دونوں کے درمیان ایک بڑی کھائی پیدا ہو گئی جس کو دور کرنے کے لئے ایک تحریک کی بنیاد مدرسہ فیض عام کانپور کی چٹائی پر ۱۸۹۲ء[1] میں پڑی جس کے ناظم مولانا محمد علی مونگیریؒ مقرر کئے گئے اور اس تحریک کا نام ندوۃ العلمار قرار پایا۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ کے ساتھ اس تحریک میں مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا ثنار اللہ صاحب وغیرہ بھی شریک تھے ________ اس تحریک کے زیر نظر دو مقاصد تھے[2]

۱۔ علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

۲۔ رفع نزاع باہمی اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

لیکن جیسے جیسے تحریک ندوۃ العلمار اپنی ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی اس نے اپنے دائرہ کار اور بنیادی مقاصد میں اضافہ کیا اور دو کی جگہ اب چار مقاصد بنیاد قرار پائے[3]

۱۔ علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

---

[1] مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلمار حصہ اول، ص ۹۶
[2] ایضاً ص ۵۵
[3] ایضاً ص ۵۶

۲۔ ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب و سنت کے وسیع و عمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔

۳۔ اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

۴۔ اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

بہرحال تحریک ندوۃ العلماء کا علمائے دین میں عام طور پر گرم جوشی سے استقبال کیا گیا اور دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی تائید حاصل ہوئی۔ جس کی وجہ سے تحریک نے اپنی مختصر سی مدت میں بہت ترقی کی اور دوسرے سالانہ جلسے کے موقع پر دارالعلوم کی تجویز کو پیش کیا گیا تاکہ طلباء کو ابتدائی زمانے سے آخر تک ایک خاص طرح کی تربیت و تعلیم دی جائے۔ ساتھ ہی رہائش کا انتظام بھی کیا جا سکے۔ نصاب تعلیم میں قرآن، تفسیر، حدیث فقہ کے علاوہ ممالک اسلامی کا جغرافیہ اور اُن کی تاریخ، انگریزی، علم کلام، فلسفہ، منطق وغیرہ کو بھی شامل کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ اس کے علاوہ طلباء کو بحث و مباحثہ اور تقریر کرنے کی مشق کرائے جانے کی رائے بھی پیش کی گئی۔

چنانچہ مارچ ۱۸۹۸ء میں[۱] کانپور میں منعقدہ پانچویں اجلاس کے موقع پر دارالعلوم کی تجویز پاس ہوئی اور اس کا مقام لکھنؤ طے پایا۔ لہٰذا ۲ستمبر ۱۸۹۸ء کو ندوۃ العلماء کا مرکزی دفتر کانپور سے لکھنؤ منتقل ہو گیا[۲] اور ۲۶ستمبر ۱۸۹۸ء کو خاتون منزل میں دارالعلوم کا افتتاح ہوا[۳] اس کی افتتاحی تقریب کے وقت انگریز حکام بھی شریک ہوئے یہاں تک کہ دارالعلوم کا سنگ بنیاد انگریز گورنر کے ہاتھوں رکھا گیا۔

---

[۱] مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی۔ تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول، ص ۱۹۸

[۲،۳] " " " " " " " ص ۲۱۲

بالآخر تحریک ندوۃ العلماء کی بنیاد جن مقاصد کے تحت رکھی گئی تھی، ندوہ آج بھی بحسن و خوبی ان مقاصد کو انجام دے رہا ہے اور بہت حد تک علمائے دین اور جدید نظریہ فکر کے لوگوں کے درمیان کی خلیج کو پُر کر رہا ہے۔

۴۔ جمعیۃ العلماءِ ہند:۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جہاں دوسرے طبقہ کے لوگوں نے حصہ لیا وہاں علماء نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن اس میں ناکامی کے سبب علماء نے سیاست سے تقریباً بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی اور ان علماء میں سے بیشتر نے مذہبی و تعلیمی اور روحانی سرگرمیوں کو اپنا مقصد بنالیا جس کے نتیجے میں ایک طرف دارالعلوم دیوبند اور دوسری طرف ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ وجود میں آیا اور پھر ان دونوں سے فارغ ہونے والے علماء کے درمیان میں پیدا ہونے والی کھائی کو پُر کرنے کے لئے تحریک ندوۃ العلماء سامنے آئی۔ ۱۹۰۵ء میں جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے دارالعلوم دیوبند کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی تو انھوں نے سیاست کی نوعیت کا کام بھی شروع کیا۔

ادھر جب پہلی جنگ عظیم میں ترکوں نے اتحادیوں کے خلاف حصہ لیا تو ہندوستان کے مسلمان اور خاص کر کے علماء خلافت عثمانیہ کے تحفظ کے لئے فکرمند ہوئے اور انھوں نے حکومت برطانیہ سے خلافت عثمانیہ اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کے تحفظ کا مطالبہ کرنے کے لئے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کا استعمال کیا اور اس طرح باقاعدگی سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا لیکن انھیں جلد احساس ہوا کہ ان ... مقاصد کے حصول کے لئے مسلم لیگ موزوں جماعت نہیں ہے اس کے لئے ان کو ایک الگ تنظیم قائم کرنی چاہیئے۔

لہٰذا برطانوی حکومت سے اس کے مسلمانوں سے کئے گئے وعدوں کو پورا کرانے کے سلسلے میں ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کانفرنس کے ایک اجلاس

کا انعقاد ہوا جس میں ملک کے تمام صوبوں سے علماء کی بڑی تعداد جمع ہوئی۔ جب علماءِ خلافت کانفرنس سے فارغ ہوئے تو ۲۵ علماء نے ایک علیحدہ جلسہ منعقد کیا اور اس موقع پر بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر بحث و مباحثہ کے بعد تمام علماء نے اتفاق رائے سے طے کیا کہ ایک جمعیت قائم کی جائے جس کا نام جمعیۃ العلماء ہند رکھا جائے جو تمام ہندوستان میں کام کرے۔ ملک کے تمام حصوں میں اس کی شاخیں ہوں اور مسلمانوں کے فلاح و بہبود کے ذرائع و وسائل پر غور کر کے سچی مذہبی خیر خواہی اور ہمدردی کے ساتھ ان کی رہنمائی کرے۔[۱]

اس تجویز کے منظور ہونے کے بعد جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا اور تمام شرکاء اجلاس جمعیۃ العلماء ہند کے رکن بن گئے اور اس کے عارضی صدر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور ناظم سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب دہلوی منتخب کئے گئے۔[۲]

ایک سال بعد باقاعدہ جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس ہوا اور شیخ الہند محمود الحسن صاحب مستقل صدر، مفتی کفایت اللہ صاحب نائب صدر اور مولانا احمد سعید صاحب مستقل ناظم بنائے گئے لیکن جلد ہی شیخ الہند کے انتقال کے سبب مفتی کفایت اللہ صاحب نے قائم مقام کی حیثیت سے کام کیا بعد ازاں مجلس منتظمہ کے لکھنؤ کے اجلاس کے موقع پر مستقل صدر منتخب کر لئے گئے۔[۳]

بہر حال جمعیۃ علماء ہند اپنے قیام کے اوّل دن سے آج تک اپنے مقاصد کے حصول میں سچائی اور ایمانداری کے ساتھ لگی ہوئی ہے اور برابر مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی میدانوں میں خدمات انجام دے رہی ہے۔ دشمنانِ اسلام کے ہر حملے میں سینہ تان کر مورچہ سنبھالتی ہے اور انھیں

---

[۱] محمد میاں، جمعیت العلماء کیا ہے؟ حصہ اول، ۵، ۶ بحوالہ پروین روزینہ، جمعیۃ العلماء ہند، اوّل ص ۱۴
[۲]، [۳] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علماء ہند، ص ۵۴، ۵۵

اپنے ناپاک مقاصد میں کامیاب نہیں ہونے دیتی۔

۵۔ تبلیغی جماعت:۔

تبلیغی جماعت کا ذکر آتے ہی ہمارے ذہن میں سب سے پہلے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کا نام آتا ہے آپ شیخ غلام حسن کے فرزند اور ضلع منظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ اصلاً یوں ہوا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب محمد اسمٰعیل صاحب بستی نظام الدین میں بنگلہ صاحب مسجد میں سکونت پذیر ہوئے[1] تو ایک دن اس فکر میں تھے کہ کوئی مسلمان آتا جاتا مل جائے تو اس کے ساتھ جماعت سے نماز ادا کر لی جائے۔ اتفاق سے چند مسلمان آتے دکھائی دئے مولانا نے دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہو۔ لوگوں نے بتایا کہ مزدوری کرنے جا رہے ہیں۔ آپ نے معلوم کیا کہ اگر اتنی ہی مزدوری یہیں مل جائے تو کروگے! ان لوگوں نے منظور کر لیا۔ مولوی صاحب ان کو مسجد میں لے آئے نماز سکھانے اور قرآن پڑھانے لگے اور یومیہ مزدوری بھی دی جب ان کی نماز کی عادت پڑ گئی تو ان کی مزدوری ختم کر دی[2] دراصل یہ مدرسہ کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد دس[10] بارہ[12] میواتی مسلسل مسجد میں رہتے اور مولوی صاحب ان کو نماز سکھاتے، قرآن پڑھاتے اس طرح سے دین کی خدمت کرتے کرتے ۲۶ر فروری ۱۸۹۸ء کو مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا[3] مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے مولوی محمد صاحب نے مدرسہ کا نظام سنبھالا لیکن جب یہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے تو مولوی اسمٰعیل صاحب کے چھوٹے بیٹے مولانا محمد الیاس صاحب نے

---

[1] قاری محمد ایوب، تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ، ص ۸۱

[2] ایضاً ص ۸۲

[3] ایضاً ص ۸۳

مدرسہ کی نگرانی اپنے ذمے لی اور اس مدرسہ کو مرکز بنا کر ایک تحریک کا آغاز کیا۔
مولانا الیاس صاحب ۱۳۰۳ھ کو کاندھلہ میں[1] پیدا ہوئے اور ابتدا سے ہی انھوں نے اپنے والد کی علمی لیاقت سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہی سے استفادہ کیا۔ میوات کے لوگ آپ کے والد اور بڑے بھائی سے بہت عقیدت رکھتے تھے لہٰذا یہ سلسلہ انھوں نے آپ کے ساتھ بھی جاری رکھا۔ اور آپ کو میوات آکر دینی کام کرنے کی دعوت دی۔ آپ میوات پہنچے تو دیکھا کہ میوات کے لوگوں کی مذہبی حالت بہت خراب تھی۔ اسلامی تعلیمات سے بہت دور، صرف نام کے ہی مسلمان تھے۔ اس دردناک حالت کو دیکھ کر آپ بہت بے چین و مضطرب ہوئے اور فوراً وہاں دینی تعلیم کی درس و تدریس کے لئے مدارس کھولنے شروع کر دئے لیکن جلد ہی آپ کو محسوس ہوا کہ ان مدارس سے خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آرہا ہے کیونکہ بچے مدرسے کے وقت کے علاوہ باقی تمام وقت اپنا اسی گندے ماحول میں گزارتے ہیں لہٰذا اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک دینی تحریک کی ضرورت ہے اس نظریے کے تحت میوات کے صاحب اثر لوگوں کے ساتھ ۲ اگست ۱۹۳۴ء کو قصبہ[2] نوح میں ایک پنچایت کی گئی۔ اس پنچایت میں طے کیا گیا کہ اسلام کے ارکان کی پوری طرح پابندی کی جائے اور دین کی دعوت و اشاعت کا کام اجتماعی طور سے کیا جائے اور اس کے لئے لوگ اپنے گھر، اپنے علاقے کو چھوڑ کر آس پاس کے دوسرے علاقوں میں کچھ وقت کے لئے جائیں، وہاں گشت کریں، لوگوں سے ملیں اور ان کو نماز سکھائیں و پڑھوائیں۔ اسلام کی تعلیمات سے واقف کرائیں اور ان کو دین کی تبلیغ کے لئے آمادہ کریں۔
دراصل اس پنچایت سے تبلیغی جماعت کا باقاعدہ آغاز ہوا اور اس کے مندرجہ ذیل اصول قرار پائے[3]

---

[1] قاری محمد ایوب، تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ، ص ۸۸
[2] " " " " " ص ۹۲
[3] " " " " " ص ۹۳

۱۔ کلمہ کی تصحیح
۲۔ نماز کی تصحیح
۳۔ علم و ذکر کی تحصیل
۴۔ اکرام مسلم
۵۔ تصحیح نیت
۶۔ تفریغ وقت یعنی وقت فارغ کرنا۔

الغرض اس تحریک نے بہت جلد عوام و خواص میں ایک حرکت پیدا کر دی اور بہت تیزی سے لوگوں کو اپنا بھولا ہوا سبق یاد آنے لگا اور نہ صرف میوات میں اصلاح کا کام بحسن و خوبی انجام پانے لگا بلکہ پورا برصغیر ہند و پاک اس کے برکات و فیوض سے مستفیض ہونے لگا۔

۱۳ر جولائی ۱۹۴۴ء (۲۱ر رجب ۱۳۰۳ھ) بروز جمعرات کو مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ ... اس دنیا کو خیر آباد کہہ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے[۱] آپ کے بعد اس اسلامی تحریک کی ساری ذمہ داری مولانا یوسف صاحب پر آن پڑی آپ ایک بڑے بزرگ اور مخلص انسان تھے۔ آپ کی کوششوں سے تبلیغی جماعت نے بہت زیادہ ترقی کی اور اب صرف ہند و پاک میں ہی نہیں بلکہ مغربی ممالک میں بھی جماعت کا کام تیزی سے چلنے لگا جس سے دنیا کے لاکھوں انسانوں کو مستفیض ہونے کا موقع ملنے لگا۔

۲۔ جماعت اسلامی :۔

جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہیں۔ آپ کے خاندان کا تعلق دہلی سے تھا۔ لیکن ان کے والد حیدر آباد کے مشہور شہر اورنگ آباد منتقل ہو گئے

---

[۱] قاری محمد ایوب، تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ، ص ۱۰۳

تھے۔ لہذا سید ابوالاعلیٰ مودودی ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ فقہ، عربی ادب وغیرہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر والد سے حاصل کرنے کے بعد اسکول میں جدید علوم سے استفادہ کیا۔ بچپن سے ہی تحریر و تقریر میں خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں اخبار تاج (جبل پور) کے ایڈیٹر کی حیثیت سے صحافتی زندگی کی شروعات کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت تحریک وجود میں آچکی تھی۔ ملک میں برطانوی حکمرانوں کے خلاف ایک خاص قسم کا جوش و جذبہ ابھر رہا تھا۔ ادھر برطانوی حکمراں اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں کے مذہبی، سماجی، تعلیمی وغیرہ تمام شعبوں میں مغربیت کے اثرات داخل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لئے اخبار حکومت کے خلاف پالیسی اختیار کرنے کے باعث بند ہوگیا۔

الغرض مولانا دہلی آئے اور انگریزی زبان سیکھی اور پھر اس کے توسط سے فلسفہ تاریخ، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات کا گہرا مطالعہ کیا اور دہلی میں پہلے جمعیۃ العلماء کے ترجمان "مسلم" اخبار کی ادارت سنبھالی۔ اس کے بند ہونے کے بعد جمعیۃ نے "الجمعیت" اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا اور اس کی ادارت مولانا کے سپرد کردی۔ اس زمانے میں تحریک خلافت کی ناکامی، نیز حکومت وقت کا ہندی زبان کے نام پر اہل وطن کو مسلمانوں کے خلاف متحد کرنا، یہ سب ایسی باتیں تھیں جس نے مولانا کو بے حد متاثر کیا جس کے باعث الجمعیت سے علیحدگی اختیار کرلی اور اس وقت سے اسلام کے اعلیٰ مقاصد کی سربلندی کو اپنا نصب العین بنالیا[1]

بہرحال ۱۹۲۸ء میں مولانا حیدرآباد آگئے اور پوری یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام شروع کردیا۔ نیز ایک اردو ماہنامہ "ترجمان القرآن" جاری کیا اور اس کے ذریعہ اسلامی افکار و نظریات کے احیاء اور اہل اسلام کو خالص اور

---

[1] خالد حامدی، مولانا مودودی، حالات، دینی خدمات، آخری سفر، ص ۱۸

مکمل اسلامی طرزِ عمل اختیار کرنے کی دعوت دی۔ ساتھ ہی ساتھ "ترجمان القرآن" کے ذریعے بے دین اور مغرب کے مادہ پرستانہ طرزِ فکر کے حامل حضرات کے اسلام کے بارے میں اٹھائے ہوئے اعتراضات کا علمی انداز میں جواب دیا اور بنیادی عقائد میں پیدا کئے گئے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کے لئے مدلل علمی گفتگو کی اور بتایا کہ اللہ کی بندگی کا تقاضا ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے اسلامی احکامات کو جاری و ساری کیا جائے۔

سرمایہ داری و اشتراکیت پر بھرپور تنقید کی اور پورے اعتماد سے اعلان کیا کہ تمام مسائل کا حل صرف اور صرف اسلامی تعلیمات میں مضمر ہے اور اسلامی سیاست کا مقصد صرف اور صرف اس زمین پر حاکمیت الٰہ کا قیام ہے۔

حالات کتنے ہی ناسازگار ہوئے لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے مقصد کو اوجھل نہیں ہونے دیا اور آخر کار ملک و بیرون ملک ہزاروں افراد و علماء اور مفکرین مولانا کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور ان کے خیالات سے اتفاق ظاہر کرنے لگے اور بہت بڑی تعداد میں علماء اور مفکرین نے مولانا مودودی کو خطوط لکھ کر اس بات کی دعوت دی کہ دعوت اسلامی کو عام کرنے کے لئے باقاعدہ ایک جماعت کی تشکیل دی جائے۔ چنانچہ یکم شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس موقع پر مختلف حلقوں کے نمائندے اور کچھ دوسرے حضرات مولانا مودودی کی دعوت پر جمع ہوئے ان شرکاء اجتماع کی کل تعداد ۷۵ تھی۔

جماعت اسلامی کے قیام کے ساتھ ساتھ ایک تحریری دستور منظور ہوا اور اتفاق رائے سے مولانا مودودی کو امیر جماعت منتخب کیا گیا۔ اجلاس کے تیسرے دن امیر جماعت کی حیثیت سے دستور کے مطابق مولانا نے شوریٰ کا انتخاب کیا اور دوسرے دن شوریٰ کے اجلاس میں جماعت کے کاموں کو متعدد شعبوں کے تحت منظم کیا گیا۔

۱۔ شعبہ علمی و تعلیمی
۲۔ شعبہ نشر و اشاعت
۳۔ شعبہ تنظیم جماعت
۴۔ شعبہ مالیات
۵۔ شعبہ دعوت و تبلیغ

الغرض جماعت اسلامی جن مقاصد کے تحت وجود میں آئی تھی۔ اس نے اس کے حصول کی کوشش شروع کر دی۔ اور پھر جیسے جیسے جماعت کی علمی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے مختلف جانب سے اس کی مخالفت بھی بڑھتی گئی۔

ان تمام مخالفتوں کی پرواہ کئے بغیر جماعت اسلامی نے اپنے نصب العین کے حصول کے لئے برابر کوشش جاری رکھی اور پھر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب جب ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور ایک نیا ملک پاکستان وجود میں آیا تو دوسری تمام جماعتوں کی طرح جماعت اسلامی بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اور جماعت اسلامی ہند کا جماعت اسلامی پاکستان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اور ۱۹۴۸ء کو الٰہ آباد کے اجتماع میں ارکان جماعت نے اتفاق رائے سے مولانا ابواللیث صاحب ندوی کو امیر جماعت اسلامی ہند منتخب کیا۔ جماعت کے مرکزی دفاتر ملیح آباد (لکھنؤ) میں رکھے گئے۔ بعد ازاں یہ دفاتر ۱۹۴۹ء کو ریاست رام پور میں منتقل ہو گئے اور پھر بعد میں جماعت کا مرکزی دفتر ملک کے دارالحکومت میں ۱۹۶۰ء کو منتقل کر دیا گیا اور نئے حالات کے تحت بہت سی تبدیلیاں آئیں ــــ سابقہ دستور کے تحت جماعت اسلامی کا نصب العین حکومت الٰہیہ کا قیام تھا۔

بعض لوگ قصداً یہ غلط فہمی پیدا کرتے تھے کہ جماعت اسلامی ایک غیر مسلم عوام کی اکثریت والے ملک میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔

اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے جماعت اسلامی ہند نے نئے دستور

کے تحت اس کی ہم معنی اصطلاح "اقامت دین" کو اپنا نصب العین قرار دیا۔[1]

الغرض آج جماعت اسلامی نے اپنی بے پناہ کوششوں اور صلاحیتوں سے جتنا دینی لٹریچر فراہم کیا ہے اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ جس کے نتیجے میں آج کے پڑھے لکھے نوجوانوں کے سامنے اسلام کی اصل وصاف تصویر ہے اور انھیں کوئی آسانی سے دھوکہ نہیں دے سکتا۔

مندرجہ بالا اسلامی تحریکوں میں سے جو کہ ۱۹ ویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدا میں ہندوستان میں شروع ہوئیں ان میں سے ۱۹۴۷ء تک صرف مندرجہ ذیل اسلامی تحریکیں ہی باقی رہیں۔

۱۔ جماعت اسلامی
۲۔ تبلیغی جماعت
۳۔ جمعیۃ علمار
۴۔ تحریک دیوبند
۵۔ تحریک ندوۃ العلمار

۱۹۴۷ء کے بعد مندرجہ بالا تمام تحریکوں نے کافی ترقی کی اور ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی، ثقافتی، اور کسی حد تک سیاسی زندگی کو متاثر کیا۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر جو خوف وہراس اور ناامیدی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ان تحریکوں کے ذریعہ ختم ہوئی۔ ان کے اندر خود اعتمادی زندہ رہنے کا جذبہ، ترقی کا حوصلہ اور اصلاح کی فکر پھر سے زندہ ہوئی۔

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلم معاشرے کا از سر نو احیاء اگر سچ پوچھیے تو انھیں تحریکوں کا ثمرہ ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر اس تحقیقی مقالہ میں ان ہی اسلامی تحریکوں

---

[1] دفعہ ۴، دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور، ص ۸

کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور اس مقالے کو مقدمہ کے بعد مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تحریر کیا گیا ہے۔

۱۔ جماعت اسلامی

۲۔ تبلیغی جماعت

۳۔ جمعیۃ العلمار

۴۔ مندرجہ ذیل تحریکوں میں ۱۹۴۷ء کے بعد مزید ترقی۔

الف: تحریک دیوبند

ب: تحریک ندوۃ العلمار

۵۔ ان تحریکوں کا ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی زندگی پر اثر۔

۶۔ اختتام۔

باب اوّل

جماعتِ اسلامی

بانئ جماعت مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ

انسانوں کے اس سیل بیکراں میں اشخاص کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں لیکن شخصیتیں کم ہی پائی جاتی ہیں۔ پھر ان میں عہد آفریں اور تاریخ ساز شخصیتیں خال خال نظر آتی ہیں۔

یوں تو رواں صدی میں اسلامی دنیا میں بڑے بڑے مفکر، فلسفی اور مرد مجاہد پیدا ہوئے ہیں مگر ایک شخص نے جسے سید ابوالاعلیٰ مودودی کہا جاتا ہے نئی نسل اور عام انسانوں کے افکار و نظریات پر جتنا گہرا اثر ڈالا ہے اور اپنی ہمہ گیر اثر پذیری کے باعث سید مودودیؒ جس بلند مقام پر ایستادہ ہیں کوئی دوسرا ان کا ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ ان میں بیک وقت اس قدر متعدد صلاحیتیں مجتمع ہوگئی تھیں جن کا احاطہ کرنے کے لئے یقیناً ایک ضخیم کتاب بھی کفایت نہیں کر سکے گی۔ چند صفحات کی تو کیا حیثیت ہے۔ اس عظیم عبقری شخصیت کا ایک مختصر سا تعارف پیش خدمت ہے۔

سید مودودی صاحبؒ کے خاندان کا تعلق دہلی سے تھا لیکن ان کے والد ریاست حیدرآباد کے معروف شہر اورنگ آباد منتقل ہوگئے لہٰذا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے[1] اس لئے ان کی زندگی کے ابتدائی تیرہ[3] چودہ[4] سال اورنگ آباد میں گزرے ہیں[2]۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے گھر پر ہی حاصل کی پھر مدرسہ فرقانیہ اورنگ آباد میں داخلہ لیا۔

---

[1] ثروت صولت، مولانا مودودیؒ کی تقاریر، اسلامی پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور، ص ۹
خالد حامدی، مولانا مودودیؒ، حالات، دینی خدمات، آخری سفر، ص ۱۸

[2] یہ شہر اب ریاست مہاراشٹر کا ایک ضلع بن چکا ہے۔

عربی ادب اور فقہ کی متعدد کتابیں والد صاحب سے گھر پر پڑھ لی تھیں اب اسکول میں کیمسٹری، فزکس، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ جدید علوم سے استفادہ کیا اور اس میں اچھی استعداد حاصل کی۔ یہیں مدرسہ فرقانیہ میں پڑھائی کے دوران تحریری اور تقریری مقابلوں میں حصہ لیا۔ فطرۃً یہ دونوں صلاحیتیں اللہ تعالےٰ نے مولانا کی طبیعت میں ودیعت کر رکھی تھیں۔ چنانچہ لکھنے اور بولنے کی صلاحیتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

پڑھائی کے ساتھ ساتھ ابتدا میں تو نہیں لیکن آگے چل کر مولانا کو کھیل کود میں بھی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ مولانا کے خاندان میں لکڑی چلانے کا فن بہت مقبول تھا۔ لہٰذا آپ نے شروع میں لکڑی چلانے کا فن سیکھا۔ اس فن کے سکھانے میں خصوصاً آپ کے ماموں اور خالہ زاد بھائیوں نے بہت تعاون دیا۔ مدرسہ میں داخلہ کے بعد فٹ بال اور کرکٹ کے کھیل بھی کھیلے لیکن ان میں کسی طرح کی استعداد نہ پیدا کر سکے۔

۱۹۱۸ء سے پندرہ۱۵ سال کی عمر میں صحافتی زندگی کی شروعات کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کی قومیں ترکوں پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑ رہی تھیں اور ترکی کے حصے بخرے کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ ان حالات میں ہندوستان کے مسلمان ایک عجیب کرب ناک حالات سے دوچار تھے۔ طرابلس کے شہیدوں کے لئے ہندوستانی مسلمان خون کے آنسو رو رہے تھے۔ خلافت کے نام پر ایک ملک گیر تحریک پیدا ہو چکی تھی۔ ملک پر قابض برطانوی حکمرانوں کے خلاف ایک خاص قسم کا جوش و جذبہ ابھر رہا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے نعروں سے ساری فضا گونج رہی تھی اور پورے ملک میں مولانا محمد علی جوہر اور گاندھی جی کا بول بالا تھا۔

اپنی صحافتی زندگی کے آغاز میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جب "انجمن نظر بندان اسلام" کی جانب سے شائع ہونے والا اخبار "تاج" (جبل پور)

کی ادارت کا کام سنبھالا تو اخبار کی پالیسی کے مطابق انگریزوں کے خلاف اور ملک کی آزادی کے لئے اپنے کام کی ابتدا کی لیکن یہ اخبار حکومت کے خلاف پالیسی اختیار کرنے کے باعث زیادہ عرصہ نہ چل سکا اور بند ہو گیا۔ اس اخبار کے بند ہونے کے بعد مولانا مودودیؒ اپنے جدّی وطن دہلی تشریف لے آئے۔

دہلی آنے پر مولانا نے انگریزی زبان سیکھی اور بعد ازاں اس میں اتنی لیاقت پیدا کر لی کہ اس زبان کے توسط سے فلسفہ، تاریخ، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا اور یہ اس لئے کہ جس نئی نسل کو انھیں مخاطب کرنا تھا، اس کی ذہنی اور فکری تعمیر مغرب کے مادی افکار و نظریات کے زیر سایہ ہو رہی تھی۔

مولانا مودودیؒ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے قدیم و عصری علوم اور مشرقی و مغربی افکار کا مطالعہ ایک خاص منصوبے اور سنجیدہ طریقہ پر کیا۔ ورنہ دو الگ الگ تہذیبوں اور افکار و نظریات کا ایک ساتھ مطالعہ کرنا کچھ اچھا تصوّر نہیں کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبالؒ کی زبان میں ایک طرف ساقی سے محرومی تھی تو دوسری جانب صہبائے ذوق تھی۔

مولانا مودودیؒ بھی خود اس احساس کے حامل تھے۔ وہ عربی مدارس اور اس کے اساتذہ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"صدیوں سے ہماری مذہبی رہنمائی جس گروہ کے ہاتھ میں ہے اس نے اسلام کو ایک جامد اور غیر متحرک چیز بنا دیا ہے غالبًا چھٹی ساتویں صدی ہجری کے بعد سے اس گروہ کے یہاں جنتری بدلنی موقوف ہو گئی ہے۔ دنیا بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ دنیا کے حالات، خیالات، رجحانات و نظریات بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے۔ تمدن کے معاملات اور مسائل نے کتنے پلٹے کھائے۔ مگر ہمارے پیشوا اپنے آپ کو ابھی تک اس ماحول میں سمجھ

رہے ہیں۔ جو پانچ سو برس پہلے پایا جاتا تھا ــــ نئے تغیرات سے بے خبر رہے۔ زندگی کے نئے مسائل سے کوئی غرض نہ رکھی اور کوشش یہی کرتے رہے کہ اپنی قوم کو بھی زمانے کے ساتھ چلنے سے روک دیں بلکہ مستقل سے ماضی کی طرف کھینچ کر لے جائیں۔"[1]

مولانا مودودیؒ عصری تعلیم اور اس کے اثرات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"موجودہ نظام تعلیم ناقص بھی ہے اور ضروریات کے لئے ناکافی بھی آج کل یونیورسٹیوں سے جو لوگ فارغ ہو کر نکلتے ہیں۔ وہ اخلاقی معیار اور زندگی کے صحیح اقدار کا کوئی خاکہ اپنے ذہن میں نہیں رکھتے وہ کذب و دروغ گوئی سے محبت کرتے ہیں اور حق کے مقابلے میں مصلحت کوشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی برتتے ہیں۔ ان کا طرز عمل غلط کارانہ اور غیر ایماندارانہ ہوتا ہے اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے ایک بے خدا تعلیم کا جو جسم اور دماغ کے ارتقا پر تو بے انتہا زور دیتی ہے لیکن روح کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔"[2]

۱۹۲۰ء میں اخبار "تاج" دوبارہ جاری ہوا اور اس بار پھر پرانے تعلق کے باعث مولانا کو اس کی ادارت سنبھالنا پڑی۔ اس وقت ہندوستان کے سیاسی حالات مزید بدتر ہو رہے تھے۔ برطانوی حکمرانوں کے خلاف ہندوستانیو کا غیظ و غضب اپنے عروج پر تھا۔ مولانا مودودیؒ بھی صحافت کے راستہ نظری سیاست میں داخل ہو گئے اور اپنے قلم کی کاٹ اور گہری کر دی۔ حکومت نے اس پر گرفت کی اور ایک مضمون خلاف قانون قرار دے کر اخبار

---

[1] مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تنقیحات، ص ۱۴۰

[2] متین باغیتی، مولانا مودودی اور فکری انقلاب، ص ۲۲۱، ۲۲۲

کے مالک تاج الدین صاحب اور مولانا کے خلاف قانونی کارروائی کی۔ اس قانونی کارروائی میں مولانا مودودیؒ تو بچ گئے لیکن تاج الدین صاحب نہ بچ سکے اس کا مولانا مودودی کو افسوس تو بہت ہوا لیکن انھوں نے حق و صداقت کی جو راہ اپنائی تھی اس سے دست بردار نہ ہوئے بلکہ ہر ظلم و جور کے خلاف ان کے قلم میں مزید تیزی آگئی اور یہی نہیں انھوں نے اپنے مستقبل کے لئے ایک نئی راہ پیدا کی۔

اخبار "تاج" بند ہونے کے بعد ۱۹۲۰ء کے آخری ایام میں مولانا مودودی پھر دہلی آگئے۔ یہاں ان کی ملاقات جمعیۃ العلماء کے روح رواں مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور مولانا احمد سعیدؒ صاحب سے ہوئی۔ ان حضرات نے نوجوان ابوالاعلیٰ کی شخصیت میں زندہ اسلام کے حقیقی جذبات و احساسات دیکھ کر جمعیۃ العلماء کے ترجمان "مسلم" اخبار کی ادارت ان کے سپرد کر دی۔

یہاں سے مولانا مودودیؒ کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی کالی گھٹائیں اور "ہجرت تحریک" کی غلط منصوبہ بندی کے باعث مولانا ایک انتہائی تلخ تجربہ سے دوچار ہوئے اور اب انھیں اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگا کہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ اپنی صحیح سمت میں سفر نہیں کر رہی ہے اور مولانا مودودیؒ غالباً ابھی اس حیثیت میں نہیں تھے کہ مسلمانوں کی انگلی پکڑ کر ——— انھیں ان کی صحیح سمت سے روشناس کراتے۔

بعض ناگزیر حالات کے باعث اخبار "مسلم" بند ہو گیا اور مولانا مودودیؒ حیدرآباد چلے گئے۔ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں پھر دہلی واپس آگئے۔ اس بار مولانا محمد علی جوہر سے تعلقات پیدا ہوئے انھوں نے مولانا مودودیؒ کی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انھیں اپنے اخبار میں شمولیت کی دعوت دی لیکن مولانا احمد سعید صاحب نے جمعیۃ العلماء کی جانب سے اخبار الجمعیۃ

نکالنے کا فیصلہ کیا اور اس کی ادارت مولانا مودودیؒ کے سپرد کر دی۔

مولانا مودودیؒ کی الجمعیۃ سے وابستگی، ان کی ذہنی بیداری کے لئے سنگ میل ثابت ہوئی۔ اس دوران ان کی فکر میں ایک نیا نکھار آیا اور مسلمانان ہند کے سیاسی رُخ کو مزید سمجھنے کا بھرپور موقع ملا۔ اس کے ساتھ ہی "تحریک خلافت" کی ناکامی، برادران وطن کا ایک دم کاندھا بدل کر شدھی تحریک میں جذب ہو جانا۔ نیز حکومت کا ہندی زبان کے نام پر اہل وطن کو مسلمانوں کے خلاف متحد کرنا۔ یہ سب ایسی باتیں تھیں جن سے مولانا بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ مسلمانوں کا مسئلہ اس طرح حل نہیں ہوگا لہٰذا انھوں نے اپنی ایک تحریر میں لکھا ہے:

"اگر اس قوم کے جمہور اس طرح بے ہمتی اور پست حوصلگی کے ساتھ بیٹھے رہے اگر اس کے نوجوان یوں ہی غیروں کے پس خوردہ کھانے کو اپنا منتہائے کمال سمجھتے رہے۔ اگر ان کے علما اسی طرح اپنی فقہ و کلام کی فرسودہ بحثوں میں اُلجھے رہے۔ اگر ان کے لیڈروں اور سیاسی پیشواؤں کی ذلیل ذہنیت کا یہی حال رہا کہ لشکر اغیار کے پیچھے لگ کر چلنے کو مجاہدانہ عزیمت کا بلند ترین مرتبہ سمجھیں اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے فریب میں مبتلا کرنا کمال و دانش مندی خیال کریں ـــــ اس سینکڑوں کے انبوہ سے چند مردان خدا بھی جہاد و اجتہاد فی سبیل اللہ کے لئے کمر باندھ کر نہ اٹھ سکیں تو پھر دنیا جس اسفل السافلین کی طرف جا رہی ہے اس طبقۂ جہنم میں یہ قوم بھی دنیا کی دم کے ساتھ بندھی ہوئی جا گرے گی۔"[1]

---

[1] مولانا مودودیؒ، تنقیحات، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ص ۶۷

مولانا مودودیؒ کی دینی غیرت وحمیت کا یہی شدید احساس تھا کہ انھیں دنوں جب شدھی تحریک کے بانی سوامی شردھانند کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر کیچڑ اچھالے جانے کے باعث ایک مسلمان نوجوان عبدالرشیدؒ کے ہاتھوں قتل ہوا اور اس کے بعد غیر مسلموں کی جانب سے اس بات کا کھلے عام اظہار ہونے لگے کہ قرآن کی تعلیم مسلمانوں کو خونخوار اور قاتل بناتی ہے۔ اس کی تعلیم امن و امان اور سلامتی کے خلاف ہے۔ یہاں تک کہ اس موقع پر گاندھی جی جیسے صائب الرائے شخص نے بھی بار بار اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ ــــــ

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔"[۱]

تب مولانا مودودیؒ نے ۲۳ سال کی عمر میں ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا کہ جس کا نام سنتے ہی اچھے اچھے صاحب علم حضرات بھی وحشت زدہ ہو جاتے ہیں لیکن مولانا نے ذہنی اور جسمانی غلامی کے اس دور میں پہلی بار علمی اور تحقیقی انداز میں جہاد کے موضوع پر ایک ایسی بلند پایہ کتاب "الجہاد فی الاسلام" کے نام سے تصنیف کی جس کی نظیر آج بھی کوئی دوسری زبان پیش کرنے سے قاصر ہے۔

"الجہاد فی الاسلام" لکھنے کے سلسلہ میں مولانا کو اسلام کا بھرپور مطالعہ کرنا پڑا۔ اس مطالعہ نے مولانا کے ذہن و فکر کو اسلام اور اس کے افکار و نظریات پر مزید استحکام عطا کیا اور اب مولانا مودودی ایک ایسی حقیقت پسندی اور جذبۂ ایمانی سے سرشار تھے کہ جس کے باعث انھوں نے وطنی گروہ بندیوں اور سستی قسم کی سیاست کے ماحول کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ اخبار الجمعیۃ سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس وقت سے اسلام کے اعلیٰ مقاصد کی سربلندی کو اپنا نصب العین بنایا۔

---

[۱] مولانا مودودی صاحبؒ، الجہاد فی الاسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ص ۱۸

مولانا مودودیؒ ۱۹۲۸ء میں پھر حیدرآباد چلے گئے اور اب انھوں نے پوری یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ تصنیف وتالیف کا کام شروع کر دیا۔ نیز ایک اردو ماہنامہ "ترجمان القرآن" جو سید ابو محمد مصلح صاحب نے جاری کیا تھا اُن سے مالکانہ حقوق حاصل کرکے اپنی ارادت میں نکالنا شروع کیا جس کا مقصد اسلامی تحریک کے لئے ماحول بنانا اور کھرے کھوٹے کو الگ کرنا دکھانا تھا بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ کام کی ابتدا تھی جو مولانا مودودیؒ کو مستقبل میں اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں انجام دینا تھا۔

چونکہ اس دور میں مسلم معاشرے میں عام طور پر دینی رُجحان کم ہوتا جارہا تھا۔ انگریزی پڑھے لکھے طبقہ میں اسلامی معاشرت سے بیزاری اور اسلامی علوم سے بیگانگی پیدا ہوچکی تھی اس لئے مولانا نے اپنے اسلامی جریدے "ترجمان القرآن" کے ذریعے اسلامی افکار و نظریات کے احیار اور اہل اسلام کو خالص اور مکمل اسلامی طرز عمل اختیار کرنے کی دعوت دی اس دور میں مجلّہ "ترجمان القرآن" اپنے اعلیٰ مقاصد کے اعتبار سے مسلمانوں کے لئے ایک روشن مینار بن کر ابھرا۔ مسلم معاشرے کی اصلاح کے سلسلہ میں مولانا کے مقاصد کو پورا کرنے میں یہ مجلہ زبردست معاون ثابت ہوا۔

قیام جماعت

مولانا محترم نے ترجمان القرآن کے ذریعے بے دین اور مغرب کے مادہ پرستانہ طرز فکر کے حامل حضرات کے اسلام کے بارے میں اٹھائے ہوئے اعتراضات کا علمی انداز میں جواب دیا۔ اور بنیادی عقائد میں پیدا کئے ہوئے شکوک وشبہات رفع کرنے کے لئے مدلل اور علمی گفتگو کی اور بتایا کہ اللہ کی بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ

انسان زندگی کے ہر شعبے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام یعنی اسلامی تعلیمات کو اپنا مطمح نظر بنائے اور اس پر خلوص نیت کے ساتھ عمل پیرا ہو۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت پر بھرپور تنقید کی اور پورے یقین و اعتماد سے اعلان کیا کہ انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل صرف اسلامی تعلیمات میں مضمر ہے۔

ملت اسلامیہ کو بتایا کہ انھیں مغرب کی پیروی کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس دین کی نعمت سے نوازا ہے جس میں ساری انسانیت کے مسائل کا حل پوشیدہ ہے لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ تمھاری اپنی زندگی اور تمھارا معاشرہ ہر طرح کے خارجی غلبہ و اثر سے پاک ہو۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس بات پر بھرپور زور دیا کہ اسلام کے سچے پیروکاروں کی ذمہ داری ہے کہ دوسروں کے سامنے اسلامی تعلیمات کا قولی و عملی نمونہ بن کر آئیں اور اسلامی سیاست کا مقصد صرف اور صرف اس زمین پر حاکمیت الٰہ کا قیام ہے۔

لیکن قوموں کے مزاج کا بھی عجیب عالم ہے کبھی وہ تند و تیز پہاڑی چشمہ کی مانند تیزی سے آگے بڑھتی ہیں اور کبھی یخ بستہ جوئے کم آب کی طرح منجمد ہو جاتی ہیں۔ کبھی ان میں قوت عمل کی حرارت آسمان کی بلندیوں اور زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جانے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے اور کبھی کوئی اللہ کا بندہ اپنی زندگی کو پوری طرح گھلا ڈالے مگر ان کے در دل پر ایک بار بھی دستک نہیں ہوتی۔

"ترجمان القرآن کو میری ادارت میں نکلتے ہوئے ایک
سال ہو چکا ہے اور اب اس پرچہ کے ساتھ اس کا دوسرا سال
شروع ہو رہا ہے اس مدت میں اللہ نے اپنے دین اور اپنی
کتاب کی خدمت کے لئے جو توفیق مجھے عطا فرمائی اور سخت ہمت شکن

حالات میں خدمت کے لئے کمر بستہ رہنے کی جو استقامت بخشی
اس کے لئے شکر بجالانا میرا فرض ہے اگرچہ میرا فرض اس
فعل کے مقابلے میں بہت حقیر ہے۔
میں نے جن حالات میں اس رسالے کی ادارت سنبھالی تھی
اور بعد میں مسلسل کئی مہینے تک جو مشکلات مجھے پیش آتی رہیں۔
ان سے یقیناً میرے حوصلے پست ہو جاتے اگر میرا اعتماد خدا کے
بجائے دنیوی اسباب اور خود اپنی قوت پر ہوتا ہے[1]

ابتدا سے ہی حالات کتنے ہی ناسازگار اور ناگفتہ بہ رہے لیکن مولانا محترم نے اپنے حقیقی مقصد کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے بارے میں بحث و مباحثہ کے تحت متحدہ قومیت کے علمبرداروں پر سخت تنقید کی کیوں کہ ایسے لوگ اپنے قول و فعل سے اسلامی تصورات کو مجروح کر رہے تھے اور ان کے سیاسی طرز فکر کا اسلامی سیاست کے مقاصد سے کوئی تعلق نہ تھا۔

"آپ انگریزی حکومت کو مٹانے کے لئے اس گروہ سے
موالات کر رہے ہیں مگر یہ بتائیے اس ظالم حکومت کو مٹا کر ایک
عادل حکومت قائم کرنے کا آپ نے کیا انتظام کیا ہے ؟ کون
سی طاقت آپ نے فراہم کی ہے جس سے آپ دوسری حکومت
کی تشکیل حق کے اصولوں پر کر سکیں گے ؟ یہ نہیں تو جانے دیجئے
یہی بتا دیجئے کہ آپ نے خود اپنی قوم کو باطل اثرات سے بچانے
کا کیا بندوبست کیا ہے ؟ فرض کیجئے کہ آپ کی قوم میں
پروپیگنڈے کی قوت اور تعلیم کے وسائل سے ایک ایسی رائے عامہ

---

[1] مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ رسالہ ترجمان القرآن، محرم ۵۵، ص ۲۱

تیار کر دی جاتی ہے جو قوانین اسلامی میں ترمیم و تنسیخ پر راضی ہو بلکہ مصر ہوں، آپ کی اپنی قوم کے افراد ایسے قوانین کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو اصول اسلام کے خلاف ہوں۔ تو وہ کون سے بنیادی حقوق ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ ان چیزوں کو روک سکتے ہیں؟ فرض کیجئے کہ آپ کی قوم بتدریج ہمسایہ قوم کے طرز معاشرت آداب و اطوار، عقائد و افکار قبول کرنا شروع کر تی ہے اور اپنے قومی امتیازات کو خود بخود مٹانے لگتی ہے۔ کون سا کاغذی میثاق اس تدریجی انجذاب کی روک تھام کر سکے گا ـــــ فرمائیے تو سہی کہ آپ نے باطنی انقلاب روکنے اور تدریجی انجذاب روکنے کے لئے کون سا تحفظ فراہم کر رکھا ہے؟[1]"

محترم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ترجمان القرآن کے مضامین کے ذریعہ مسلم لیگ کے سیاسی فکر پر بھی زبردست تنقید کی۔ کیونکہ اس کا طریقہ کار اور جن مقاصد کا اس کے قائدین اظہار کرتے تھے اس کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہ تھا۔

"یہ دعوت اصل میں قوم پرستانہ دعوت یعنی ان کی پکار اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں بلکہ اس طرف ہے کہ ان کی قوم متفق و متحد ہو کر ہندو قوم کے مقابلے میں اپنے دنیاوی مفادات کی حفاظت کرے گی گویا جس طرح آزادی پسند لوگوں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنایا۔ اسی طرح انھوں نے ہندوؤں کو اپنا قومی حریف بنالیا ہے"[2]

---

[1] مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ ـ سیاسی کشمکش، حصہ اول، ص ۲۹، ۳۰
[2] " " " " حصہ سوم، ص ۱۱۴

ایک دوسری جگہ وہ تحریر کرتے ہیں :۔

"پھر اس لڑائی میں بار بار اسلام اور مسلم کا نام لیتے ہیں، جس کی وجہ سے اسلام خواہ مخواہ فریق جنگ بن کر رہ گیا اور غیر مسلم قومیں اس کو اپنا سیاسی حریف سمجھنے لگیں۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اسلام کی دعوت دینے کے قابل نہیں رکھا بلکہ اسلام کی اشاعت کے راستے میں بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے کہ اگر دوسرے مسلمان بھی یہ کام کرنا چاہیں تو غیر مسلموں کے دلوں کو اسلام کے لئے مقفل پائیں گے۔"[1]

چنانچہ مولانا محترم نے ملت اسلامیہ کو اس جانب توجہ دلائی کہ وہ اسلامی تعلیمات کو سمجھیں، اسے عمل میں لائیں اور دوسروں تک اسے پہنچائیں۔ ایک صاحب ایمان شخص کے لئے صرف برطانوی اقتدار سے آزادی نہیں بلکہ ہر انسان کو انسان کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی غلامی تسلیم کرانے کی کوشش کرتا ہے۔

"تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ بہ حیثیت مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اس تحریک سے ہے جس کے لیڈر انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظام ... اور ایک خاص طریقۂ کار ہوتا ہے۔ اسلام کا طریقہ کار اور فکر وہ ہے جو ہم کو انبیا علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک، کسی زمانہ میں ہوں، اور ہمارے گرد و پیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے لئے مقصد و نصب العین وہی ہے جس پر انبیاء کرامؑ ہر زمانے میں چلتے رہے ہیں۔

اس مسلک کو اگر ہم چھوڑ کر کسی دوسرے مسلک کا نظریہ اور

---

[1] مولانا مودودیؒ، سیاسی کش مکش، حصہ سوم، ص ۱۰۴

طرزِ عمل اختیار کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے۔[1]

مولانا مودودیؒ نے اپنی تحریروں میں اس بات پر بھی پورا زور دیا کہ صرف اسلامی تعلیمات ہی ایسی ہیں جو تعمیرِ سیرت میں مغربی تعلیمات سے کہیں بہتر اور تعمیری ثابت ہو سکتی ہوں۔ اور انسانیت کو ہلاکت و تباہی سے بچا سکتی ہیں۔ ہماری جدید تعلیم یا مادی نقطۂ نظر کی حامل مغربی تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں کتابی علم پر جس قدر زور دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنا تعمیرِ سیرت پر نہیں دیا جاتا۔

"تشکیلِ سیرت کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی جائے محض کتابیں پڑھانے اور محض علوم و فنون سکھا دینے سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے ایک ایک نوجوان کے اندر اسلامی کردار پیدا ہو اسلامی طرزِ فکر اور اسلامی ذہنیت پیدا ہو۔ خواہ وہ سائنس داں ہو، خواہ علومِ عمران کا ماہر ہو، خواہ وہ ہماری سول سروس کے لئے تیار ہو رہا ہو، جو بھی ہو اس کے اندر اسلامی ذہنیت اور اسلامی کریکٹر ضرور ہونا چاہیے۔"[2]

تعلیم و تربیت کی اس خرابی نے مسلمانوں کو بے عمل، پست ہمت، بداخلاق بنایا، سیاسی زوال و انحطاط میں مبتلا ہوئے، ذرا ذرا سے مفادات کے لئے بِک جانے کی ذہنیت پیدا ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اسلامی سیرت و کردار پیدا نہ ہونے کے بارے میں جو کچھ کر لیا جائے وہ تھوڑا ہے۔

"تعلیم و تربیت کی خرابی اور قومی اضمحلال اور نظامِ اجتماع کے اختلال کا پہلا نتیجہ سیاسی زوال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ قومی اور اجتماعی مفاد کا تصور ان کے دماغوں سے نکل گیا۔

---

[1] ماہنامہ تجلی، خاص نمبر بحوالہ متین طارق باغپتی ، مولانا مودودی اور فکری انقلاب ص ۶۶

[2] دعوت سہ روزہ، تحریکِ اسلامی نمبر، ص ۲۰

انفرادیت اور خود غرضی ان پر پوری طرح سے مسلط ہو گئی۔ ان
میں ہزار و ہزار خائن اور غدار پیدا ہوئے جن کا ایمان کسی نہ
کسی قیمت پر خریدا جاسکتا تھا جو اپنے ذاتی مفاد کے لئے بڑے
سے بڑے قومی مفاد کو بے تکلف فروخت کر سکتے تھے۔ ان کے
سواد اعظم سے قومی غیرت اور خودداری اس طرح مٹ گئی کہ
دلوں میں اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ وہ غیروں کی غلامی
پر فخر کرنے لگے۔

دشمنوں کے بخشے ہوئے خطابات اور مناصب میں ان کو عزت
محسوس ہونے لگی۔ دین و ملت کے نام پر جب کبھی اپیل کی گئی تو
وہ پتھروں سے ٹکرا کر واپس آئی اور جب کبھی کوئی غیرت مند شخص
اقتدار قومی کے گرتے ہوئے قصر کو سنبھالنے کے لئے اٹھا۔ اس کا
سر خود اپنی قوم کے بہادروں نے کاٹ کر دشمنوں کے سامنے
پیش کر دیا۔[1]

اس کے برعکس نصاب تعلیم میں اسلامی اخلاق و اقدار کو سمویا جائے، حتیٰ کہ زبان و
تاریخ کے مضامین کے علاوہ ریاضی کے سوالات میں بھی مولانا محترم نیکی اور برائی کا
تصور ذہن نشین کرانے کی تلقین کرتے ہیں۔

" اسلام جن اخلاقی تصورات اور اخلاقی اقدار کو پیش کرتا ہے
انھیں ہر مضمون کے اسباق حتیٰ کہ حساب کے سوالات میں طرح طرح
سے بچوں کے ذہن نشین کیا جائے وہ چیزوں کو نیکی اور بھلائی
کی کسوٹی پر پرکھیں ان کی قدر ان کے لئے رغبت اور شوق بچوں
کے دل میں پیدا کیا جائے اور وہ جن کو برائی قرار دیتا ہے ان

---

[1] مولانا مودودیؒ، سیاسی کشمکش، حصہ اول ص ۱۲

کے ہر پہلو سے بچوں کے دل میں نفرت بٹھائی جائے۔[1]"

ملک اور بیرون ملک مولانا مودودی کی ان تحریروں نے ایک انقلاب برپا کر دیا ہزاروں افراد، علمار اور مفکرین ان کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور ان کے خیالات سے اتفاق ظاہر کرنے کے لئے ان کو بہت سے خطوط لکھے، دوسرے اخبارات اور رسائل سے ان کے مضامین نقل کئے۔ علمار اور مفکرین کی ایک خاصی تعداد نے سید مودودیؒ سے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ دعوت اسلامی کو عام کرنے کے لئے باقاعدہ ایک جماعت تشکیل دی جائے۔

تشکیل جماعت

اپنی اصلاحی سرگرمیوں کو پوری طرح جاری رکھنے کے لئے مولانا نے یہ محسوس کیا کہ ایک جماعت کی تشکیل ناگزیر ہے اس سلسلے میں نہ صرف مودودی صاحبؒ کے دوست واحباب بلکہ ہندوستان کے دیگر علمار و مفکرین بھی کافی عرصہ سے مصر تھے کہ وہ ایک جماعت کی باقاعدہ تشکیل دیں۔ چنانچہ یکم شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۵ر اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس موقع پر مختلف حلقوں کے نمائندے اور کچھ دوسرے حضرات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی دعوت پر جمع ہوئے ان شرکار اجتماع کی کل تعداد پچھتر ۷۵ تھی۔ گویا اجتماعی اسلامی تحریک کے طور پر یہ پہلا قدم تھا جس کی دعوت مولانا ایک عرصہ سے "ترجمان القرآن" کے ذریعہ سے دے رہے تھے۔ اس موقع پر مولانا نے فرمایا :-

"میرا کام آپ کو جماعت بنا دینے کے بعد پورا ہو جاتا ہے میں صرف ایک داعی تھا۔ بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کر رہا

---

[1] "دعوت" تحریک اسلامی نمبر، ص ۲۰

تھا اور میری تمام مساعی کی غایت یہ تھی کہ ایک ایسا نظام جماعت بن جائے۔ جماعت بن جانے کے بعد میں آپ میں کا ایک فرد ہوں۔ اب یہ جماعت کا کام ہے کہ اپنے میں سے کسی اہل تر آدمی کو اپنا امیر منتخب کرے۔ اور پھر یہ اس امیر کا کام ہے کہ آئندہ تحریک کو چلانے کے لئے اپنے صوابدید کے مطابق ایک پروگرام بنائے اور اسے عمل میں لائے۔"[1]

جماعت اسلامی کے قیام کے ساتھ ہی ایک تحریری دستور منظور ہوا اور اتفاق رائے سے مولانا مودودیؒ کو امیر جماعت منتخب کیا گیا۔ امیر جماعت کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے مودودی صاحبؒ نے ارشاد فرمایا:۔

"میں آپ کے درمیان نہ تو سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا نہ سب سے زیادہ متقی نہ کسی اور خصوصیت میں مجھے فضیلت حاصل تھی بہرحال آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے اس کار عظیم کا بار میرے اوپر رکھ دیا ہے تو میں اب اللہ سے دعا کرتا ہوں، اور آپ لوگ بھی دعا کریں کہ مجھے اس بار کو سنبھالنے کی قوت عطا فرمائے اور آپ کے اعتماد کو مایوسی میں تبدیل نہ ہونے دے۔"[2]

اجلاس کے تیسرے دن یعنی ۴ر شعبان کی شام کو امیر جماعت کی حیثیت سے دستور کے مطابق مولانا نے اصحاب شوریٰ کا انتخاب کیا اور دوسرے دن شوریٰ کے اجلاس میں جماعت کے کاموں کو متعدد شعبوں کے تحت منظم کیا گیا۔ جن میں خاص شعبہ جات حسب ذیل تھے۔

---

[1] روداد جماعت اسلامی: حصہ اول۔ مرکزی مکتبہ اسلامی، حیدر آباد، ص ۹

[2] " " " " " " ص ۱۹

۱۔ شعبہ علمی و تعلیمی :۔

اس شعبہ کا کام یہ طے پایا کہ اسلام کے نظام فکر اور نظام حیات کا اس کے مختلف فلسفیانہ اور علمی اور تاریخی پہلو میں گہرا تفصیلی مطالعہ کرے۔ دوسرے نظام فکر و عمل پر بھی وسیع تنقیدی و تحقیقی نظر ڈالے اور اس کے نتیجے میں ایسا لٹریچر تیار کرے جو صرف اسلامی اصولوں پر ذہنی و فکری انقلاب برپا کرنے والا ہو۔

۲۔ شعبہ نشر و اشاعت :۔

اس شعبہ کی ذمہ داری یہ قرار پائی کہ شعبہ علمی و تعلیمی جو لٹریچر تیار کرے وہ اس کو پھیلانے کا کام انجام دے گا اور سر دست یہ شعبہ مرکز میں امیر جماعت کی زیر نگرانی کام کرے گا۔

۳۔ شعبہ تنظیم جماعت :۔

اس شعبہ کے فرائض میں کارکنوں کو ہدایت دینا، مقامی جماعتوں کی نگرانی کرنا۔ جن مقامات پر جماعت نہ بنی ہو وہاں مقامی جماعت بنانے کی کوشش کرنا اور ہم خیال جماعتوں اور افراد سے ربط پیدا کرنا شامل کیا گیا۔

۴۔ شعبہ مالیات :۔

اس شعبہ کے تحت جماعت کے مرکزی بیت المال کا قیام اور اس طرح ہر مقامی جماعت کا اپنا بیت المال قائم کرنا ـــــ بیت المال کے لئے رقوم صاحب نصاب ارکان جماعت سے زکوٰۃ کی رقم اور صاحب استطاعت ارکان جماعت سے اعانت کی رقم طلب کر کے فراہم کرنا۔

۵۔ شعبہ دعوت و تبلیغ :۔

یہ شعبہ جماعت کا سب سے اہم شعبہ تسلیم کیا گیا اور یہ بات لازم قرار دی گئی کہ جو شخص بھی جماعت اسلامی کا رکن ہے وہ اس شعبہ کا بھی رکن ہوگا البتہ کوئی بھی رکن شعبہ دعوت و تبلیغ اپنی حسب استطاعت اس ذمہ داری کو پورا کرے گا۔

اس شعبہ کے دائرہ کار کے تحت آٹھ حلقوں کا تعین کیا گیا۔

۱۔ کالجوں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا حلقہ
۲۔ علماء اور مدارس عربیہ کا حلقہ
۳۔ صوفیاء اور مشائخ طریقت کا حلقہ
۴۔ سیاسی جماعتوں کا حلقہ
۵۔ شہری عوام کا حلقہ
۶۔ دیہاتی عوام کا حلقہ
۷۔ عورتوں کا حلقہ
۸۔ غیر مسلموں کا حلقہ[1]

دعوت اسلامی کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے ستر کار اجتماع سے کہا:

"ہمارے لئے چونکہ خود اسلام ہی تحریک ہے اور اسلام کی دعوت تمام انسانوں کے لئے ہے لہذا ہماری جماعت کسی خاص قوم یا کسی خاص ملک کے وقتی مسائل میں الجھی ہوئی نہیں ہے بلکہ پوری نوع انسانی اور سارے کرۂ زمین پر وسیع ہے۔ تمام انسانوں کے مسائل زندگی ہمارے

---

[1] روداد جماعت اسلامی، حصہ اول مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، حیدر آباد، ص ۲۶۔ ۲۷

مسائل زندگی ہیں اور اللہ کی کتاب و اس کے رسولؐ کی سنت سے ہم ان مسائل زندگی کا حل پیش کرتے ہیں جس میں سب کی فلاح اور سب کے لئے سعادت ہے۔“[1]

جماعت اسلامی جن مقاصد کے تحت وجود میں آئی تھی ان کے حصول کی کوشش شروع ہو گئی لیکن جیسے جیسے جماعت اسلامی کی عملی سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا تھا ویسے ویسے مختلف جانب سے اس کی مخالفت بھی بڑھ رہی تھی۔ یہ جماعت متحدہ قومیت کے علمبردار علما کے نزدیک معتوب تھی ہی دوسری جانب بہت سے مسلمان اس جماعت سے اس لئے ناراض تھے کہ پاکستان کے معاملے میں اس نے مسلم لیگ کا ساتھ نہ دے کر اس پر تنقید کی تھی۔

جماعت اسلامی نے ہر مخالفت سے بے پرواہ ہو کر اپنا کام جاری رکھا اور اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں کسی تساہل یا کمزوری سے کام نہ لیا۔

مولانا مودودیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

”دونوں اپنے اصل ہدف کو چھوڑ کر ہوا میں چوپائی تیر چلا رہے ہیں اگر ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہوّا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپریلزم کے جنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ تو دوسرے گروہ کے سر پر انگریز کا بھوت مسلط ہے اور وہ انگریز امپریلزم کے جال سے نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں ورنہ یہ دیکھتے کہ اہل شیطان نہ یہ ہے نہ وہ، اصلی شیطان غیر اللہ کی حاکمیت ہے۔ اس سے نجات نہ پائی تو کچھ نہ پایا، لڑنا ہے تو اس کو مٹانے کے لئے لڑو۔ جو تیر چلانا ہے تو اس ہدف کی طرف شست باندھ کر

---

[1] روداد جماعت اسلامی حصہ اول۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، حیدرآباد، ص ۲۶، ۲۷

تیز چلاؤ۔ جس قدر قوت صرف کرنی ہے اسے محو کرنے پر صرف کرو۔[1]

ان تمام مخالفتوں کے باوجود جماعت اسلامی دین کی دعوت کا کام برابر کرتی رہی۔ اس کام کے لئے اس نے اخبار و رسائل سے بھی کام لیا۔ ہر مقامی جماعت کی زیر نگرانی ہر ہفتہ ایک اجتماع ہوتا۔ ان اجتماعات میں درس قرآن، درس حدیث اور خطابات کے ذریعے دین کا جامع تصور پیش کیا جاتا اور اسلامی تعلیمات کی تشریح کی جاتی۔ اس کے علاوہ علاقائی اور ملکی سطح کے اجتماعات بھی منعقد ہوتے اور عوامی سطح پر لوگوں سے ربط پیدا کیا جاتا۔ اجتماعات کا مقصد واضح کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں :۔

"ہمارے ان اجتماعات کا مقصد کوئی مظاہرہ کرنا اور ہنگامہ برپا کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا نہیں ہے۔ ہماری غرض ان سے صرف یہ ہے کہ ہمارے ارکان ایک دوسرے سے متعارف اور مربوط ہوں۔ ان کے درمیان اجنبیت اور ناآشنائی باقی نہ رہے وہ ایک دوسرے سے قریب ہوں اور باہمی مشورہ سے تعاون کی صورتیں نکالیں اور اپنے کام کو آگے بڑھائیں اور مشکلات راہ اور پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کی تدبیر سوچیں۔"[2]

ہر مقامی جماعت کی نگرانی اس کا مقامی امیر کرتا، ہر رکن جماعت سے اس کی علمی تیاری، تزکیہ نفس، اصلاح معاشرہ اور دعوتی جدوجہد کے بارے میں مسلسل احتساب کا عمل ہوتا۔ اس سب کے علاوہ آس پاس کے لوگوں کی خدمت کرنے کی جانب بھی توجہ دلائی جاتی۔

غرض اس طرح ناسازگار حالات میں بھی جماعت اسلامی کا کام تیزی سے

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ سیاسی کشمکش، حصہ دوم، ص ۸،

[2] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ دعوت اسلامی، ص ۱۲

بڑھ رہا تھا اور جماعت کی دعوت کا تعلیم یافتہ نوجوانوں پر گہرا اثر مرتب ہو رہا تھا۔

"اس درمیان ہندوستان کے بحر سیاست میں بہت سے انقلاب آئے۔ مسلمانوں کو بھی ان زلزلوں سے سابقہ پڑا اور انگریز نے فرقہ پرستی کا جو بیج بویا تھا۔ ۴۷ء میں اس کے کاٹنے کا وقت بھی آ گیا۔ انگریز رخصت ہو رہا تھا اور یہاں کے باشندے ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے۔ فسادات کی آگ نے دلوں کی کوٹھری سے نکل کر پورے ملک کو گھیر لیا تھا۔ یہ شاید حکمراں طبقہ کی اپنے اقتدار کو بچانے کی آخری کوشش تھی مگر خون کی ندیاں بہا کر بھی اس میں تازگی نہیں آئی اور اسے (انگریز کو) اپنے ملک کو جانا پڑا۔ البتہ ہندو مسلمان دیر تک خون کی ندی میں بے یار و مددگار غوطے کھاتے رہے۔[1]"

۱۹۴۷ء کے بعد جماعت اسلامی

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں تقسیم ملک کی کارروائی عمل میں آئی۔ دنیا کے نقشہ پر ایک نیا ملک پاکستان وجود میں آیا۔ مسلم لیگ کی دو قومی نظریہ کی پالیسی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں دوسری کئی جماعتوں کی طرح جماعت اسلامی بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد انتظامی لحاظ سے جماعت اسلامی ہند کا جماعت اسلامی پاکستان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

جماعت اسلامی ہند نے اپنا ایک الگ انتظامی ڈھانچہ بنایا اور ارکان جماعت نے اتفاق رائے سے ۱۹۴۸ء میں منعقد ہونے والے اجتماع کے دوران مولانا ابواللیث

---

[1] متین طارق باغپتی، مولانا مودودی اور فکری انقلاب، مرکزی مکتبہ اسلامی ہند دہلی، ص ۴۷

صاحب ندوی کو امیر جماعت اسلامی ہند منتخب کیا۔ جماعت کے مرکزی دفاتر ملیح آباد (لکھنؤ) میں رکھے گئے بعدازاں یہ دفاتر ۱۹۴۹ء میں سابقہ روہیلہ ریاست رام پور میں منتقل ہو گئے۔ اس سلسلہ میں مولانا ماہرالقادری تحریر کرتے ہیں:

"جماعت اسلامی پاکستان کا ہندوستان کی جماعت اسلامی سے نظم ونسق وعمل کے اعتبار سے اب کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور ہندوستان میں جماعت اسلامی کے لئے ماحول سازگار نہیں ہے پھر بھی اللہ کے دین کے اشاعت جس جرأت کے ساتھ کی جارہی ہے اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔"[۱]

ملک کے بٹوارے کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ آہستہ آہستہ فسادات ختم ہوئے۔ بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر ہوئی اور جماعت کی سرگرمیوں میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اس وقت یہ محسوس کیا گیا کہ جماعت کا مرکزی دفتر ملک کے دارالحکومت میں ہونا چاہیے چنانچہ ۱۹۶۰ء میں جماعت کا مرکزی دفتر دہلی منتقل کر دیا گیا۔

تقسیم ملک سے پہلے باضابطہ ارکان جماعت کی کل تعداد چھ سو پچیس [۶۲۵] تھی۔ اب ہندوستانی جماعت کے باضابطہ ارکان کی تعداد صرف دو سو چالیس [۲۴۰] رہ گئی۔ جبکہ ہمدردان کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر چکی تھی۔ یہ تمام حضرات جماعت سے والہانہ تعلق رکھتے تھے اور اس کی سرگرمیوں میں سخت مخالفت کے باوجود حصہ لیتے رہے۔

امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث ندوی نے جماعت کے کام کی نئی تنظیم کے سلسلہ میں ملک کو کئی حلقوں میں تقسیم کیا۔ ہر حلقہ میں ایک قیم مقرر کیا۔ ہر قیم اپنے حلقہ میں جماعت کے کام کو آگے بڑھانے کا ذمہ دار تھا

---

[۱] تابش مہدی، جماعت اسلامی حقیقت کے آئینہ میں، ص ۲۵

اس وقت ہندوستان میں تقریباً ایک سو مقامات پر جماعتیں قائم تھیں۔ جماعت کے تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے پانے کے لئے مرکزی مجلس شوریٰ تشکیل ہوئی اور نئے حالات کے تحت جماعت کے دستور میں بہت سی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ مثلاً سابقہ دستور کے تحت جماعت اسلامی کا نصب العین حکومت الٰہیہ کا قیام تھا۔

"جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود دنیا میں حکومت الٰہیہ کے قیام اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔[1]"

"حکومت الٰہیہ کا قیام" عام لوگوں کو اس غلط فہمی میں ڈالتا تھا اور بعض لوگ قصداً اس کے ذریعہ یہ غلط فہمی پیدا کرتے تھے کہ جماعت اسلامی ایک غیر مسلم عوام کی اکثریت والے ملک میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔

چنانچہ مولانا مودودیؒ نے اس ذیل میں یہ وضاحت کی کہ ــــ

"ہماری دعوت کے متعلق عام طور پر جو بات کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم حکومت الٰہیہ کی دعوت دیتے ہیں۔ حکومت الٰہیہ کا لفظ کچھ تو خود غلط فہمی پیدا کرتا ہے اور کچھ اسے غلط فہمی پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے کہ حکومت الٰہیہ سے مراد محض ایک سیاسی نظام ہے اور ہماری غرض اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ موجودہ نظام کی جگہ وہ مخصوص سیاسی نظام قائم ہو۔ پھر چونکہ اس سیاسی نظام کے چلانے والے لامحالہ وہی مسلمان ہوں گے جو اس کے قیام کی تحریک میں حصہ

---

[1] مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم، ص ۱۷۲

لے رہے ہیں۔ اس لئے خود بخود اس تصور میں سے یہ معنیٰ نکل
آتے ہیں یا ہوشیاری کے ساتھ نکال لئے جاتے ہیں کہ ہم محض
حکومت چاہتے ہیں۔[1]

اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے جماعت اسلامی ہند نے نئے دستور کے تحت اس کی ہم معنیٰ اصطلاح "اقامت دین" کو اپنا نصب العین قرار دیا۔

"دفعہ چار[2]۔ جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامتِ دین
ہے جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا
حصول ہے۔[2]"

جماعت کا نیا دستور تمام ارکان جماعت کی منتخب کی ہوئی دستور ساز کمیٹی جو پچاس[2] افراد پر مشتمل تھی، کے ذریعہ مرتب کیا گیا اور اپریل ۱۹۵۶ء سے اس کا نفاذ عمل میں آیا۔ نیا دستور ۵۰ دفعات، ان کی بعض ذیلی دفعات اور عقیدہ و نصب العین کی تشریح کے ساتھ ترتیب پایا ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں۔

اول۔ عقیدہ، نصب العین اور طریق کار
دوم۔ جماعت کی رکنیت
سوم۔ نظام جماعت
چہارم۔ مالیات
پنجم۔ متفرقات[3]

جبکہ سابقہ دستور صرف گیارہ دفعات، چند ذیلی دفعات اور عقیدہ

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ دعوت اسلامی، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور، ص ۴۳۔۴۴

[2] دستور جماعت اسلامی ہند۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور، ص ۸

[3] دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور، ص ۸

نصب العین اور نظام جماعت کی تشریحات پر مشتمل تھا۔
دونوں دستوروں کے تحت جماعت کا عقیدہ یکساں ہے یعنی جماعت اسلامی کا بنیادی عقیدہ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے یعنی الٰہ صرف اللہ ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔[1]

جماعت اسلامی کا نصب العین

دستور کی دفعہ چار کے تحت جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامتِ دین ہے "جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے"۔[2]
اقامتِ دین کی تشریح دستور میں اس طرح کی گئی ہے۔

"اقامتِ دین میں لفظ دین سے مراد وہ دین ہے جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء کے ذریعہ مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے جس کو آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے اپنے آخری نبی حضرت محمدؐ کے ذریعے نازل فرمایا اور جو اب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عنداللہ مقبول دین ہے جس کا نام اسلام ہے۔"[3]

اس سلسلہ میں آگے تحریر ہے:
"اس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف

---

[1] دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رام پور ص ۲-۴
[2] دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رام پور ص ۸
[3] ایضاً ص ۹

سے یکسو ہو کر کی جائے اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء معاشرہ کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اس دین کے مطابق ہو۔[1]"

"اس دین کی اقامت کا مثالی اور بہترین عملی نمونہ وہ ہے جسے حضرت محمدؐ نے قائم فرمایا۔"[2]

دستور کی مذکورہ بالا دفعہ ۴ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی ہند کا کوئی محدود مقصد یا نصب العین نہیں ہے کہ جس کا تعلق صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے قومی مفادات سے ہو بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جماعت ایک عظیم انسانی نصب العین کی علم بردار ہے۔ اس سلسلہ میں جماعت اسلامی ہند کی طرف سے یہ وضاحت کی گئی ہے۔

"ہماری یہ جماعت جس غرض کے لئے اٹھی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں اور آغاز کار کے طور پر ملک میں ایک ایسی سوسائٹی منظم کی جائے جو اسلام کے سچے اور اصلی اصولوں پر شعور و اخلاص کے ساتھ خود عامل ہو۔ دنیا کے سامنے اپنے قول و عمل سے اس کی صحیح نمائندگی کرے اور بالآخر جہاں جہاں بھی اس کی طاقت بڑھ جائے وہاں کے افکار، اخلاق، تمدن، معاشرت، سیاست اور معیشت کے نظام کو موجودہ دہریت اور مادہ پرستی کی بنیادوں سے اکھاڑ کر سچی خدا پرستی یعنی توحید کی بنیادوں پر قائم کرے۔"[3]

---

[1] دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رام پور ص ۹، ۱۰

[2] ایضاً ص ۱۰

[3] مولانا مودودیؒ۔ دعوت اسلامی، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رام پور، ص ۹

آگے تحریر ہے :

"ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ جانتے ہیں اور اپنے اس علم پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے انسان کی رہنمائی کے لئے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی میں ہماری اور سب انسانوں کی فلاح مضمر ہے اور انسانی زندگی کا پورا نظام اس وقت صحیح چل سکتا ہے جبکہ اسے ان اصولوں پر قائم کیا جائے جو انسانوں کو خالق کی دی ہوئی اس ہدایت میں ملتے ہیں۔"[1]

اس کی مزید تشریح اس طرح کی گئی ہے :

"چنانچہ جماعت اسلامی نے اپنے ہدف کے حصول کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ تبلیغ واشاعت اور افہام و تفہیم کا طریقہ ہے۔ جبر و تشدد کا نہیں ہے۔ جماعت اپنے دستور کے مطابق اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابندی کرتی ہے اور کبھی ایسے ذریعہ کو استعمال نہیں کرتی ہے جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں۔

اس تبلیغ کے سلسلے میں ہم نے وہی طریقہ کار اپنے کارکنوں کو سکھانے کی کوشش کی ہے جو قرآن مجید میں تعلیم فرمایا گیا ہے یعنی یہ کہ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ خدا کے راستہ کی طرف دعوت دیں ـــــ غفلت اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کے ساتھ نفرت و کراہت کا برتاؤ کرنے کے بجائے ایک طبیب کی سی ہمدردی

---

[1] مولانا مودودیؒ دعوت اسلامی، ص ۱۰

خیر خواہی کے ساتھ ان کے علاج کی فکر کریں[۱]"

جماعت اسلامی اپنا کام آگے بڑھانے کے لئے پرامن طریقہ اختیار کرتی ہے اور اپنے ارکان کو ہدایت کرتی ہے :

"گالیوں اور پتھروں کے جواب میں دعائے خیر کرنا سیکھیں ظلم اور ایذا رسانی پر صبر کریں۔ جاہلوں سے بحثوں اور مناظروں اور نفسانی مجادلوں میں نہ الجھیں، لغو اور بے ہودہ باتوں سے عالی ظرف اور شریف لوگوں کی طرح درگذر کریں۔ جو لوگ حق سے مستغنی بنے ہوئے ہوں ان کے پیچھے پڑنے کے بجائے ان لوگوں کی طرف توجہ کریں۔ جن کے اندر کچھ طلب حق پائی جاتی ہو، خواہ وہ دنیوی اعتبار سے کتنے ہی ناقابل توجہ سمجھے جاتے ہوں[۲]"

جماعت اسلامی ہند کا یہ مقصد اور طریق کار دنیا کی تمام اسلامی تحریکوں میں مشترک ہے۔ تقریباً تمام اسلامی تحریکیں اس زمین پر دین کو قائم کرنے کے نصب العین کے تحت ہی وجود میں آئی ہیں۔

نظام جماعت

جماعت اسلامی ہند کا انتظامی ڈھانچہ شورائی نظام پر مبنی ہے یعنی جماعت کے سارے امور باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ مثلاً دستور کی ایک دفعہ سے واضح ہے :۔

"دفعہ ۱۰ــــ جماعت اسلامی ہند کا نظام شورائی ہوگا اور تنظیمی

---

[۱] مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۔ دعوت اسلامی ، ص ۱۸

[۲] " " " " " ص ۶۸، ۶۹

لحاظ سے مرکزی حلقہ وار اور مقامی نظاموں پر مشتمل ہوگا۔ نیز امیر جماعت حسب ضرورت دوسرے علاقائی نظام مجلس شوریٰ کے مشورے سے قائم کر سکتا ہے۔[1]"

ارکان جماعت اپنی خفیہ رائے (Secret Ballot) سے ایک مجلس نمائندگان کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں دستور میں تحریر ہے:۔

"دفعہ ۱۲۔ اس جماعت کی ایک مجلس نمائندگان ہوگی جو ارکان جماعت کے منتخب نمائندوں اور امیر جماعت اور قیم جماعت پر مشتمل ہوگی۔[2]"

مجلس نمائندگان کا اجلاس ہر چار سال بعد ہوتا ہے اور اس کے ارکان کثرت رائے سے امیر جماعت کا انتخاب کرتے ہیں:

"دفعہ ۲۲۔ جماعت اسلامی ہند کا ایک امیر ہوگا جس کی حیثیت "امیر المومنین" یہ اصطلاح معروف کی نہ ہوگی بلکہ صرف اس جماعت کے رہنما کی ہوگی۔ ارکان جماعت اس کی اطاعت فی المعروف کے پابند ہوں گے اور دفعہ ۲۴ الف:۔ امیر جماعت کا انتخاب مجلس نمائندگان کرے گی۔[3]"

امیر جماعت کو تعاون اور مشورہ دینے کے لئے مجلس نمائندگان ایک مجلس شوریٰ کا بھی انتخاب کرتی ہے:

"دفعہ ۳۰:۔ امیر جماعت کی امداد اور مشورے کے لئے ایک مجلس شوریٰ ہوگی جس سے امیر جماعت ان تمام اہم معاملات میں مشورہ

---

[1] دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رام پور ص ۱۸

[2] دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رام پور ص ۱۹

[3] دستور جماعت اسلامی ہند مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور ص ۲۴، ۲۵

ے گا جو مختلف فیہ ہو سکتے ہیں یا جن کا جماعت اسلامی کی پالیسی یا اس کے نظم پر قابل لحاظ اثر پڑتا ہو۔"[1]

"دفعہ ۳۱: اس مجلس کے کل ارکان کی تعداد پندرہ (۱۵) ہوگی۔ جن میں سے چودہ (۱۴) کا انتخاب مجلس نمائندگان اپنے میں سے کرے گی اور پندرھواں رکن قیم جماعت بہ حیثیت عہدہ ہوگا۔"[2]

قیم جماعت کا تقرر امیر جماعت مجلس شوریٰ کے ارکان کی رایوں کو مدنظر رکھ کر کرتا ہے:-

"دفعہ ۴۲:- جماعت اسلامی ہند کا ایک قیم ہوگا۔ جس کا تقرر امیر جماعت کرے گا۔ اس تقرر کے سلسلے میں امیر جماعت ارکان شوریٰ کی رایوں کو بھی سامنے رکھے گا۔"[3]

تنظیمی اعتبار سے پورے ملک کو متعدد حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر حلقہ کا ایک امیر ہوتا ہے۔ جس کا تقرر امیر جماعت اس حلقہ کے ارکان کی رایوں کے پیش نظر کرتا ہے۔ امیر حلقہ کی مدد اور مشورہ کے لئے حلقہ کی ایک مجلس مشاورت ہوتی ہے۔ جس کے ارکان کا انتخاب اس حلقہ کے ارکان جماعت کرتے ہیں۔

"دفعہ ۴۶ (ب): ہر تنظیمی حلقہ کا نظام، امیر حلقہ اور مجلس مشاورت پر مشتمل ہوگا۔"[4]

"دفعہ ۴۷ (الف):- ہر تنظیمی حلقے کے لئے ایک امیر ہوگا جس کا تقرر امیر جماعت ارکان حلقہ کے مشوروں کو سامنے رکھ کر

---

[1] دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور ص ۲۴ - ۲۵

[2] " " " " " " " ص ۲۹

[3] " " " " " " " ص ۳۳-۳۴

[4] " " " " " " " ص ۳۵

کرے گا۔"[1]

دفعہ ۴۹ (الف) :۔ ہر امیر حلقہ کے لئے ایک مجلس مشاورت ہوگی ۔
(ج) مجلس مشاورت کے ارکان کا انتخاب دو سال کے لئے
ہوگا۔"[2]

جس مقام پر ارکان جماعت کی تعداد ایک سے زیادہ ہوتی ہے ۔ وہاں مقامی جماعت قائم کردی جاتی ہے ۔ مقامی جماعت کا ایک امیر ہوتا ہے اور اس مقامی امیر کا تقرر امیر جماعت اسلامی ہند مقامی ارکان کے مشورہ سے کرتا ہے ۔

دفعہ ۵۳ :۔ جس مقام پر ایک سے زیادہ ارکانِ جماعت ہوں وہاں مقامی جماعت کا قیام عمل میں آئے گا ۔ لیکن کسی مقام پر ایک ہی رکن ہو تو وہ براہ راست اپنے حلقہ کے امیر سے متعلق ہوگا، اور اس کی ہدایت کے مطابق کام کرے گا۔"[3]

"دفعہ ۵۴ :۔ ہر مقامی جماعت کا ایک امیر ہوگا ۔ جس کا تقرر امیر جماعت مقامی ارکان کے مشوروں اور امیر حلقہ کی رائے کو سامنے رکھ کر کرے گا۔"[4]

جماعت اسلامی ہند کی مالی ضروریات اس کے ارکان، متفقین اور ہمدردوں کی مالی اعانتوں سے پوری ہوتی ہیں تمام ارکان جماعت زکوٰۃ اور عشر وغیرہ جماعت کے بیت المال میں جمع کرنے کے پابند ہوتے ہیں ۔

دفعہ ۶۰ :۔ ارکانِ جماعت اپنی زکوٰۃ اور عشر جماعت کے مقامی

---

[1] دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور، ص ۳۵
[2] " " " " " " " " ، ص ۳۶-۳۷
[3] " " " " " " " " ص ۳۹
[4] " " " " " " " " "

بیت المال میں داخل کریں گے۔[1]

اس کے علاوہ جماعت اسلامی کی آمدنی کے دو اور ذرائع مرکزی مکتبہ اور اوقاف ہیں۔

عملی سرگرمیاں

جماعت اسلامی ہند اپنی دعوت کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے مختلف قسم کی عملی سرگرمیاں اختیار کرتی ہے جو حسب ذیل ہیں :۔

انفرادی ربط و ملاقات :۔

جماعت اسلامی اپنے دعوتی امور میں اولیت اس بات کو دیتی ہے کہ انفرادی طور پر ربط و ملاقات کر کے عام لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچائے اس کے ارکان باہمی گفتگو کے ذریعے لوگوں کے مسائل اور ان کی الجھنیں سمجھیں اور جماعت کے تیار کردہ لٹریچر کا مطالعہ کرا کے انھیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔

اجتماعات اور خطاب عام :۔

جن لوگوں سے جماعت کے کارکن دعوتی ربط قائم کرتے ہیں ان کو رفتہ رفتہ اس بات کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ جماعت کے مقامی اجتماعات میں

---

[1] دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور ص ۴۲

شرکت کریں مقامی جماعت کے تحت ہر ہفتہ ایک اجتماع کیا جاتا ہے جس میں درسِ قرآن، درس حدیث اور کبھی کبھی اسلامی لٹریچر کے مطالعہ کے ذریعے اسلام کی دعوت پیش کی جاتی ہے اور حسب ضرورت ششماہی یا سالانہ خطاب عام کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے جس میں سارے لوگوں کو بلا امتیاز قوم و مذہب شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔

"عام اجتماعات مقامی، ضلعی، حلقہ اور مرکزی سطح پر پورے ملک میں برابر منعقد ہوا کرتے ہیں۔ اس (جماعت) کا وسیع لٹریچر ملک کے گوشے گوشے تک برابر پہنچ رہا ہے اخبار و رسائل خاصی بڑی تعداد میں اور مختلف زبانوں میں شائع ہو رہے ہیں اور اس (جماعت) کی (انفرادی) دعوتی جد و جہد اس کے کارکنوں کے روز مرہ کا وظیفۂ حیات ہے۔"[۱]

مولانا اصلاحی مزید تحریر کرتے ہیں :۔

"اور یہ سب کچھ صرف اس اہم ترین مقصد اور مدعا کے لئے ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے اندر اپنے دین کا علم پیدا ہو، وہ جان جائیں کہ اسلام کیا ہے اور ان سے کیا چاہتا ہے؟ ان کا دینی شعور بیدار اور ایمانی احساس زندہ ہو یہاں تک کہ ان کی زندگی وہ زندگی بن جائے جو رضائے الٰہی کی زندگی ہو۔"[۲]

دارالمطالعے :۔

اس کے علاوہ بہت سے مقامات پر جماعت اسلامی لائبریریاں اور

---

[۱] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ص ۲۱۰

[۲] " " " " " " ص ۲۱۰

دارالمطالعے بھی قائم کرتی ہے۔ ان سے لوگوں کو مطالعے کے لئے اسلامی لٹریچر بآسانی فراہم کیا جاتا ہے۔

اسلامی لٹریچر کی اشاعت :-

جماعت اسلامی نے دہلی میں ایک مرکزی مکتبہ بھی قائم کیا ہے۔ یہ مرکزی مکتبہ اُردو، ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی طباعت اور اشاعت کا اہتمام کرتا ہے۔ اس مکتبہ کی ملک کے اندر بہت سی شاخیں قائم ہیں۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی دیگر زبانوں مثلاً ہندی، انگریزی، مراٹھی، گجراتی تامل، تیلگو، ملیالم، کنڑی، بنگالی اور آسامی میں بھی اسلامی لٹریچر کے تراجم کا کام کرتی ہے۔ اس بات کی بھی پوری کوشش کی جارہی ہے کہ ہر علاقائی زبان میں موجودہ دینی لٹریچر کا جائزہ لیا جائے اور جس طرح ممکن ہو جلد از جلد ان زبانوں میں کم از کم قرآن پاک کا ترجمہ نیز سیرت نبوی اور بنیادی دینی تعلیم پر مشتمل لٹریچر شائع کرانے کا اہتمام کیا جائے۔

ابتدائی دینی تعلیم :-

تعلیمی سرگرمیوں میں ابتدائی دینی تعلیم کی توسیع کا مسئلہ جماعت کے نزدیک سرفہرست ہے اس سلسلہ میں جماعت کی حسب ذیل سرگرمیاں قابل توجہ ہیں :

۱۔ ہائی اسکول تک کی تعلیم کے لئے موزوں اسلامی نصاب کی تیاری' موزوں اسلامی نصاب کا مفہوم یہ ہے کہ مضامین کے انتخاب اور کتابوں کی تیاری میں مقصد تعلیم اور فن تعلیم کے صحیح اسلامی نقطہ نظر کو پوری وسعت اور گہرائی کے ساتھ سامنے رکھا گیا ہو۔ اس کے اندر دین و دنیا کی تفریق کے غیر فطری اور غیر اسلامی نظریہ سے پوری طرح اجتناب برتا گیا ہو۔ تاریخ، جغرافیہ، ادب، سائنس اور ریاضی وغیرہ

علوم کو بھی جنھیں عام طور سے خالص دنیوی اور دین سے یکسر غیر متعلق علوم
سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کی دی ہوئی بنیاد پر اور اسلام کی زبان میں
مرتب کیا گیا ہو تاکہ ان مضامین کی تعلیم و تدریس بھی طلبہ کے ذہن کو فکر و
نظر کا اسلامی انداز عطا کرتی رہے۔[1]

۲۔ ایک ایسی معیاری درس گاہ کا قیام جہاں مذکورہ بالا نصاب کے مطابق
مکمل تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام ہو تاکہ وہ ایک نمونہ کا کام دے سکے۔
یہ درس گاہ براہ راست تحریک کے مرکزی نظم کے تحت کافی دنوں سے رام پور
میں قائم ہے اس کے علاوہ بعض اور مقامات پر بھی اس طرز کی درسگاہیں
مقامی جماعتوں کے زیر انتظام مختلف سطحوں کی قائم کی گئی ہیں۔[2]

۳۔ مسلمانوں کو اس بات کی مسلسل ترغیب دینا کہ وہ بستی بستی اپنے آزاد
دینی مکاتب قائم کریں۔ جہاں اس نصاب تعلیم کے مطابق یا پھر اپنے
پسند کے کسی اور معیاری نصاب کے مطابق تعلیم و تربیت کا انتظام
ہو ــــ جماعت کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی کوششیں بار آور ثابت ہو
رہی ہیں۔ چنانچہ ان کے نتیجے میں اچھی خاصی بڑی تعداد میں مدارس کھل
گئے ہیں اور برابر کھلتے جا رہے ہیں۔[3]

۴۔ دینی تعلیم کی توسیع کا کام کرنے والی دوسری جماعتوں سے تعاون کرنا
تاکہ یہ اہم کام زیادہ سے زیادہ کامیابی کے ساتھ انجام پا سکے۔ اس ضمن کی
سب سے اہم اور نمایاں مثال، یہ ہے کہ اترپردیش کی "دینی تعلیمی کونسل
یا انجمن تعلیمات دین کے قیام میں اس (جماعت) نے بھرپور حصہ لیا اور

---

[1] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ص، ۲۰۴

[2] " " " " " ص ۲۰۵

[3] " " " " " ص ۲۰۵

ابتدا ہی سے اس میں شرکت اختیار کر رکھی ہے[1]

۵۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والے مسلمان طلبا کے لئے صباحی یا شبینہ دینی مکاتب قائم کرانے کی کوشش کرنا تاکہ ان کو دین کی ناگزیر معلومات سے واقف کرایا جا سکے اور اس طرح تعلیم گاہوں کے مضر اثرات کا بھی ایک حد تک تدارک ہو جایا کرے[2]

خواتین میں دعوتی کام

اسلام کی تعلیم مردوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی لازمی اور ضروری ہے چنانچہ جماعت نے ایک اسلامی جماعت ہونے کے باعث ابتدا ہی سے خواتین کو بھی جماعت میں شامل کر رکھا ہے۔ خواتین کے حلقوں میں بھی دینی دعوت کا اہتمام ہوتا ہے۔ جہاں کوئی رکن یا ہمدرد خاتون موجود ہو وہاں خواتین کا حلقہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ ان کے علیحدہ اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ جماعت کے لٹریچر میں بھی ایسا بہت سا لٹریچر ہے جس میں خاص طور پر خواتین کو مخاطب کیا گیا ہے اور انھیں ان کی دینی ذمہ داریوں سے واقف و آگاہ کر دیا گیا ہے۔

خواتین میں دعوتی کام کے سلسلہ میں کچھ اصول مرتب کئے گئے ہیں ان میں خاص خاص مندرجہ ذیل ہیں۔

---

[1] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی ص ۲۰۶

[2] ایضاً

۱۔ بنیادی طور پر خواتین کو دین سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنا حدیث اور فقہ کا ضروری مطالعہ اور ذاتی، گھریلو، خاندانی اور عام معاشرتی زندگی کے بارے میں دینی احکام سے واقفیت حاصل کرنے کو ضروری قرار دیا گیا۔

۲۔ دینی علوم کے مطابق عملی زندگی ڈھالنا اور اخلاق و سیرت کی اصلاح کرنا۔

۳۔ دینی تبلیغ و اصلاح پر زور دینا اور اس سلسلہ میں اپنے گھر کے لوگوں، بھائیوں اور بہنوں نیز قریبی رشتہ داروں کی طرف خصوصی توجہ دینا۔

۴۔ اپنے خالی اوقات میں حتی المقدور دوسری عورتوں تک علم دین پہنچانا۔

۵۔ تعلیم یافتہ مسلم خواتین پر ایک اہم ذمہ داری یہ ڈالی گئی ہے کہ وہ دور حاضر کی مغرب زدہ مسلم خواتین و عام عورتوں کو مغربی تہذیب کی گمراہی، بے حیائی ذہنی و اخلاقی آوارگی سے نکلنے میں ان کے ساتھ پورا تعاون کریں اور ان تمام غیر اسلامی شعائر کا مقابلہ کریں۔[۵]

جماعت اسلامی نے اپنے ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۰ء کے چار سالہ میقاتی پروگرام میں اپنے اہداف میں مردوں کے ساتھ خواتین کو بھی ترجیح دی ہے۔

چنانچہ پالیسی کی دفعہ دو کے تحت کہا گیا ہے:

"بیس ہزار مسلم مردوں سے اور دو ہزار مسلم خواتین سے ربط قائم کیا جائے گا تاکہ وہ اسلامی تعلیمات اور ہدایات سے واقف ہو جائیں۔"

پانچ سو طالبات سے ربط قائم کر کے دینی اصلاحی اور خدمت خلق کے

---

[۵] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، مولانا مودودی، کارکنان تحریک اسلامی کے لئے اہم ہدایتیں مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ص ۳۸ تا ۴۰

کام انجام دینے پر آمادہ کیا جائے گا۔ ضرورت اور گنجائش کے مطابق طالبات کے علیحدہ حلقے بھی قائم کئے جائیں گے۔

تین ہزار مسلم مردوں اور پانچ سو مسلم خواتین کو متفق بنانے کی کوشش کی جائے گی تاکہ وہ دینی، ملی، اصلاحی اور خدمت خلق کے کاموں میں تعاون کرنے اور اسلامی احکامات پر چلنے کے لئے آمادہ ہو جائیں [1]

غیر مسلموں میں دعوت اسلامی کا کام

ملک کی غیر مسلم آبادی بھی جماعت اسلامی کے اہداف میں شامل ہے اگرچہ غیر مسلموں میں جماعت کی جانب سے دعوت کا کام محدود پیمانے پر ہوا ہے پھر بھی ہندی اور بعض علاقائی زبانوں میں بہت سی کتابوں کے تراجم شائع ہو چکے ہیں اور بہت سے انصاف پسند غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کا کام بھی جاری ہے جبکہ غیر مسلم عوام گمراہ کن پروپیگنڈہ کے باعث مسلمانوں اور ان کی جماعتوں کی جانب سے شک وشبہ میں مبتلا رہتے ہیں پھر بھی جماعت اسلامی ان کی بدگمانیاں اور غلط فہمیاں دور کرنے اور اپنے حسن اخلاق اور بہتر طرز عمل سے جھوٹے اور غلط پروپیگنڈے کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ جماعت کی پالیسی و پروگرام کے درج ذیل الفاظ قابل غور ہیں:۔

"جماعت غیر مسلم بھائیوں میں اس طرح کام انجام دے گی کہ اسلام اور تحریک اسلامی کے بارے میں ان کی غلط فہمیاں اور

---

[1] پالیسی و پروگرام (اپریل ۱۹۸۶ء تا مارچ ۱۹۹۰ء) شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی ہند، حلقہ اتر پردیش

بدگمانیاں دور ہوں۔ وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات (توحید، رسالت، آخرت) اوران کے بنیادی تقاضوں سے واقف ہوجائیں اپنے خالق ومالک اور پروردگار کی خالص بندگی کی راہ ان پر واضح ہو جائے اور بھلائیوں کے پھیلانے اور برائیوں کے مٹانے میں وہ معاون بن سکیں۔" [۱]

جماعت اسلامی کا غیرمسلموں میں دعوت کے سلسلہ میں نقطۂ نظر اور اس کے کچھ اہم نکات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ جماعت کے مطابق مسلمانوں کے مخاطب اول ہونے کے معنی یہ کسی طرح نہیں ہیں کہ دوسرے بندگان خدا کے لئے اس تحریک کا خطاب ایک دن بھی مؤخر رہ سکے کیونکہ اس سلسلہ میں جہاں کچھ وجوہ کی بنا پر مسلم گروہ کو اوّلیت کا مقام حاصل ہے۔ وہیں غیرمسلموں کی بھی بعض ایسی مخصوص اہمیتیں ہیں۔ جن کے باعث انھیں ایک لمحہ کے لئے بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ [۲]

۲۔ جماعت کے اصول اس امر کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ ایک طرح سے اس تحریک کی بنیادی حیثیت اور نمایت مسلمانوں کو نہیں بلکہ غیرمسلموں ہی کو خطاب کرنے والی تحریک کی ہے یہ اس لئے کہ یہ تحریک اپنی اصل کے اعتبار سے وہی تحریک ہے جو دعوت قرآنی کی رہی ہے اور جس کی علم برداری ہمیشہ کے لئے امت مسلمہ کا واحد فریضہ قرار پاچکی ہے۔ قرآن حکیم میں مسلمانوں کا مشن اور مقصد وجود جو کچھ بھی بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ پوری نوع انسانی کے سامنے وہ دین حق کے شاہد اور نگراں ہوں گے۔ قرآن حکیم کے یہ "علی الناس" اور "للناس" کے الفاظ اس حقیقت کا صریح اعلان

---

[۱] پالیسی وپروگرام (اپریل ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۰ء) جماعت اسلامی ہند، دہلی

[۲] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند، مطبوعہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، ص ۶۳-۶۸

ہیں کہ امت مسلمہ رب العالمین کی طرف سے ایک خاص مشن پر مامور ہے اور اس کو پورے اہتمام کے ساتھ ایک خاص کام کے لئے وجود میں لایا گیا ہے یہ خاص ساری دنیا کے سامنے شہادت حق کا مشن ہے اور یہ کام پوری نوع انسانی کو خدا آگاہ اور پیرو حق بتانے کا کام ہے[1]

۳۔ خود اس تحریک کا اپنا مفاد بھی اسے ضروری قرار دیتا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر ملک اور ہر دور کی طرح اس ملک میں بھی کوئی اسلامی تحریک کامیابی کی منزل پر اس وقت پہنچ سکتی ہے جب یہاں کے باشندوں کی ایک معقول تعداد اس (تحریک) کی ہم نوا بن چکی ہو۔[2]

۴۔ جماعت کے مطابق بھائی چارگی کے اس مضبوط رشتے کے حقوق کا پاس ولحاظ اس لئے ہے جو ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کے باعث سارے ہی بنی آدم کے درمیان فطری طور پر موجود ہے اور جو زبان، رنگ، نسل، وطن اور افکار و عقائد کے ہزار اختلافات کے باوجود بہرحال موجود رہتا ہے۔ یہی رشتہ وہ سرچشمہ ہے جس سے ایک انسان کے اندر دوسرے کے لئے محبت اور خیر خواہی کے فطری جذبات پیدا ہوتے ہیں جب تک کسی انسان کی انسانیت بالکل ہی نہ مرجائے۔ وہ ان جذبات اخوت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے تحریک اسلامی کے علم برداروں کے لئے اپنے اندر ان اعلیٰ جذبات کی پرورش اور ان کے عملی تقاضوں کی انجام دہی بہرحال ضروری ہے (اور اس لئے) اسلام کے نزدیک اور تحریک اسلامی کے نزدیک بھی یہ اور صرف یہ (ضروری) ہے کہ افراد انسانی کو آخرت کی ابدی ناکامی سے بچایا جائے۔

---

[1] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند مطبوعہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، ص ۶۳۔ ۶۸

[2] ایضاً، ص ۶۳-۶۸

"(چنانچہ) یہی ہیں وہ اسباب جو دعوت و تحریک اسلامی کے لئے ضروری قرار دیئے ہیں کہ غیر مسلم افرادِ انسانی کو بھی وہ اپنا مخاطب بنائے، انھیں اپنی دعوت پہنچائے اور اس بارے میں کسی بے پروائی، کسی کم کوشی اور مصلحت اندیشی سے ہرگز کام نہ لے۔" ؎

لہٰذا جماعت کے کل ہند اجتماع منعقدہ اپریل ۱۹۵۱ء کے موقع پر امیر جماعت نے غیر مسلموں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اسلام جیسا کہ میں پہلے تشریح کر چکا ہوں، مسلمانوں کا کوئی مخصوص مذہب نہیں ہے بلکہ وہ آپ کا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ مسلمانوں کا ہے اگر مسلمان اس کو اپنا مخصوص مذہب سمجھتے ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے اور اس غلطی کی وجہ سے اس پر آپ کا حق ساقط نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر دنیا میں کسی مشترک چیز پر کسی ایک فریق کے قبضہ کو آپ برداشت نہیں کر سکتے ہیں تو دین تو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی اور گراں چیز ہے تو اس پر صبر کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔ ہماری کم سے کم آپ سے یہ خواہش ہے کہ دین و دھرم کے نام سے آپ کے پاس جو کچھ بھی سرمایہ ہے اس کو آپ اپنے معاشرے اور نظامِ سیاست و حکومت کی بنیاد بنا کر اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات کو درست کرنے کی کوشش کریں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے دلوں میں مسلمانوں سے جو بیگانگی پیدا ہو گئی ہے اس کی وجہ سے آپ اسلام یا قرآن کے نام سننے کے روادار نہ ہوں۔ لیکن اگر آپ نفس مذہب اور خدا کے تصور سے متنفر نہ ہو گئے ہوں تو آپ

؎ صدر الدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند، ص ۶۳-۶۸

کو مذہب کے ان بنیادی تصورات یعنی خدا پرستی اور محاسبۂ اعمال و رسالت سے نفرت کرنے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔[1]

خدمتِ خلق

جماعت اسلامی دین کا ایک وسیع تصور رکھنے کے باعث خدمت خلق کے بہت سے کام کرتی ہے وہ اپنے ارکان کو بھی ہدایت کرتی ہے کہ پڑوس کے معذور حاجت مندوں کی طرف خصوصی توجہ دے جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ عمومی کاموں کے علاوہ جماعت نے ملک کے مختلف مقامات پر طبی مراکز قائم کئے ہیں جہاں سے غریب لوگوں کو دوائیں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ زلزلہ، سیلاب اور آتش زدگی جیسی ناگہانی آفات کے موقع پر جماعت بڑے پیمانے پر امدادی کام کرتی ہے۔ ارکان جماعت بلا امتیاز مذہب و قوم تمام حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔

چنانچہ جماعت نے یو، پی، بہار، بنگال، پونا اور کیرالہ وغیرہ مقامات پر سیلاب کے موقع پر امداد اور آباد کاری کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیا ہے۔[2]

۶۷ء میں خشک سالی کے سبب بہار، مشرقی یو پی اور مدھیہ پردیش کے بہت سے علاقے جب قحط سے دوچار ہوئے تو جماعت اسلامی نے خدمت خلق کے جذبے سے پورے ملک میں امداد و تعاون کی مہم چلاکر لاکھوں روپیہ نقد اور بڑی تعداد میں کپڑے، غلہ اور دوائیاں وغیرہ جمع کیں۔ چندہ دینے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی تھے۔ اس رقم کے ذریعہ ان تمام متاثرہ علاقوں میں امدادی کیمپ لگاکر بلا تفریق مذہب و قوم سب کی مدد کی گئی۔[3]

---

[1] مولانا ابو اللیث اصلاحیؒ۔ جماعت اسلامی، اس کا مقصد اور طریقہ کار، ص ۶۸ تا ۷۰

[2] مرکزی مکتبہ اسلامی ہند، دہلی۔ جماعت اسلامی ہند ایک تعارف، ص ۴۵

[3] جماعت اسلامی ہند ایک تعارف، ص ۴۵

فرقہ وارانہ فساد کے موقع پر گذشتہ کئی برسوں سے جماعت اسلامی نے متاثرہ مظلوموں کی امداد اور بھلائی کا کام شروع کر رکھا ہے۔ یو پی، بہار مدھیہ پردیش اور گجرات وغیرہ میں بہت سے چھوٹے بڑے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ جماعت نے عام چندہ کے ذریعہ نقد اور اشیاء صرف فراہم کر کے ریلیف کا کام کیا ہے[1]

خدمت خلق کے تحت ان سارے امور کی انجام دہی جماعت کی پالیسی کا ایک حصہ ہے :-

"جماعت بلا لحاظ مذہب و ملت مریضوں، معذوروں اور ضرورت مندوں کو حسب ضرورت سہارا دینے اور مصیبت زدہ اور مظلوموں کو امداد پہنچانے کا اہتمام کرے گی۔"[2]

ان سب کے علاوہ جماعت نے اپنے چار سالہ میقاتی پروگرام میں ان امور کو بھی شامل کیا ہے حسب وسعت و ضرورت درج ذیل کام انجام دینے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۔ مفت طبی امداد کے پندرہ[15]، بلا سودی اسکیم کے دس[10] اور گھریلو صنعتوں کے چار[4] مقامات پر مراکز قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۲۔ حجاج کی خدمت کے لئے جو کمیٹیاں قائم ہیں انھیں اور بہتر خدمت انجام دینے کے قابل بنایا جائے گا اور حسب سہولت مزید کمیٹیاں بھی قائم کر کے خدمت انجام دینے کی کوشش کی جائے گی۔

۳۔ حکومت کی جانب سے بڑھاپا پنشن دلانے کے معاملہ میں لوگوں کے ساتھ تعاون کیا جائے گا۔[3]

---

[1] جماعت اسلامی ہند ایک تعارف، ص ۴۵، ۴۶

[2] پالیسی اور پروگرام میقات ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۰ء ص ۵

[3] پالیسی اور پروگرام میقات ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۰ء ص ۷، ۸

چند اہم امور میں جماعت اسلامی کا موقف

جماعت اسلامی ہند ایک ہمہ گیر نظام زندگی کی دعویدار ہونے کی حیثیت سے ملک وملت کے اہم معاملات کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر کی حامل جماعت ہے اور وہ ان سارے امور اور معاملات سے متعلق اپنے نظریہ اور پالیسی کا اظہار کرتی رہی ہے۔

چنانچہ جمہوریت، سیکولزم، نیشنلزم، وطن پرستی، قومی یک جہتی، معاشی تعمیر وترقی، سیاست اور انتخابات وغیرہ کے سلسلہ میں جماعت اسلامی نے اپنے نظریہ کا کھل کر اظہار کیا اور اس کے مطابق اپنی پالیسی مرتب کی ہے۔

جمہوریت :-

اس کا منشا یہ ہے کہ کسی ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک طبقہ کا لاکھوں کروڑوں انسانوں پر اپنی مرضی مسلط کر دینے اور اپنی اغراض کے لئے استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ ہر علاقہ کے باشندوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے حکومت کا نظم و نسق چلائیں۔ اس نظریہ نے ترقی کر کے جمہوریت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس نظام میں لوگوں کی مجموعی خواہش قابل اعتبار ہے پوری قوم یا اس کی اکثریت کی خواہش جس اصول کو صحیح کہہ دے وہ صحیح ہے اور جن اصولوں کو قوم کی رائے عامہ رَد کر دے وہ باطل ہیں۔ جمہور اپنا حق حکـ[illegible]ـت اپنی آزاد مرضی

سے اپنے منتخب نمائندوں کے سپرد کر دیتے ہیں جو ان کی
طرف سے اور ان کی منشا کے مطابق ملک کے لئے قانون بناتے
اور اس کا نفاذ کرتے ہیں۔

اس ذیل میں مولانا صدر الدین اصلاحی تحریر کرتے ہیں:۔

"اسلام کے سیاسی اصولوں کے تحت کسی فرد یا گروہ کو دوسرے
انسانوں پر اپنی منشا کے نفاذ یا حکم چلانے کا حق نہیں ہے۔
اسلام کے سیاسی نظام میں حاکمیت کا حق صرف اللہ کو حاصل
ہے یعنی یہ کہ پوری انسانی زندگی کا حقیقی حاکم اور مقتدرِ اعلیٰ
اللہ تعالیٰ ہے۔ کیونکہ نوعِ انسانی جس کائنات کا ایک جزء ہے
اس کا خالق اور رب اللہ ہی ہے اس لئے اس کائنات کا
اور اس نوع انسانی کا مالک اور حاکم بھی فی الواقع وہی ہے
اور حاکمیت کا حق اور اقتدار اعلیٰ اس کے لئے مخصوص ہے
وہی ہے جو اصلاً اسے (انسان کو) اس کی زندگی کا نظام دے
سکتا ہے اور آئین و قانون بنا سکتا ہے دوسرا کوئی بھی اسے
بطور خود حکم دینے کا مجاز نہیں۔ دوسرا کوئی بھی حقیقی فرمانروا
اور قانون ساز نہیں، دوسرا کوئی بھی اس کا مطاع مطلق نہیں۔"[1]

چنانچہ جماعت اسلامی ہند ایک اسلامی جماعت ہونے کی حیثیت سے جہاں ایک
طرف استبداد، آمریت اور کلیت پسندی کو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے
خلاف سمجھتی ہے وہیں جماعت کسی انسان یا کسی انسانی گروہ کو دوسرے انسانوں
پر اپنی حاکمیت مسلط کرنے کا حق نہیں دیتی ہے۔

مولانا اصلاحی مزید فرماتے ہیں:۔

---

[1] صدر الدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند، ص ۱۳۵ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی ہند دہلی

"موجودہ نظام جمہوریت کو اسلام کے صرف سیاسی نظام ہی کی
نہیں بلکہ تقریباً اس کے پورے نظام زندگی کی ضد بنا کر رکھ دیتا
ہے پھر اس امر واقعی کے پیش نظر تو یہ تضاد اپنی انتہا کو پہنچ جاتا
ہے کہ جمہوریت کے ان سیاسی اصول و نظریات کی بنیاد پر قائم
ہونے والی اسٹیٹ اب اپنے عمل و دخل کا دائرہ اتنا وسیع
کرتی جارہی ہے کہ انسانی زندگی کے تریب قریب سبھی شعبے اس
کی گرفت میں آچکے ہیں۔ حد یہ کہ وہ عقائد و عبادات تک پر
بھی اپنی پرچھائیاں ڈال دینے کے درپے ہے۔ ایسی حالت
میں تحریک اسلامی کے لئے اصولی، اخلاقی اور دینی ہر حیثیت
سے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ وہ اس نظام سے
سازگاری کر سکے ـــــ اس کا اقامت دین کا نصب العین
رکھنے والی تحریک ہونا تو اس بات کو لازم ٹھہراتا ہے کہ وہ موجودہ
نظام (جمہوریت) کو یکسر غلط اور خلاف حق سمجھے"[1]

لیکن اس سب کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ جماعت اسلامی روح جمہوریت ہی کے
خلاف ہے بلکہ وہ کہتی ہے کہ ـــــ

"اسلامی نظام کی بنیاد اللہ کی حاکمیت اور اس کی قانون سازی
کے بعد عوام کی خلافت پر ہے یعنی اجتماعی نظام عوام کی مرضی
سے ان کے حسب منشا بنے گا۔ عوام کے منتخب نمائندے
ہی ان کے حکمراں ہوں گے، اللہ کے دین کے تحت قانون سازی
عوام کے نمائندے ہی کریں گے اور وہ اللہ کے ساتھ عوام کے
سامنے بھی جواب دہ ہوں گے اس طرح اسلام میں آمریت و

---

[1] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند۔ مطبوعہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ص ۱۴۱

فسطائیت کے بجائے جمہوریت ہے مگر یہ جمہوریت مطلق العنان اور لادین و بے اخلاق جمہوریت نہیں بلکہ دین و اخلاق کی پابند جمہوریت ہے۔"[1]

جماعت اسلامی نے اس سلسلہ میں اپنی دعوت کے تحت مزید وضاحت کی ہے:۔

"ہم جمہوری حاکمیت کے بجائے جمہوری خلافت کے قائل ہیں۔ شخصی بادشاہی، امیروں کے اقتدار اور طبقوں کی اجارہ داری کے ہم بھی اتنے ہی مخالف ہیں جتنا موجودہ زمانہ کا کوئی بڑے سے بڑا جمہوریت پرست ہو سکتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کے یکساں حقوق، مساویانہ حیثیت اور کھلے مواقع پر ہمیں بھی اتنا ہی اصرار ہے جتنا مغربی جمہوریت کے بڑے سے بڑے حامی کو ہو سکتا ہے۔ ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ حکومت کا انتظام اور حکمرانوں کا انتخاب تمام باشندوں کی آزادانہ مرضی اور رائے سے ہونا چاہیئے۔ دراصل ہمیں اس نوخیز جمہوریت سے جس چیز میں اختلاف اور نہایت سخت اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ وہ جمہور کی مطلق العنان بادشاہی کا اصول پیش کرتی ہے۔"[2]

سیکولرازم :۔

سیکولرازم کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر دیا جائے۔ اس لفظ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ حکومت تمام انسانوں کو یکساں حقوق دے اور فرقہ، نسل، ذات،

---

[1] شعبۂ تنظیم، جماعت اسلامی کیا ہے اور کیا نہیں، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی۔ دہلی، ص ۲۱

[2] جماعت اسلامی کیا ہے اور کیا نہیں، مطبوعہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ دہلی ص ۲۳

زبان اور مذہب کی بنیاد پر ان میں کوئی تفریق روا نہ رکھے۔[1]

جماعت اسلامی نے سیکولرزم کے اس دوسرے مفہوم کو ہی اختیار کیا ہے مولانا صدرالدین اصلاحی رقمطراز ہیں :۔

"(چنانچہ سیکولر نظام حکومت میں) عوام کے منتخب نمائندے آئین و قانون بنانے میں کسی مذہب اور خدائی ہدایت کو بنیاد اور سند تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس بارے میں تمام تر اپنی عقلی اور اپنی صوابدید کو سامنے رکھتے ہیں ۔ اور ضروری ہے کہ ایسا ہی کریں یعنی مذہب کو کم از کم سیاسی اور اجتماعی معاملات سے قطعاً باہر رکھیں ـــــ اور ـــــ جہاں تک مختلف مذاہب کے ساتھ حکومت کے طرز عمل کا تعلق ہے اصولی طور پر وہ ان کے بارے میں غیر جانب دار رہے گی اور اکثریتی مذہب یا اقلیتی مذہب کی اصطلاح میں نہ سوچنے کی پابندی ہے ۔ اسے سب کے ساتھ یکساں سلوک اور سب کا یکساں احترام کرنا ہے۔"[2]

اس کی وضاحت جماعت اسلامی نے ان الفاظ میں کی ہے :۔

"اس کے ساتھ ہی سیکولرزم کے ایک اور معنی بھی اخذ کئے جاتے ہیں اس سے آگے بڑھ کر روس اور دوسرے اشتراکی ملکوں میں سیکولرزم کا جارحانہ مفہوم اختیار کیا گیا ہے اور اسے صریحی الحاد کا ہم معنی قرار دے کر مذہب کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا اور انسانی زندگی سے مذہب کے اثرات کو کھرچ کر پھینک دینا ریاستی پالیسی کا ایک جزء بن گیا ہے لیکن ہندوستانی

---

[1] جماعت اسلامی ہند کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ص ۲۰

[2] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند ص ۱۳۶ ، ۱۳۷

میں سیکولرزم کے یہ معنی نہیں ہیں اور اسے ایک سیکولر ملک اس مفہوم میں کہا جاتا ہے کہ اس کا دستور مختلف مذاہب اور ان کے پیرووں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا۔ دستور ہند کی روح سے مختلف مذاہب کے پیرووں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی یکساں آزادی ہے اور حکومت کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہے۔"[1]

جماعت اسلامی سیکولرزم کو غیر جانب داری اور مذہبی رواداری کے علاوہ سارے معنی میں مسترد کرتی ہے۔

"جماعت اسلامی ہند کے نزدیک یہ وسیع تر مفہوم جو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی سے ہدایت الٰہی کی بے دخلی کے اور الحاد کے ہم معنی ہے (یعنی سیکولرزم کے وہ معنی جو بے دینی کے تصور سے ہم آہنگ ہوں) اسلام کے عین ضد ہونے کے ساتھ ہندوستان کے باشندوں اور یہاں کی روحانی اور اخلاقی اقدار کے لئے بھی اجنبی ہے اور ہر وہ کوشش قابل مذمت و مخالفت ہے جو سیکولرزم کے اس مفہوم کو ہندوستان کی روحانی اور اخلاقی قدروں اور اس ملک کے طرز حکمرانی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرے۔ لیکن سیکولرزم کا یہ مطلب لیا جائے جیسا کہ بعض حلقوں کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حکومتی کاروبار میں کسی مذہبی فرقہ کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کیا جائے اور سب کے ساتھ بلا امتیاز مذہب و ملت یکساں برتاؤ ہو اور سب کو یکساں مواقع حاصل رہیں تو جماعت نے اس تخیل کی کبھی مخالفت نہیں کی ہے۔"[2]

---

[1] جماعت اسلامی ہند کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ص ۲۱، ۲۲
[2] " " " " " " " ص ۲۰ تا ۲۲

اس سلسلہ میں مزید تحریر کیا گیا ہے :-

"جماعت اسلامی ہند انسانوں کو اسلام کی دعوت دینے والی جماعت ہے۔ اسے اس بات پر پورا بھروسہ ہے کہ اگر دستور ہند کی مذکورہ بالا خصوصیات قائم رہیں اور باشندگان ملک کے سامنے ان کے پروردگار کی بھیجی ہوئی ہدایت اس طرح پیش کی جائے جیسا کہ اس کا حق ہے اور اسلام کی دعوت دینے والے اپنی سیرت و کردار سے بھی اسلام کا نمونہ پیش کریں تو یہاں جو لوگ پہلے سے مسلمان ہیں وہ سچے مسلمان بن کر اسلامی زندگی کا بڑے پیمانے پر مظاہرہ کریں گے اور جنھوں نے حق کو اب تک نہیں پہچانا ہے وہ بھی اسے پہچان لیں گے اور اسے قبول کر کے خدا کے فرماں بردار بندے بن جائیں گے۔ اس وجہ سے موجودہ صورت حال میں جماعت اسلامی یہ چاہتی ہے کہ دوسرے کلیت پسندانہ اور فسطائی طرز حکومت کے مقابلہ میں ہندوستان کا مذکورہ بالا سیکولر جمہوری طرز حکومت برقرار رہے"[1]

وطن پرستی اور قوم پرستی :-

اسلام ساری پرستیوں کو ٹھکرا کر صرف خدا پرستی کی دعوت دیتا ہے اسلامی تعلیمات کے تحت تمام انسان بلا امتیاز، رنگ و نسل، فرقہ اور قبیلہ ایک اللہ کے بندے اور ایک ماں اور باپ کی اولاد ہیں۔

چنانچہ اس معاملے میں جماعت اسلامی کا بھی یہی موقف ہے اور وہ اس کا واضح الفاظ میں اظہار کرتی ہے :

---

[1] جماعت اسلامی ہند کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی ص ۲۲

"ہم قوم پرستی اور وطن پرستی سے بھی اپنے کو بالا رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ہمیں قوم یا وطن سے نفرت ہے نفرت کیا معنی، حقیقتاً ہمیں ان سے حقیقی انس اور محبت ہے۔ جس وطن میں ہم پیدا ہوئے اور جس کے آب وگل سے ہمارا ڈھانچہ بنا اور جس قوم میں ہماری پیدائش ہوئی اور جس سے ہم نے طرح طرح کے فائدے اٹھائے۔ ان کے حقوق کو ہم کسی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتے ـــــ لیکن پھر بھی ہم اپنے کو قوم پرستی اور وطن پرستی سے بالاتر رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ ساری پرستیاں ہمارے اصولوں کے خلاف ہیں اور ہمارے نزدیک قوم و وطن دونوں کا حقیقی فائدہ اس میں ہے کہ ہم ان کو اپنے خدا پرستانہ اصولوں پر چلنے کی دعوت دیں۔ جس کی حیثیت ہماری نگاہ میں یہ ہے کہ قوم وملک کا حقیقی مفاد و مصالح ان سے ٹکرانے میں نہیں ہے بلکہ یہ اصول ان کو اور زیادہ پورا کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اس بنا پر ہم نے اب تک اپنے کو قومی اور وطنی تعلیمات سے ہر طرح علیحدہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔"[1]

مولانا ابو اللیث صاحبؒ کے الفاظ میں اس کی مزید تشریح اس طرح کی گئی ہے :-

"اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک دین یعنی ضابطۂ حیات ہے جس کی بنیاد فطری اصولوں پر قائم ہے اور ان اصولوں کا کوئی تعلق قومیت اور وطنیت سے نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ساری پرستیاں خدا پرستی کے منافی ہیں اور ہمارے خیال کے

---

[1] مولانا ابو اللیث اصلاحی، جماعت اسلامی اس کا مقصد اور طریق کار، ص ۴۶، ۴۷

مطابق یہ شیطان کی پھیلائی ہوئی لعنتوں میں سے دو بڑی لعنتیں ہیں جن میں اس وقت دنیا کی قومیں مبتلا ہیں اور جنھوں نے ان کے دین و اخلاق کے ساتھ ان کی دنیا کو بھی تباہ کر کے رکھ دیا ہے[۱]

سیاست اور انتخاب :۔

جماعت اسلامی ہند ملک کی موجودہ سیاست سے اپنے آپ کو الگ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ جبکہ وہ اصولی طور پر سیاست اور انتخابات کے خلاف نہیں ہے لیکن موجودہ سیاست کی نظریاتی بنیادوں اور اسلام کے بنیادی سیاسی تصورات میں ایک نمایاں فرق ہونے کے باعث جماعت موجودہ سیاست اور اس میں شرکت کو غلط اور خلاف حق سمجھتی ہے اور صرف سمجھتی ہی نہیں بلکہ اس کا برملا اظہار بھی کرتی ہے :۔

"موجودہ نظام سیاست و اجتماع اور اسلامی نظام، دونوں کے بنیادی اصول و تصورات کو بالمقابل رکھ کر دیکھئے تو صاف نظر آئے گا کہ ان میں مشرق اور مغرب کی دوری اور واضح تضاد ہے۔ جو موجودہ نظام جمہوریت کو اسلام کے صرف سیاسی نظام کے ہی نہیں بلکہ اس کے پورے ہی نظام زندگی کی ضد بنا کر رکھ دیتا ہے پھر ـــــــ ان سیاسی اصول و نظریات کی بنیاد پر قائم ہونے والی اسٹیٹ اب اپنے عمل و دخل کا دائرہ اتنا وسیع کرتی جا رہی ہے کہ انسانی زندگی کے قریب قریب سبھی شعبے اس کی گرفت میں آچکے ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ عقائد و عبادات تک پر بھی اپنی پرچھائیاں ڈال دینے کے درپے ہے ایسی حالت میں تحریک اسلامی کے

---

[۱] مولانا ابو اللیث اصلاحی، جماعت اسلامی اس کا مقصد اور طریق کار ص ۴۴

لئے اصولی، اخلاقی اور دینی ہر حیثیت سے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ وہ اس نظام سے سازگاری کر سکے اور اسے گوارا کرنے پر آمادہ ہو سکے ــــ اس کا اقامت دین کا نصب العین رکھنے والی تحریک ہونا تو اس بات کو لازم ہے کہ وہ موجودہ نظام (سیاست) کو یکسر غلط اور خلاف حق سمجھے۔" [1]

لیکن جماعت اسلامی نے ملکی انتخابات میں اپنی شرکت بالکل ممنوع قرار نہیں دی ہے الیکشن میں شریک ہو سکتی ہے البتہ :ـــ

"اور جب کبھی وہ ان میں شرکت کرے گی تو اس (موجودہ) نظام کو نظام اسلامی سے بدل ڈالنے یا اس کے لئے راستہ ہموار کرنے کی غرض سے کرے گی۔" [2]

اس لئے جماعت کے مطابق دین سے سیاست کی علیحدگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اور ایک نہیں متعدد دینی حقائق اس نظریہ کو (دین سے سیاست کا کوئی تعلق نہیں) کھلی ہوئی بے دینی اور گمراہی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً اللہ، دین اور خدا پرستی کے جو تصورات قرآن حکیم نے دئے ہیں وہ اس چیز کو بھی جسے سیاست کہتے ہیں دین کا جز و لازم ٹھہراتے ہیں۔ اس طرح قرآن و سنت کے احکام میں سیاسی احکام بھی اسی اہمیت اور اسی تاکید کے ساتھ موجود ہیں۔ جس طرح نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج وغیرہ کے احکام موجود ہیں۔ [3]

ملی اور ملکی مسائل :ـ

دعوت اسلامی کے قبول عام ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہندوستان

---

[1] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند ص ۱۴۱

[2] " " " " ص ۱۴۷

[3] " " " " ص ۱۴۶

میں مسلمان فکر و عمل دونوں اعتبار سے اسلام کا نمونہ بن جائیں۔ اسلامی تعلیمات کو اپنالیں اور باہمی معاملات، معاشرتی زندگی اور دوسرے فرقوں کے لوگوں سے اسلامی تعلیمات کے مطابق تعلقات قائم کریں۔ اس لئے کہ اگر ہندوستانی مسلمان ایک ملت کی حیثیت سے اسلام کی قولی و عملی شہادت پیش کریں اور اسلام کے سچے داعی بن کر رہیں تو اس ملک کی اجتماعی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

چنانچہ جماعت اسلامی ہند اقامت دین کی علم بردار جماعت ہونے کے سبب اس بات کی مسلسل کوشش کرتی ہے کہ دعوت و اصلاح و تربیت کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کو اس منصب پر لا کھڑا کرے لیکن ہمارے ملک میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جن سے مسلمانان ہند دوچار ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ تحریک اسلامی کے لئے اصل مرکز توجہ دو ہی مسئلے ہیں۔

۱۔ عام بندگان خدا کو دین حق کا پیغام پہنچانا اور اپنے ارکار کی فکری، ایمانی، جذباتی اور عملی تربیت کرنا، لیکن بعض وجوہ سے وہ ان اہم مسائل کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتی جس سے ملت یا ملک اس وقت دوچار ہیں[۱] ظاہر ہے کہ زندگی کے تمام معاملات سے تعلق رکھنے والی کوئی بھی جماعت ملک یا ملی مسائل سے صرف نظر نہیں کرسکتی اور تحریک اسلامی کا تو یہ ایک اہم ترین فریضہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے مفاد میں بلکہ ملک اور ملت کی بقا بھی اس میں ہے کہ ان کے مسائل سے پوری طرح تعرض رکھا جائے:

"پہلی وجہ تو خود اس تحریک کے مفاد کی ہے یہ تحریک ظاہر ہے کہ اپنی جدوجہد خلا میں نہیں چلا رہی ہے کہ اس زمین پر جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے نہ اس کا کوئی واسطہ ہو، نہ اس

---

[۱] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند، ص ۱۸۵

کے مستقبل پر اثر پڑتا ہو اس کے خلاف یہی دنیا اور یہی مشغول زندگی تو اس کا میدان کار ہے۔ اس میں وہ اپنا مطلوبہ نظام حق قائم کرنا چاہتی ہے اور اس سے تعلق رکھنے والے انسان اس کے مخاطب ہیں۔[1]

مزید برآں:-

" دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیرووں پر، ان کے اپنے دینی بھائیوں کے بھی اور دوسرے بندگان خدا کے بھی بہت سے حقوق عائد کئے ہیں۔ جن کا ادا کرنا تقاضائے دین وایمان ہے ـــــ اس لئے تحریک اسلامی سے وابستہ افراد ان فرائض کی ادائیگی سے کسی حال میں بھی صرف نظر نہیں کر سکتے، بلکہ دین کے داعی ہونے کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ عام مسلمانوں سے بڑھ کر ادائے حقوق کے اس دینی فریضے کو ادا کریں۔"[2]

لیکن یہ مسائل جن سے اس وقت ملک وملت دوچار ہیں، بے شمار ہیں خصوصاً ملت اسلامیہ کے لئے جتنے بھی مسئلے اور مشکلیں پیدا ہو گئی ہیں، کم سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ ایک غیر اسلامی نظام حکومت مسلمان اور اسلام کے لئے قدرتی طور پر مسائل ہی مسائل پیدا کر دیا کرتا ہے۔ زندگی کی کوئی کل ایسی نہیں رہ جاتی ہے جسے وہ سیدھی رہنے دیتا ہو۔ اس لئے اگر ملک کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے بالخصوص مسئلوں کا انبار لگا ہوا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔[3]

---

[1] صدر الدین اصلاحی۔ تحریک اسلامی ہند، ص ۱۸۶

[2] " " " ص ۱۸۸

[3] " " " ص ۱۸۸

ملی وملکی مسائل کی کثرت اور اپنے محدود وسائل کے سبب جماعت اسلامی انھیں اپنی عملی توجہات کا اصل مرکز تو نہیں بنا سکتی ہے پھر بھی اس نے بہت سے مسائل کی درجہ بندی کر کے کچھ اہم تر مسائل کے طور پر اور بعض کم اہمیت کے مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور ان کے حل کے لئے مسلسل جدوجہد میں مصروف رہتی ہے۔

پہلی قسم کے مسائل جنھیں ان کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر تحریک اسلامی نے اپنی عملی جدوجہد کے دائرے میں شامل کر رکھا ہے۔ یہ ہیں۔

۱۔ ابتدائی دینی تعلیم کی بڑے پیمانے پر ترویج۔
۲۔ جبری تعلیم کے موجودہ سرکاری نظام سے مسلمان بچوں کا استثنار۔
۳۔ سرکاری نصاب ہائے تعلیم کی اصلاح۔
۴۔ مسلم پرسنل لا یا صحیح تر لفظوں میں مسلمانوں کی نجی زندگی سے تعلق رکھنے والے اسلامی قوانین کا تحفظ۔
۵۔ مسلمانوں میں دینی بیداری کا، اپنے فرض منصبی کے احساس کا فروغ۔
۶۔ خدمت خلق۔
۷۔ فرقہ پرستی کے بیخ کنی اور قوم پرستانہ کش مکش کی روک تھام۔
۸۔ ملک میں معروف (خیر پسندی اور نیکی) کا قیام اور منکرات (مادیت بدکرداری اور برائی) کا ازالہ۔
۹۔ مسلمانوں کی جان ومال کا تحفظ [1]

ان اہم ترین مسائل کے سلسلہ میں جماعت اسلامی ہند جس طرح اور جیسی کچھ کوشش کر رہی ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں جماعت کی عملی سرگرمیاں کے تحت ہمارے علم میں آچکی ہیں جیسے ابتدائی دینی تعلیم کی توسیع، جبری تعلیم کے

---

[1] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند ص ۱۹۲

موجودہ سرکاری نظام سے مسلمان بچوں کا استثنیٰ، اور خدمت خلق وغیرہ البتہ چند دوسرے مسائل، ان کی تفصیل یہ ہے۔

مسلم پرسنل لا ر کا تحفظ :۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اپنے اسلامی قوانین یعنی مسلم پرسنل لا ر پر عمل کرنے کی جو سہولت دستور کی روح سے ملی ہوئی ہے۔ حکومت یا کوئی شخص یا جماعت اگر اس میں مداخلت کرتی ہے یا اس میں ترمیم کرنا چاہتی ہے تو جماعت اسلامی اس میں آڑے آتی ہے اور مسلم پرسنل لار کے تحفظ کے لئے بھرپور جدوجہد کرتی ہے اور جو دوسری دینی جماعتیں یا اشخاص مسلم پرسنل لار کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں اس معاملے میں ان کی بھرپور معاونت کرتی ہے۔

مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور اسے حکومت کی دراندازیوں سے بچانے کے لئے تحریک اسلامی برابر چوکنی رہتی ہے اس نے جب بھی دیکھا کہ اس طرح کے کسی اقدام کے لئے براہ راست یا بالواسطہ زمین ہموار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے یا کم از کم یہ کہ اس غرض سے شوشے ہی چھوڑے جا رہے ہیں تو فوراً اس کا نوٹس لیا اور سخت احتجاج کیا[1]

پھر یہ جدوجہد صرف احتجاجوں اور مطالبوں تک ہی محدود نہیں رہتی ہے بلکہ جماعت اسلامی نے مسلم پرسنل لار کے پورے مسئلہ بالعموم اور اس کے ان اجزار پر بالخصوص جن کو ملک کی بعض سیاسی اور دھارمک تنظیموں اور اشخاص کی جانب سے تنقید اور اعتراض کا ہدف بنایا جا رہا ہے۔ پوری قوت سے مقابلہ کیا ہے اور واضح دلائل سے ان کا رد کیا ہے اس سلسلہ میں جماعت نے ملک کے موجودہ ماحول کے پس منظر میں بہت سی کتابیں لکھوائی اور ان کی اشاعت

---

[1] صدرالدین اصلاحی: تحریک اسلامی ہند ص ۲۰۸

کی ہے۔

فرقہ پرستی اور قومی کشمکش :-

اس سلسلے میں جماعت نے ہمیشہ ہی ایک فعال کردار ادا کیا ہے اور ملک میں پیدا شدہ اس لعنت کی روک تھام جماعت کی عملی سرگرمیوں کا ہمیشہ سے ایک حصہ رہا ہے۔

جماعت اسلامی ہر مرحلے میں نہ صرف اپنے ارکان کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ امن وامان قائم رکھنے کے لئے تمام دوسرے مذاہب کے لوگوں سے رابطہ رکھیں۔ آپس کی غلط فہمیوں کو دور کریں اور فساد زدہ علاقوں کے مظلومین کی امداد کریں بلکہ جماعت کی سطح سے بھی اس معاملے میں ایک منظم منصوبے کے تحت بہت سا کام کرتی ہے اور فرقہ پرستی اور قومی کشمکش کے تدارک کے لئے جماعت ایک جانب مسلمانوں کو ان کے منصب اور مقام سے واقف کراتی ہے کہ وہ ایک خیرامت ہیں۔ ان کو چند دنیاوی فائدوں کے لئے دوسروں کے حریف بن کر زندگی نہیں گزارنا چاہیئے اور دوسری جانب وہ اہل ملک کے سامنے مسلمانوں کی صحیح حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جماعت اسلامی اور مسلمانوں کے بارے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے ہندی اور دوسری کئی علاقائی زبانوں میں لٹریچر کی اشاعت کا کام بھی کرتی ہے۔

منکرات کا ازالہ اور معروف کا قیام :-

جب کہ آج مختلف شکل میں برائیاں ایک وبا کی طرح چاروں جانب پھیلی ہوئی ہیں اور روز بروز ان کی وسعت میں اضافہ بھی ہو رہا ہے اور بھلائیاں آج کے انسانی معاشرے میں کہیں دور دور نظر نہیں آرہی ہیں ان حالات میں تنہا کسی ایک جماعت کے بس میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ ساری برائیوں کے

مٹانے اور بھلائیوں کے فروغ دینے کی کوشش میں کامیاب ہو سکے :

" منکرات کا ازالہ اور معروف کا قیام چونکہ ایک بڑا وسیع کام ہے اور وہ برائیاں بے شمار ہیں جو ملکی معاشرے کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں اس لیے یہ تحریک اسلامی کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ ان سب کے خلاف محاذ قائم کرلیتی۔ دانشمندی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ان میں سے چند ایسی برائیوں کو منتخب کرلیتیں جن کی ہلاکت سامانیاں بہت عام ہیں اور جو بجائے خود بہت سی دوسری برائیوں کا سرچشمہ بھی ہیں۔" [1]

جماعت اسلامی کے اہم عالم مولانا صدرالدین صاحب فرماتے ہیں :

" جماعت اسلامی ہند نے برائیوں کے ازالہ کے لئے یہی طریقہ کار اختیار کیا کہ معاشرے میں پھیلی ہوئی بہت سی برائیوں میں چند بنیادی یا اصل برائیوں کا انتخاب کیا اور اُن کو مٹانے یا ان کی وسعت کو کم کرنے کی کوشش شروع کردی۔ جن منکرات کو اس (جماعت اسلامی) نے اس غرض کے لئے منتخب کیا ہے وہ یہ ہیں :

۱۔ شراب

۲۔ فحش لٹریچر

۳۔ رقص و سرور

ان برائیوں کے خلاف تحریک اسلامی رائے عامہ کو بیدار اور حکومت کے ذمہ داروں کو متوجہ کرتی رہتی ہے۔ اس کی یہ مسلسل کوشش ہے کہ ان چیزوں کی اخلاقی اور معاشرتی مضرتوں کو

---

[1] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند ص ۲۱۲

عقل و دلائل اور علمی شہادتوں کی روشنی میں بالکل عریاں کردے تاکہ لوگوں کے ضمیر ان لعنتوں کے خلاف زیادہ سے زیادہ چبھن محسوس کرنے لگیں اور وہ ان سے اپنے معاشرے اور ملک کو پاک کر دینے کے لئے بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوں۱؂"

مسلمانوں کے جان و مال کا تحفّظ :-

یہ ایک ایسا اور اہم ہنگامی معاملہ ہے جس کی طرف جماعت ہمیشہ بہت مستعدی کے ساتھ متوجہ رہی ہے اور اس سلسلے میں ایک اسلامی جماعت ہونے کے ناطے اس پر جو بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ اسے بحسن و خوبی ادا کرنے کی مسلسل کوشش کرتی ہے۔

لیکن جس طرح یہ معاملہ حد درجہ مستحق توجہ ہے اسی طرح حد درجہ پیچیدہ بھی ہے۔ کیوں کہ اس کا تعلق ایسے عوامل سے ہے جن پر قابو حاصل کر پانا یا جنھیں متاثر کر لینا بظاہر خاصا مشکل ثابت ہو رہا ہے تاہم تحریک کو اپنا فرض ادا کرنا ہے اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حالات سے ذرا بھی مایوس نہیں ہے بلکہ اس بات کا یقین رکھتی ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ بحرانی صورتِ حال ختم ہو کر رہے گی۲؂

جماعت اسلامی اس سلسلہ میں مختلف تدبیریں اور کوششیں اختیار کر رہی ہے جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ جارحیت پسندی اور فرقہ درانہ فسادوں کے تباہ کن اور دور رس نتائج سے برادران ملک کو آگاہ کرنا، اسلام اور مسلمانوں سے متعلق غلط فہمیوں کو دُور

۱؂ صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند، ص ۲۱۳

۲؂ ایضاً

کرنا اور فرقہ وارانہ بربریت کے انجام بد سے واقف کرانا۔

۲۔ اکثریت کے امن پسند اور نیک نفس افراد کو ملک کے شر پسند اور فسادی عناصر کے خلاف کھڑے ہونے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ کرنا۔

۳۔ اس معاملے میں حکومت یا انتظامیہ کی جانب سے جو کوتاہیاں کی جاتی ہیں ان کی جانب توجہ دلانا اور ان کے تدارک کی کوشش کرنا۔

۴۔ ایسی باتوں کو ختم کرنا یا ختم کرانے کی کوشش کرنا جن کے باعث اکثر فساد برپا ہوتے ہیں اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوتا ہے۔

۵۔ مسلمانوں میں صبر و ثبات اور اللہ پر بھروسہ کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی پیدا کرنا کہ ایسے مشکل اور پریشان کن حالات میں مایوسی، گھبراہٹ اور پست ہمتی کا ہرگز شکار نہ ہوں بلکہ صورت حال کا پامردی اور جرأت سے مقابلہ کریں اور اپنے تحفظ و بچاؤ کے لئے وہ ساری تدبیریں اختیار کریں جن کی اسلامی شریعت میں اجازت ہے۔

۶۔ سب سے اہم اور بنیادی کام اس سلسلہ میں یہ کیا جاتا ہے کہ مسلمان جو اپنے صحیح دین سے ناواقف اور دینی تعلیمات سے دور ہو گئے ہیں ان کو سچا اور پکا مسلمان بننے کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

ان اہم ترین مسائل کے علاوہ بعض ملکی اور ملی مسائل ایسے بھی ہیں جن کی طرف جماعت اسلامی توجہ تو دیتی ہے لیکن زیادہ شد و مد کے ساتھ نہیں اور ان کم اہم مسائل کے سلسلہ میں اس نے اپنے آپ کو صرف اظہار جذبات و خیالات تک ہی محدود کر رکھا ہے۔ یہ مسائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ فرد کی آزادی سے تعلق رکھنے والے مسائل:۔

ان مسائل میں عقیدے، رائے، ضمیر، اظہار خیال، تبلیغ افکار اور اجتماع کی آزادی، بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ، جمہوری قدروں کی بقا و ترقی نیز ہر

طرح کی آمرانہ رجحانات اور کلیت پسندانہ اقدامات کی روک تھام کے امور شامل ہیں۔

۲۔ سماجی انصاف سے تعلق رکھنے والے مسائل :۔

ان مسائل میں معاشرتی اونچ نیچ اور چھوت چھات کی بیخ کنی، نسل پرستی، طبقہ واریت اور لسانی تعصب کا انسداد اور اردو زبان کی حمایت وغیرہ امور شامل ہیں۔

۳۔ تعمیر اخلاق سے تعلق رکھنے والے مسائل :۔

ان مسائل سے مراد عریانی، فحاشی، عصمت فروشی، رشوت، جوا، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی جیسی عام برائیوں کی اصلاح ہے۔

۴۔ بیرون ملک کے وہ مسائل جن کی کوئی نمایاں دینی یا انسانی اہمیت ہو :۔

ان مسائل میں عالمی امن وامان، افراد اور اقوام کے بنیادی انسانی حقوق اسلامی اخوت کے ناگزیر تقاضے اور عام انسانی ہمدردی کے معاملات شامل ہیں۔[1]

---

[1] صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ص ۲۱۶

جماعت اسلامی ہند کا تنقیدی جائزہ

جماعت اسلامی ہند پر مختلف حلقوں کی جانب سے اور مختلف زاویوں سے تنقید کی گئی ہے اور سب سے زیادہ تنقید بانی جماعت سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ پر ہوئی ہے۔ ان تنقید کرنے والوں میں مذہبی لوگ بھی ہیں اور غیر مذہبی بھی۔ دینی مدارس اور ان حلقوں سے تعلق رکھنے والے حضرات نے بھی تنقید کی ہے اور جدید تعلیم یافتہ علمی اور سیاسی شخصیتوں نے بھی۔ مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی پر معیاری اور اصولی تنقید بھی کی گئی ہے اور غیر معیاری اور عدم شائستگی کا رویہ بھی بعض جانب سے اپنایا گیا ہے۔

غرض جماعت اسلامی اور بانی جماعت پر تنقید کا اب اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ خود جماعت اسلامی کے پاس اپنا اتنا زیادہ لٹریچر نہیں ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس وسیع ذخیرہ میں سے صرف اصولی اور معیاری تنقید ہی ہمارے پیش نظر ہے۔

جماعت اسلامی بنیادی طور پر ایک دینی جماعت اور تحریک ہے اس لئے اس سلسلے میں دینی حلقوں کی جانب سے ہوئی تنقید سے ابتدا کی جاتی ہے۔ چند بنیادی دینی امور جن پر تنقید کی گئی ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ عصمت انبیاء :-

اصولی مسائل میں پہلا نزاعی مسئلہ "عصمت الانبیاءؑ" کا ہے اس مسئلہ میں

مولانا مودودیؒ پر جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کی بنیاد "تفہیمات" جلد دوم کی یہ عبارت ہے:

"لیکن ان حضرات نے شاید اس امر پر غور نہیں کیا ہے کہ عصمت دراصل انبیاء علیہم السلام کے لوازم ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہو جاتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہو سکتی ہے اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں ہونے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں ہیں"[1]

مودودی صاحبؒ کے اس خیال پر تنقید کرتے ہوئے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

"اب فرمایئے مذکورہ بالا عقیدہ پر نبی کے متعلق جن میں جناب رسولؐ بھی داخل ہیں، کہاں تک اصول وعقائد اسلامیہ کے مطابق ہے جس میں ہر نبی سے عصمت وحفاظت کا اٹھا لینا اور بالارادہ ان سے لغزشیں کرا دینا مانا گیا ہے؟ ایسی صورت میں تو کوئی بھی نبی معیار حق نہیں ہو سکتا ہے اور نہ کسی نبی پر ہمیشہ اعتماد کیا جا سکتا ہے جو بھی حکم ہو گا اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ کہیں وہ عصمت وحفاظت اٹھ جانے کے زمانے کا نہ ہو۔ اب

---

[1] مولانا مفتی محمد یوسف، مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ حصہ اول، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ص ۶۳

تبلائیے یہ اختلاف اصولی ہے یا فروعی اور بتلائیے کہ اسلامی
جماعت اور اس کے بانی مسلمان ہیں یا نہیں۔"[1]

۲۔ تنقید صحابہؓ:۔

جماعت اسلامی کے دستور کی دفعہ ایکؔ کی شق چھؔ کی اس عبارت اور
اس سے وابستہ عقیدہ و مسلک پر بھی تنقید کی گئی ہے۔

"رسول اللہ کے سوا کسی کو انسان معیار حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید
سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو ہر ایک کو خدا کے
بنائے ہوئے اسی معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار
کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے۔"[2]

اس پر بعض علمی حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ "اس دفعہ میں
جو الفاظ ہیں ان کے عموم میں صحابہ کرامؓ بھی آجاتے ہیں کیوں کہ وہ بھی رسول خدا
کے سوا انسان ہیں، تو صحابہ کرامؓ بھی اس دفعہ کی رو سے محل تنقید بن جاتے ہیں
حالانکہ حدیث کی رو سے ان پر تنقید جائز نہیں بلکہ وہ تمام امت کے لئے معیارِ
حق کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ تمام اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے لہذا مندرجہ
بالا دفعہ اہلِ سنّت کے اجتماعی عقیدے کے خلاف ہے تو جماعت کا دستور بھی
اہلِ سنّت والجماعت کے زمرہ میں شامل نہیں بلکہ اس سے خارج ہے۔"[3]

۳۔ مسئلہ دجّال:۔

اصولی اور بنیادی مسائل میں مسئلہ دجّال بھی وجۂ تنقید بنا ہے اور اس

---

[1] مولانا مفتی محمد یوسف، مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ حصہ اول، مرکزی مکتبہ اسلامی ص ۴۔

[2] دستور جماعت اسلامی ہند ص ۸

[3] مفتی محمد یوسف، مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ ص

مسئلہ میں بانی جماعت اسلامی کو بہت سخت اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ کسی شخص نے دجّال کے متعلق مولانا مودودیؒ سے ترجمان القرآن کے واسطے سے سوال کیا تھا کہ کانے دجّال کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں مقیّد ہے تو آخر وہ کون سی جگہ ہے؟ آج دنیا کا کونہ کونہ انسان نے چھان مارا ہے پھر کیوں کانے دجّال کا پتہ نہیں چلتا؟

اس کا جواب آپ کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ ـــ

"کانا دجّال وغیرہ تو افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔"

مولانا مودودی صاحب کے اس قول کے برخلاف احادیث کی کم از کم تیس[۳۰] روایات میں دجّال کا تذکرہ موجود ہے۔ بخاریؒ۔ مسلمؒ۔ ابوداؤدؒ۔ ترمذیؒ۔ شرح السنۃؒ اور بیہقیؒ کی کتابوں میں یہ روایات درج ہیں۔

قاضی مظہر حسین صاحب اور کچھ دوسرے علماء کا کہنا ہے کہ دجّال اکبر وہ ہے جو الجزیرہ میں قید ہے اور جس سے حضرت تمیم داری نے ملاقات کی تھی، اور جب حضورؐ نے اسے قطعی طور پر دجّال قرار دیا ہے تو اس کو دجّال اکبر سمجھنا ایک اسلامی عقیدہ کی حیثیت سے فرض ہے اور جو شخص اسے دجّال اکبر نہ سمجھے وہ صحیح العقیدہ مسلمان نہیں ہے۔

ان بنیادی مسائل کے علاوہ بہت سے فروعی مسائل کے سلسلہ میں بھی حضرات علماء نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو تنقید و تبصرہ کا نشانہ بنایا ہے۔ ان فروعی مسائل میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ تقلید کا مسئلہ

۲۔ رمضان میں سحری کے وقت کا مسئلہ

۳۔ دو حقیقی بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے کا مسئلہ

۴۔ بلا وضو سجدہ تلاوت کا مسئلہ۔

۵۔ متعہ کا مسئلہ
۶۔ تالیف القلوب کا مسئلہ
۷۔ ایلاء اور خلع کا مسئلہ
۸۔ صحابہ کرامؓ کی غلط فہمی کا مسئلہ وغیرہ

ان تمام فروعی مسائل کے سلسلہ میں مولانا مودودی مرحوم کی تحقیقات اور تشریحات سے کچھ دوسرے علماء حضرات کو سخت اختلاف ہے۔ مثلاً معترضین علماء کا کہنا ہے کہ تقلید کے بارے میں مولانا مودودی کا مسلک اور نظریہ نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔

رمضان میں سحری کے وقت کے مسئلہ پر محترم مولانا مودودی کا یہ اظہار خیال کہ :

"آج لوگ سحری اور افطار دونوں کے معاملے میں شدت احتیاط کی بنا پر کچھ تشدد برتنے لگے ہیں مگر شریعت نے ان دونوں اوقات کی کوئی ایسی حد بندی نہیں کی ہے جس سے چند سیکنڈ یا چند منٹ ادھر سے ادھر ہو جانے سے آدمی کا روزہ خراب ہو جاتا ہو۔ سحر میں سیاہیٔ شب سے سپیدۂ صبح کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجائش اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک شخص کے لئے یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر عین طلوع فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی ہو تو وہ جلدی سے اٹھ کر کچھ کھا پی لے"[۱]

اس پر بعض علمی حلقوں کی جانب سے یہ اعتراض کیا گیا ہے۔

"عین طلوع فجر کے وقت میں ایک روزہ دار کو کھانے پینے کی اجازت دینا صریح طور پر قرآن کریم کے خلاف ہے کیوں کہ

---

[۱] مولانا مفتی محمد یوسف، مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ ص ۱۲۷

قرآن کریم نے دن میں روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے اور دن صبح صادق سے شروع ہو کر غروب آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے۔ تو صبح صادق کے بعد کھانے پینے کی اجازت قرآن کی رو سے صحیح نہیں ہے لہذا مولانا کا یہ کہنا کہ "عین طلوع فجر کے وقت میں کھانا پینا جائز ہے" قرآنی حکم کے صریح خلاف ورزی ہے بلکہ قرآن کے حکم میں ایک گونہ تحریف ہے جو کسی طرح بھی جائز نہیں ہے بلکہ خطرۂ عظیم کا موجب بن سکتا ہے۔"[1]

دو متحد الجسم بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی اجازت پر بھی علماء حضرات نے مولانا مودودی پر اعتراض کیا ہے۔

اس معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ جب مولانا مودودی ملتان کی جیل میں تھے تو ایک صاحب نے دو متحد الجسم لڑکیوں کے نکاح کے بارے میں معلوم کیا تھا اس کے جواب میں مولانا مودودی نے لکھا تھا:

"ان دو توام لڑکیوں (متحد الجسم) کے معاملے میں چار صورتیں ممکن ہیں۔ ایک[1] یہ کہ دونوں کے نکاح الگ الگ شخصوں سے کیا جائے۔ دوسرے[2] یہ کہ ان میں سے کسی ایک کا نکاح ایک شخص سے کیا جائے اور دوسری محروم رکھی جائے۔ تیسری[3] یہ کہ دونوں کا نکاح کسی ایک شخص سے کر دیا جائے۔ چوتھی[4] یہ کہ دونوں ہمیشہ نکاح سے محروم رکھی جائیں۔

ان میں سے پہلی دو صورتیں صریح ناجائز، غیر معقول اور ناقابل عمل ہیں کہ ان کے خلاف کسی استدلال کی حاجت نہیں ہے اب رہ جاتی ہیں آخری دو صورتیں، یہ دونوں قابلِ عمل ہیں

---

[1] مودودی عقائد پر تنقیدی نظر، بحوالہ مولانا مفتی محمد یوسف، مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ، ص ۱۳۱

مگر ایک صورت کے متعلق مقامی علماء کہتے ہیں کہ یہ چونکہ جمع بین الاختین کی صورت ہے جسے قرآن نے صریح طور پر حرام قرار دیا ہے اس لئے لامحالہ آخری صورت پر ہی عمل کرنا ہوگا۔" [۱]

چنانچہ مولانا مودودی نے اپنے جواب میں آگے لکھا ہے ـــــ

"کہ دونوں لڑکیوں کو ہمیشہ کے لئے مجبور کیا جائے یہ ظلم ہے اور قرآن کا حکم عام حالات کے لئے ہے یہ دونوں لڑکیوں کے پیدائشی معذوری کی حالت ہے لہذا ـــــ

یہ فیصلہ ان دونوں بہنوں پر چھوڑ دیا جائے کہ آیا وہ بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جانے پر راضی ہیں یا دائمی تجرد کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگر وہ پہلی صورت کو خود قبول کرلیں تو ان کا نکاح کسی ایسے شخص سے کردیا جائے جو انھیں پسند کرے اور اگر وہ دوسری صورت ہی کو ترجیح دیں تو پھر اس ظلم کی ذمہ داری سے ہم بھی بری ہیں اور خدا کا قانون بھی۔" [۲]

مولانا مودودی کے اس جواب پر بعض بزرگ علماء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مولانا مودودی کا یہ جواب کہ یہ توأم (متحد الجسم) لڑکیاں بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں آسکتی ہیں۔ قرآن کریم کے اس صریح حکم کے خلاف ہے جس کے مطابق بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں دو بہنوں کا جمع ہونا حرام ہے لہذا مولانا مودودی کا یہ جواب اجماع امت کے بھی خلاف ہے اور اس سے ٹکرا رہا ہے اس کو صحیح تسلیم نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ جان بوجھ کر حکم قرآنی کی خلاف ورزی پر مشتمل معلوم ہوتا ہے۔

---

[۱] "ترجمان القرآن" ماہنامہ، جلد ۴۳ شمارہ ۲ نومبر ۱۹۵۴ء

[۲] " " " " " " "

اسی طرح بلا وضو سجدۂ تلاوت ادا کرنے، متعہ، تالیف قلوب، ایلا، خلع اور صحابہ کرامؓ کے سلسلہ میں غلط فہمی کے مسائل سے متعلق مولانا مودودی کی تحقیقات و تشریحات پر خوب تنقید کی گئی ہے۔

علماء کی تنقید

مولانا مودودی کی ذات کے علاوہ جماعت اسلامی کے طرز فکر، طریقہ کار اور رویہ کے سلسلہ میں بھی بہت سے علماء کرام نے سخت تنقید کی ہے۔ ان ناقد علماء حضرات میں ایک نمایاں نام مولانا منظور نعمانی صاحب کا بھی ہے۔

مولانا منظور نعمانی صاحب نے اپنے رسالہ الفرقان لکھنو کے شمارہ ماہ ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ میں "جماعت اسلامی اور اس کے خلاف فتوے" کے عنوان سے ایک طویل مضمون تحریر فرمایا ہے۔

یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ جو مختصر سا ہے اس میں ان مفتیان حضرات کو مخاطب کیا ہے جنھوں نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف فتوے صادر فرمائے ہیں۔ دوسرا حصہ جو طویل ہے اس میں جماعت اسلامی کے ذمہ داروں کو مخاطب کیا ہے اور مضمون کے اس حصہ میں بہت مضرتوں اور خرابیوں پر اظہار کیا ہے۔

مولانا منظور نعمانی صاحب کا جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ ـــــ

"آپ حضرات کی دعوت اور دعویٰ تو اس کام کا ہے جس کے لئے انبیاء علیہم السّلام آئے تھے۔ لیکن اس کے لئے تنقیدی لٹریچر، جماعتی تنظیم اور عملی جدوجہد کی مختلف شکلوں میں جو

کچھ ہو رہا ہے ذرا گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے اس کے لئے طریق کار بہت کچھ مستعار لیا ہے آج کل کی مادی تحریکوں سے ۔"[1]

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ تقلید اور اجتہاد کے بارے میں جماعت اسلامی اور اس کے ذمہ داروں کا مسلک جمہور علمار کے خلاف ہے ۔

مولانا منظور نعمانی صاحب کا ایک اور اعتراض جماعت اسلامی کے متعلق یہ ہے کہ اس کے اکثر ارکان جماعت، جماعت کا لٹریچر پڑھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ دین کی روح اور مغز کو پا گئے ہیں اور یہ کہ خلافتِ راشدہ کے بعد جب سے اسلام میں غیر اسلامی افکار و نظریات اور بہت سی دوسری باتوں کی آمیزش ہوئی ہے اگرچہ مختلف زمانوں میں اصلاح و تجدید کی کوششیں ہوئی ہیں لیکن کوئی داعی پورے اسلام کو لے کر کھڑا نہیں ہوا۔ محض جزوی اصلاحات کا کام ہوتا رہا۔ جماعت کے ارکان کے خیال میں جماعت اسلامی پہلی مرتبہ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کے اصل اسلام کو بالکل صحیح طریقہ پر قائم کرنے کے لئے کھڑی ہوئی ہے اور یہی اس کا خصوصی امتیاز ہے۔

مولانا منظور نعمانی صاحب کو جماعت اسلامی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس جماعت نے پورے دین کی اقامت کی جدوجہد کا شرف و اعزاز صرف اپنے لئے مخصوص سمجھ رکھا ہے کسی دوسری دینی جماعت کو اس شرف و اعزاز میں شریک و معاون سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

جماعت اسلامی کے ذمہ داروں کی تصوف سے عدم دلچسپی اور بے خبری اور محرومی کے علاوہ جماعت کے اس نظریہ و خیال پر بھی تنقید کی ہے کہ وہ ہر اس نظام حکومت سے تعاون کو ناجائز اور حرام قرار دیتی ہے جو اللہ تعالیٰ

---

[1] مولانا منظور نعمانی، ماہنامہ الفرقان لکھنؤ ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ

کی حاکمیت کے نظریہ پر قائم نہ ہو۔

مولانا منظور نعمانی صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"مولانا مودودی سے خود اس عاجز نے اس مسئلہ کے بارے میں گفتگو کی تھی اور اس وقت یہ طے ہوگیا تھا کہ غیر اسلامی نظام حکومت سے تعاون نہ کریں اور نوکری وغیرہ کے ذریعہ اس سے استفادہ نہ کرنا ہر رکن کے لئے ضروری تو قرار دیا جائے گا لیکن اس کو شرعی مسئلہ کی حیثیت نہیں دی جائے گی"[1]

جماعت اسلامی کے بعض ذمہ داروں نے بھی اس سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے اس میں ہونے والی بعض تبدیلیوں پر تنقید کی ہے۔

ایسے حضرات میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ہے جو ساٹھ[60] کی دہائی میں کئی سال جماعت کے ایک سرگرم رکن رہے لیکن بعد میں اس کے بعض معاملات میں انحراف کرنے کے باعث اس سے الگ ہوگئے گو ڈاکٹر صاحب کا تعلق جماعت اسلامی پاکستان سے رہا ہے لیکن انھوں نے اپنی کتاب "تحریک جماعت اسلامی ـــــ ایک تحقیقی مطالعہ" میں جماعت کے فکر و عمل میں انحراف پر جو اصولی تنقید کی ہے اس میں ضمنی طور پر جماعت اسلامی ہند بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب لکھتے ہیں:

"صرف اس قدر عرض کر دیا جائے کہ جب اس نے اپنے آپ کو ایک اصولی اسلامی جماعت کے بجائے ایک قوم پرست گروہ کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کیا تو جماعت اسلامی ہند کے لئے بھی نام کے اشتراک اور قبل از تقسیم کے پیدا شدہ

---

[1] مولانا منظور نعمانی، ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، ذی قعدہ ۱۴۰۰ھ

لٹریچر کے اشتراک کے باعث اپنی پوزیشن کو واضح رکھنا مشکل ہوگیا ہے۔[1]"

جماعت اسلامی ہند کے لئے ابتدا میں اپنی پوزیشن واضح رکھنا واقعی مشکل کام تھا لیکن چند ہی سالوں بعد جب وہ بھی اس ڈگر پر آئی اور معاملہ یکساں ہوگیا تب یہ مشکل کام باقی نہیں رہا اور اب جماعت اسلامی ہند کا بھی یہی حال ہے جیسا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے لکھا ہے۔ وہ جماعت اسلامی کے نصب العین کے تحت لکھتے ہیں:

"جماعت اسلامی کا نصب العین اگرچہ اس دور ثانی میں وہی ہے جو دور اوّل میں تھا لیکن یہ کہنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا کہ اس تبدیلی سے نصب العین بالکل متاثر نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ آج بھی جماعت کے دستور میں نصب العین کی دفعہ کے تحت وہی الفاظ مرقوم میں جو دور اوّل میں تھے لیکن تاریخ میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ الفاظ جوں کے توں رہے ہیں لیکن ان کے مفہوم میں تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ یہی مسلمان کا لفظ آج سے ہزار بارہ سو سال قبل اپنے اندر جو مفہوم رکھتا تھا کون کہہ سکتا ہے کہ آج بھی اس کے باوجود کہ یہ لفظ "مسلمان" اس طرح بولا اور لکھا جاتا ہے لیکن اس کا مفہوم بدل نہیں گیا ہے۔[2]"

اور ـــــــ

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جسے میں ناقابل تردید شہادتوں اور ناقابل انکار دلائل سے ثابت کرسکوں۔ البتہ یہ میرا ایک قومی احساس

---

[1] ڈاکٹر اسرار احمد، تحریک جماعت اسلامی ــــ ایک تحقیقی مطالعہ، ص
[2] " " " " " " ص ۱۱۷

ہے جو جماعت کے کارکنوں کے براہ راست مطالعے اور ان کے
محرکات عمل کے بدقت تجزیہ سے قائم ہوا ہے۔[۱]
ڈاکٹر صاحب آگے لکھتے ہیں ــــ
"دور ثانی (جماعت اسلامی کی موجودہ پالیسی اور طریقہ کار) کے
طریق کار کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ــــ
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
جو باتیں وہاں (اولاً) بالکل غلط ٹھہرائی گئی تھیں انھیں یہاں
(اب) باقاعدہ اختیار کیا جا رہا ہے جن ذرائع سے "اسلامی
حکومت کا قیام" ناممکن العمل بتایا گیا تھا انہیں پر یہاں (اب)
طبع آزمائی کی جا رہی ہے اور جس راستے کے اختیار کرنے پر مسلم لیگ
کی تنقیص کی گئی تھی، ٹھیک اس راستہ پر جماعت اسلامی نے
پیش قدمی شروع کر دی ہے۔"[۲]
ارکانِ جماعت کے نومسلمانہ احساس کا خاتمہ، سیرت وکردار کا انحطاط، جوش کار
اور جذبہ ایثار میں کمی اور باہمی محبت اور اخوت کا فقدان بھی وجہ تنقید بنا ہے۔
صاف نظر آتا ہے کہ وہ نومسلمانہ احساس جو دور اوّل کے کارکنوں
کی اہم خصوصیت تھی آج بالکل مفقود ہے۔"[۳]
"پھر یہ معاملہ" احساس "ہی کا نہیں" صورت واقعہ "کا بھی ہے۔
ارکان جماعت کی زندگیاں عملاً اب وہ معیار پیش نہیں کرتیں
جو دور اوّل کے ارکان کی زندگیاں پیش کرتی تھیں۔"[۴]

---

[۱] ڈاکٹر اسرار احمد، تحریک جماعت اسلامی ــ ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۱۸
[۲] " " " ص ۱۲۰
[۳] " " " ص ۱۲۸
[۴] " " " ص ۱۲۹

پھر ڈاکٹر صاحب جماعت کے کام کے لئے قربانی کے جذبہ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں ـــــ

"جوش کار اور جذبہ ایثار کا جو عالم اب جماعت کے ارکان میں پایا جاتا ہے اس نے تو پوری جماعت میں تشویش کی ایک لہر دوڑا دی ہے وہ تمام اچھے اچھے کارکن کہ جو کسی زمانہ میں ایثار کے مجسمے اور ہمت وعزیمت کے پتلے ہونے میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایک ایک کر کے سرد مہری کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں"[1]

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب جماعت کے ارکان کے آپسی تعلقات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ـــــ

"جماعت کے متعلقین کے آپس کے تعلقات بھی اب مایوس کن حد تک کمزور ہی نہیں بلکہ بعض جگہ پر تو افسوس ناک حد تک خراب ہیں ـــــ وہ تخالف وتناصر وہ ہمدردی اور باہمی امداد و تعاون اور وہ خلوص ومحبت جو جماعت کے دور اوّل میں اس کے کارکنوں کی ایک نمایاں خصوصیت تھی اب کہیں نظر نہیں آتی"[2]

ہم عصر علماء حضرات دینی جماعتوں اور جماعت کے بعض منحرف حضرات کے علاوہ بعض سیاسی رہنماؤں، کچھ سیاسی جماعتوں اور ارباب حکومت کی جانب سے بھی جماعت اسلامی پر تنقید کی گئی ہے اور اس کو اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

پہلا، اعتراض یہ ہے کہ جماعت اسلامی ایک فرقہ پرست جماعت ہے۔
دوم، جماعت اسلامی اس ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتی

---

[1] ڈاکٹر اسرار احمد تحریک جماعت اسلامی ۔ ایک تحقیقی مطالعہ ص ۱۸۰

[2] " " " " " " ص ۱۸۴-۱۸۵

ہے جس کے دوسرے معنی مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے
کے ہیں اس مطالبہ سے لازماً ہندو مسلم کشمکش بڑھے گی ـــ
فرقہ واریت کو فروغ ہوگا اور ملک کی مزید تقسیم کے لئے راہ ہموار
ہوگی۔

سوم، جماعت اسلامی کے نظریات ملک کی اجتماعی زندگی کے لئے تباہ کن ہیں۔
چہارم، ملک کی اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ سیکولرزم، جمہوریت اور سوشلزم پر
قائم ہے اور جماعت اسلامی ان تینوں بنیادوں کی نفی کرتی ہے۔
پنجم، جماعت اسلامی ہند ایک غیر جمہوری، فسطائی، آمرانہ اور نیم فوجی تنظیم
ہے۔
ششم، جماعت اسلامی ایک خفیہ جماعت ہے اس کے عزائم، اس کی عملی سرگرمیاں
اس کا نظم سب خفیہ نوعیت کا ہے۔
ہفتم، جماعت اسلامی ہند کا تعلق بیرون ملک کی اسلامی جماعتوں اور تنظیموں
سے ہے اس لئے اس کا وجود خطرے سے خالی نہیں ہے۔"[1]

بانی جماعت سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اور جماعت اسلامی کے بارے میں
دوسروں کے ردعمل کا یہ ایک رُخ تھا۔ اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں
بہت سی متوازن اور معیاری تنقیدوں، تبصروں اور اعتراضات کا جماعت
کے ذمہ داروں و اہل علم حضرات اور جماعت سے باہر کے اہل علم اور اہل قلم حضرات
کی جانب سے مثبت جواب، توضیح و تشریح اور دفاع کیا گیا ہے
بانی جماعت کے بارے میں ایک عمومی خیال اور رائے یہ ہے کہ ـــ
"گذشتہ سو سال میں اسلامی دنیا میں بڑے بڑے مفکر، مجاہد
اور فاضل گزرے ہیں مگر نئی نسل کے افکار و خیالات پر جتنا

---

[1] شعبہ تنظیم، جماعت اسلامی ہند کیا ہے اور کیا نہیں ہے، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ص

ہمہ گیر اثر مولانا مودودی کا ہے اتنا اور کسی کا نہیں، تعلیم و تہذیب
تمدن، معاشرت، سیاست اور قیادت ہر شعبہ زندگی پر ان
کی اثر انگیزی کے گہرے نقوش ہیں اور اپنی اس بے پناہ
اثر انگیزی کے باعث آج وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز جگہ کھڑے
ہیں۔[۱]"

بانی جماعت کے سلسلہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"مغربی تہذیب اور اس کے اساس پر عالمانہ تنقید میں اس
نصف صدی میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ان کے (مولانا
مودودی کے) مجموعہ مضامین "تنقیحات" کو اولین مقام حاصل
ہے۔"[۲]

مولانا قاری محمد طیب صاحب مولانا مودودیؒ کی اسلامی خدمات کے بارے
میں لکھتے ہیں کہ ــــــ

"اس دور التباس و تلبیس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ نے
جس بے جگری سے اسلام کے اجتماعی مسائل کو صاف کیا ہے، وہ
انھیں کا حصہ ہے۔ پوری امت کو ان کا ممنون ہونا چاہیے۔"[۳]

مولانا مودودیؒ کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی
فرماتے ہیں کہ ــــــ

"ان (مولانا مودودیؒ) کی دقت نظر، نکتہ سنجی، بہترین خدمت
دین کا ذکر بار بار آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دور حاضر کے فتنوں

---

[۱] متین طارق باغپتی، مولانا مودودی اور فکری انقلاب ص ۱۱

[۲] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش ص ۱۲۸

[۳] قاری محمد طیب، فکری حکومت، بحوالہ سید انور علی، ردّ فتنہ ص ۲۲۴

کے سدّباب میں ابوالاعلیٰ صاحبؒ کا سینہ خاص طور پر کھول دیا ہے اور تجدّد زدہ گروہ کے حق میں ان کے قلم کی ایک ایک سطر آبِ حیات ہے ۔ طبقۂ علماء میں مولانا کی ذات اس حیثیت سے بہت ہی بلند اور ممتاز ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مفکرِ ملت ہیں؛ ؎

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب مولانا مودودی کی علمی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ـــــ

"اس کے ساتھ ہی قرآن و سنت کا اتنا گہرا اور واضح علم رکھتا ہے کہ موجودہ دور کے تمام مسائل پر اس کی روشنی میں تسلی بخش طور پر گفتگو کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ملحدوں اور دہریوں نے اس شخص کے دلائل کے سامنے ڈگیں ڈال دی ہیں اور یہ بات واضح طور پر کہی جا سکتی ہے کہ مودودی صاحبؒ سے ہندوستان اور عالمِ اسلام کے مسلمانوں کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔" ؎

یہ "تاریخ کا اٹل قانون ہے کہ جو مصلح دینی و فکری اعتبار سے جتنا زیادہ قوی ہوگا اتنی ہی قوت اور ہنگامہ آرائی کے ساتھ اس کی مخالفت بھی کی جائے گی۔

اسعد گیلانی صاحب کے الفاظ ہیں ـــــ

"گہری محبت کرنے والوں کے وسیع حلقے کے ساتھ ساتھ شدید مخالفت کرنے والوں اور عناد رکھنے والوں کے گوناگوں حلقوں

؎ مولانا عبدالماجد دریاآبادی، بحوالہ متین طارق باغپتی، مولانا مودودیؒ اور فکری انقلاب ص ۱۰۶

؎ مولانا سید سلیمان ندوی. بحوالہ متین طارق باغپتی، مولانا مودودی اور فکری انقلاب ص ۱۰۷

سے سابقہ پیش آنا ہر داعیٔ حق کی تقدیر ہے اور مولانا مودودیؒ بھی ایک داعی حق ہیں۔ ان کی مخالفت اگر چاروں طرف سے کی جارہی ہے تو یہ ان کی عظمت کا ایسا واضح ثبوت ہے جس سے کوئی فہیم و دانا انکار نہیں کرسکتا۔"[1]

بعض دینی مسائل کے سلسلہ میں مولانا مودودیؒ کی تحقیقات و تشریحات پر دینی حلقوں اور علماء حضرات کی جانب سے عدم اطمینان کا اظہار اور ان پر تنقید و تبصرہ کا مثبت جواب و وضاحت بھی پیش کی گئی ہے۔

"تفہیمات" کی عبارت میں تجزیہ کا چوتھا اور آخری جزء یہ ہے:

(د) ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی حفاظت اٹھاکر ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہیں۔

یہ وہ شق اور جزء ہے جس پر علمی حلقوں میں اگرچہ بہت ہنگامہ برپا کیا گیا ہے مگر مسئلہ عصمت الانبیاء میں اس کی جو تشریح گزر چکی ہے اگر اس کی روشنی میں اس کو دیکھا جائے تو اس بات پر یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودی نے اپنے ان الفاظ میں مسلک اہلِ سنت والجماعت کی عین ترجمانی کی ہے کیوں کہ اس میں جس چیز کا زیادہ سے زیادہ دعویٰ کیا گیا ہے وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام سے ایک یا دو لغزشیں سرزد ہوئی ہیں اور مسئلہ عصمت الانبیاء میں متعدد ائمہ کے حوالوں سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ تمام اہل سنت اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء کے افعال میں لغزشیں پائی جاتی ہیں اور لغزشوں سے وہ معصوم نہیں ہیں تو جب یہ مسئلہ اجتماعی ہے اور پورے اہل سنت ابتداء سے اس پر متفق چلے آرہے ہیں تو یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آخر مولانا مودودی کو ایک ایسی بات کہنے اور لکھنے سے کیوں اہل سنت والجماعت

---

[1] اسعد گیلانی، مولانا مودودی سے ملیے، مکتبہ تجلی دیوبند ص ۴

بلکہ اسلام کے دائرے سے نکالا جا رہا ہے؟ جس پر قرآن و حدیث ناطق اور تمام اہل سنت بلکہ پورے اہل اسلام متفق رہے ہیں[1] ائمہ دین بھی کتاب و سنت کے معیار پر صحابہ کرامؓ کے اقوال جانچتے اور پرکھتے ہیں اور اس طرح کی تنقید کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد بعض اقوال کو قابل عمل اور بعض کو قابل ترک سمجھتے ہیں بلکہ بعض ائمہ تو صاف طور پر اقوال صحابہؓ کی حجیت ہی سے انکار کر دیتے ہیں تو اگر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے اہل علم حضرات نے بھی دستور جماعت اسلامی کی دفعہ چھ[6] میں لکھا ہے کہ "رسول خدا کے سوا کسی کو معیار حق نہ بنائے اور نہ کسی کو تنقید سے بالاتر سمجھے"۔ تو ہم اس کو آخر کس قانون کی رو سے گمراہی قرار دے سکتے ہیں جبکہ مولانا مودودی سے بہت پہلے امت کے اسلاف نے اس کو بطور عقیدہ اور ایک قانون کے تسلیم کیا ہے۔ مولانا مودودیؒ اور جماعت کے اہل علم نے تنقید کی جو تشریح کی ہے اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ "قول صحابی بجائے خود اس کی شخصیت کی بنا پر حجت اور واجب التسلیم نہیں ہے بلکہ کتاب و سنت کے فیصلہ کے ساتھ موافقت اور مطابقت کی وجہ سے حجت اور واجب التسلیم قرار پا سکتا ہے اور جب بھی وہ کتاب و سنت کے فیصلہ کے خلاف ثابت ہوگا اس وقت اسے چھوڑ دیا جائے گا"۔ اور یہ عقیدہ و مسلک وہ ہے جو تمام علمائے امت کے یہاں متفق علیہ عقیدہ و مسلک چلا آ رہا ہے[2]

اسی طرح بنیادی مسائل میں مسئلہ دجال اور فروعی مسائل میں تقلید رمضان میں سحری کا وقت، دو حقیقی بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا، بلا وضو سجدۂ تلاوت، متعہ، تالیف القلوب، ایلا، خلع اور صحابہ کرامؓ کی غلط فہمی

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو، مولانا مفتی محمد یوسف، مولانا مودودیؒ پر اعتراضات کا علمی جائزہ (حصہ اول) ص ۲، ۳،

[2] مفتی محمد یوسف مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ ص ۲۹

وغیرہ مسائل پر اظہار خیال کو دوسرے علمار کرام نے جو تنقید و تبصرہ کا نشانہ بنایا ہے اس کے جواب میں ہر مسئلہ پر الگ الگ مدلل گفتگو کر کے ان حضرات نے اس کی وضاحت اور مدافعت کی ہے۔

مولانا منظور نعمانی صاحب نے جماعت اسلامی اور اس کے ذمہ دار حضرات پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کا بھی بالتفصیل جماعت کے ایک اہم ذمہ دار، عالم دین مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی جانب سے جواب دیا گیا ہے۔

جماعت پر مولانا کے الزام نمبر ایک پر اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ الزام اچھا خاصا سنگین بھی ہے لیکن لطف یہ ہے کہ اس پہلے ہی الزام کے بارے میں مولانا پوری طرح مطمئن نہیں ہیں کہ یہ جو کچھ وہ محسوس کر رہے ہیں فی الواقع اس کے لئے کوئی وجہ بھی ہے یا انھوں نے یوں ہی محسوس کر لیا ہے۔ وہ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ " خود میرا اس بارے میں کوئی متعین اور واضح احساس نہیں ہے جس پر مجھے اطمینان ہو" البتہ بعض اہل بصیرت نے جنھوں نے جماعت کا لٹریچر "کچھ" پڑھا ہے۔ مولانا کے سامنے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ انبیا علیہم السلام کی دعوت اور اس کے اصل مقصد کے سمجھنے میں جماعت اسلامی والے دور حاضر کی مادیت سے کچھ متاثر نظر آتے ہیں۔[1]

مولانا منظور صاحب کی دوسری شکایت یہ ہے کہ تقلید اور اجتہاد کے بارے میں جماعت کے ذمہ داروں کا جو مسلک ہے اگر چہ وہ بجائے خود مولانا کے لئے قابل برداشت نہیں ہے۔ لیکن " اس کے سبب سے اللہ کا مقدس دین بے علم مجتہدوں کی آرا و ہوا کا تختۂ مشق بن رہا ہے۔" اس کے جواب میں مولانا اصلاحی تحریر کرتے ہیں:

" میں سچائی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ پچھلے چار۴ پانچ۵ سالوں

---

[1] مولانا امین احسن اصلاحی، جماعت اسلامی کے خلاف قرار داد جرم مرکزی مکتبہ اسلامی ص ۵، ۶

کے اندر ہے علم میں کوئی ایسی بات نہیں آئی ہے جو مولانا کے الزام کی تصدیق کرتی ہو۔ اگر مولانا کوئی متعین مثال پیش کریں تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے اور ہم اس کے سدباب کی ہر کوشش کریں گے۔"[1]

تیسری شکایت کے جواب میں گذارش ہے کہ اس معاملے میں حقیقت سے زیادہ ہمارے مخالفین کے احساس کمتری کو دخل ہے۔ جماعت کے آدمی جب علماء حضرات کے سامنے دین کے وہ بدیہی تقاضے پیش کرتے ہیں جو انھوں نے جماعت کے لٹریچر سے سمجھے ہیں تو ان حضرات کے دل کو سخت چوٹ لگتی ہے کہ یہ دیکھو، یہ ہمیں دین سمجھانے آئے ہیں (اس سبب) انھیں یہ بدگمانی ہو جاتی ہے کہ جماعت اسلامی والے اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور دوسروں کو علم سے عاری خیال کرتے ہیں۔ اس کے سدباب کے لئے ابتدا ہی میں ہم نے کارکنوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ علماء اور مشائخ کے طبقے میں وہی لوگ جائیں جو اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اب ہم نے پھر سختی کے ساتھ ہدایات جاری کر دی ہیں کہ ان حضرات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔"[2]

چوتھے اعتراض کے جواب میں خلاصے کے طور پر اپنے موقف کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے ۔۔۔

"بہرحال جماعت اسلامی کا موقف اس معاملہ میں یہ ہے کہ اس امت کے ہر دور میں مصلحین و مجددین پیدا ہوتے اور دین کو نکھارتے رہیں گے لیکن وہ معصوم نہیں ہوں گے بلکہ ان سے ان کے کام میں مختلف قسم کی اجتہادی فروگذاشتیں بھی صادر ہو سکیں گی اور یہ چیز ان کی شان مصلحت اور مجددیت میں

---

[1] امین احسن اصلاحی، جماعت اسلامی کے خلاف قرارداد جرم، مرکزی مکتبۂ اسلامی دہلی ص ۱۸

[2] ایضاً ص ۱۹

کوئی فرق پیدا کرنے والی نہیں ہوگی ان کے ظاہرین علی الحق ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ معصوم ہوں بلکہ صرف یہ بات کافی ہے کہ وہ متبع ہو، اور اسلام میں جاہلیت کے داخل کرانے والے نہ ہوں۔"[1]

اسی طرح دوسرے تمام اعتراضات کا جواب بھی مولانا امین احسن اصلاحی ندوی نے پوری وضاحت اور بہتر استدلال کے ساتھ دیا ہے۔

جماعت اسلامی کے بارے میں بعض سیاسی قائدین، کچھ سیاسی اور سماجی پارٹیوں اور ارباب حکومت کی جانب سے جو غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور ہندوستان کے عوام کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں اس کے تدارک کے لئے بھی جماعت اور اس کے ذمہ دار برابر کوشش کرتے رہے ہیں تاکہ اہل ملک کسی غلط فہمی یا گمراہی کا شکار نہ ہوں۔

۱۔ جماعت اسلامی کسی بھی اعتبار سے فرقہ پرست جماعت نہیں ہے اس کی دعوت کی بنیاد وحدت اللہ اور وحدت آدم پر ہے۔ سارے انسان ایک خدا کے بندے ہیں۔ ایک ماں اور باپ کی اولاد ہیں، آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ نسل، ذات، رنگ اور علاقہ کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق غلط اور مہلک ہے۔

جماعت اسلامی ہند نے تقسیم کے بعد اپنے کام کے لئے جو لائحہ عمل طے کیا تھا اس کی سب سے پہلی دفعہ یہ تھی ـــــ

سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اس قومی (فرقہ وارانہ) کشمکش کا خاتمہ کیا جائے جو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اب تک برپا رہی ہے (دستور جماعت اسلامی ہند ۱۹۴۹ء)[2]

---

[1] امین احسن اصلاحی ندوی، جماعت اسلامی کے خلاف قرارداد جرم ص ۲۳

[2] شعبہ تنظیم مرکزی مکتبہ اسلامی، جماعت اسلامی ہند کیا ہے اور کیا نہیں ہے ص ۳، ۴

۲۔ جماعت اسلامی اول روز سے مسلم حکومت اور اسلامی حکومت میں فرق کرتی آئی ہے وہ مسلم حکومت کی نہیں اسلامی حکومت کی قائل ہے۔ وہ اسلامی اصولوں کی سربلندی چاہتی ہے، اس لئے کہ ـــــ

- اسلام اللہ کا بھیجا ہوا دین ہے جو بلا استثنا تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے آیا ہے۔
- یہ دین نوع انسانی کے دنیوی مسائل کے حل کے لئے بہترین نظام زندگی ہے۔
- یہ دین پوری انسانی زندگی پر حاوی ہے اور فرد، سماج اور سیاست، سب کی اصلاح اور ترقی پذیر تعمیر اس دین کی پیروی میں مضمر ہے۔

اس حقیقت کو جماعت کے دستور میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :

جماعت اپنے نصب العین کے حصول کے لئے تعمیری اور پرامن طریقے اختیار کرے گی یعنی وہ تبلیغ و تلقین اور اشاعت افکار کے ذریعہ ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لئے رائے عامہ کی تربیت کرے گی[۱]

۳۔ کہا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کے نظریات ملک کی اجتماعی زندگی کے لئے تباہ کن ہیں۔ ابھی چند سطر اوپر ہم نے بتایا تھا کہ عصر حاضر کا جوہر کیا ہے اور یہ بھی عرض کیا تھا کہ یہ سب کچھ اسلامی تعلیمات میں بھی موجود ہے۔ پھر کس طرح یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کی پیروی اور اس کی دعوت و تبلیغ سے ملک کی اجتماعی زندگی تباہ ہو جائے گی[۲]

---

[۱] شعبۂ تنظیم مرکزی مکتبہ اسلامی، جماعت اسلامی ہند کیا ہے اور کیا نہیں ہے ص ۱۵، ۱۶

[۲] " " " " " " ص ۱۹

۴۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ جماعت اسلامی سیکولرازم، جمہوریت اور سوشلزم کی ہر معنی میں نفی کر لی ہے۔ سیکولرازم کا اگر یہ مفہوم ہے کہ حکومت تمام انسانوں کو یکساں شہری کے حقوق دے اور فرقہ، نسل، ذات، زبان اور مذہب کی بنیاد پر ان میں کوئی تفریق روا نہ رکھے۔ جماعت اسلامی نے اس مفہوم کی کبھی مخالفت نہیں کی ہے۔[1]

اس طرح جماعت اسلامی جمہوریت کی بھی مخالف نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں آمریت اور فسطائیت کے بجائے جمہوریت ہے مگر یہ جمہوریت مطلق العنان و بے اخلاق جمہوریت نہیں۔ دین و اخلاق کی پابند جمہوریت ہے۔[2]

اور اگر سوشلزم کا مطلب سماجی انصاف ہو جیسا کہ دستور ہند کے "ابتدا" میں کہا گیا ہے یعنی یہ کہ عوام کو یکساں معاشی مواقع حاصل ہوں سرمایہ دارانہ استحصال کا خاتمہ ہو افراد اور طبقات کے درمیان معاشی تفاوت بڑھنے کے بجائے کم ہوتا چلا جائے اور بحیثیت مجموعی ملک کی معاشی سطح بلند ہو اور ملک کے عوام خوش حالی سے ہم کنار ہو جائیں تو یہ پسندیدہ اور مطلوب چیز ہے اس کی (جماعت نے) کبھی مخالفت نہیں کی ہے۔[3]

۵۔ اس طرح جماعت اسلامی ہند کے غیر جمہوری اور فسطائی ہونے کی بات ہے یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جسے جماعت کے دستور، اس کی پالیسی و پروگرام اور اس کی ورکنگ کی ہوا نہ لگی ہو۔ نظام جماعت کے تحت اس کی پہلی دفعہ کا پہلا جملہ یہ ہے۔

---

[1] شعبۂ تنظیم، جماعت اسلامی کیا ہے اور کیا نہیں ہے ص ۱۹

[2] " " " " ص ۲۰

[3] " " " " ص ۲۴

"جماعت اسلامی ہند کا نظام شورائی (جمہوری) ہوگا۔"[1]

۶۔ جماعت اسلامی ایک خفیہ تنظیم ہے اس کے عزائم، اس کی علمی سرگرمیاں اس کا نظم سب خفیہ نوعیت کا ہے ـــــ یہ ایک کھلا ہوا بہتان ہے۔ جماعت اسلامی کسی معنی میں خفیہ جماعت نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی جس قدر اعلانیہ جماعت ہے ہندوستان میں شاید ہی کوئی جماعت اتنی اعلانیہ ہو۔[2]

۷۔ جماعت اسلامی پر یہ بھی ایک الزام ہے کہ وہ ملک کے دستور کو تسلیم نہیں کرتی جبکہ جماعت اسلامی نے دستور کے سلسلہ میں اپنے موقف کی وضاحت "تحریک اسلامی ہند" میں ان الفاظ میں کی ہے۔

عام ملکی قوانین کی عملی پابندی کا مسلک اس نے کسی مصلحت یا سیاسی ضرورت کی بنا پر نہیں اختیار کیا ہے بلکہ خود اسوۂ انبیاء ہی کی روشنی میں اختیار کیا ہے بلکہ اس اسوے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غلط نظام جب تک قائم و نافذ ہو اس وقت تک اس کے عام قوانین کی عملی پابندی سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔[3]

۸۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کی تقسیم سے پہلے دوسری آل انڈیا جماعتوں کی طرح جماعت اسلامی بھی پورے ملک میں ایک تھی اور اس وقت اس کے امیر (صدر) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ تقسیم ملک کے بعد مسلم لیگ کمیونسٹ پارٹی اور جمیعۃ العلماء وغیرہ جماعتوں کی طرح جماعت اسلامی بھی دو الگ الگ جماعتوں، جماعت اسلامی ہند اور جماعت اسلامی

---

[1] شعبۂ تنظیم، جماعت اسلامی ہند کیا ہے اور کیا نہیں ہے ص ۲۶

[2] " " " " ص ۲۷

[3] " " " " ص ۲۸

پاکستان میں تقسیم ہوگئی۔

جماعت اسلامی ہند کے امیر (صدر) مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی منتخب کیے گئے۔ اس وقت سے یہ دونوں بالکل الگ تنظیمیں ہیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی علمی یا آئینی تعلق نہیں ہے۔ رہا مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تصنیفات کی اشاعت و مطالعہ کا مسئلہ تو وہ کچھ جماعت اسلامی ہند کے افراد تک محدود نہیں ہے ان تصنیفات کا دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ایک عظیم اسلامی مفکر کی حیثیت سے پورے عالم اسلامی میں ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

یورپ اور امریکہ تک میں انھیں یہی مقام حاصل ہے۔

خلاصۂ کلام

اس میں شک نہیں کہ یہ تاریخ کا اٹل قانون ہے کہ جو مصلح دینی اور فکری اعتبار سے جتنا زیادہ قوی ہوگا اتنی ہی قوت اور ہنگامہ آرائی کے ساتھ اس کی مخالفت کی جائے گی۔

اور مولانا صدرالدین اصلاحی کے بیان کے مطابق کہ تاریخ کا بیان ہے کہ آج تک کوئی بھی انقلابی تحریک مخالفتوں سے بچ کر اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکی ہے اور "قدیم" سے اندھی محبت کی عام انسانی نفسیات کے پیش نظر ایسا متوقع بھی نہیں ہونا چاہیے ـــــ اسلامی تحریکوں بالخصوص انبیائی دعوتوں کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ انھیں ایک دو نہیں بلکہ بے شمار مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اور جیسی سخت اور ہمہ جہتی مخالفت اُن کی کی گئی تھی، اُس کی نظیر دوسری جگہ ڈھونڈنے سے نہیں ملتی ـــــ فطری طور پر ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ اسلامی تحریک دعوتی دنیا کی وہ واحد تحریک ہوتی ہیں جو صحیح معنوں میں "انقلابی" ہوتی ہیں، دوسری کسی بھی تحریک کے سامنے انسانی زندگی میں اتنا بنیادی اور اتنا ہمہ گیر تغیر لانا ہرگز نہیں ہوا کرتا جتنا کہ ان (اسلامی) تحریکوں اور دعوتوں کے سامنے ہوا کرتا ہے[1]

---

[1] مولانا صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند ص ۱۵۳، ۱۵۴

لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایک انسان یا انسانوں کی جماعت غلطیوں اور کوتاہیوں سے پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی اور انبیاء علیہم السّلام کے علاوہ کوئی بھی فرد یا جماعت خطاؤں سے پاک نہیں ہوسکتے چاہے وہ اسلامی جماعت یا اس کا بڑے سے بڑا ذمہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ اس صورت حال کے پیش نظر ردّ عمل کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر طے کرنا ہوگا کہ جماعت اسلامی ہند' اس کے ذمہ دار اور عام ارکان کس مقام اور منصب کے حامل ہیں۔

چنانچہ یہ کہنا پوری طرح حقیقت پر مبنی ہے کہ بانیٔ جماعت سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ محض ایک شخص نہیں —— ایک عہد' ایک تاریخ تھے۔ برصغیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے نقیب تھے۔ انھوں نے ساری عمر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جہاد میں گذاری اور وہ اپنے پیچھے ایک بہت بڑا تحریری اثاثہ چھوڑ گئے ہیں۔ جو رہتی دنیا تک اسلامی دنیا کو روشنی فراہم کرتا رہے گا۔ یہی وہ ذخیرہ علم ہے جس کے باعث نئی نسل کی ایک بڑی اکثریت دین۔ سلام سے دل بستگی پیدا کرچکی ہے اور جس نے فکری جہاد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے یہاں منفی سوچوں کا رُخ بدل کر رکھ دیا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ اس دور کے ایک ایسے مفکر تھے جنھوں نے دینِ اسلام کو جدید دنیا کے سامنے بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا اور نتیجہ کے طور پر ایک ایسی تحریک وجود میں آئی جو بیسویں صدی کے غلط اور ملحدانہ نظریات کے سامنے ڈھال بن گئی۔ انھوں نے ذہنی انسانی کے کرب کو سمجھنے اور پھر اس کی ذہنی آبیاری کے لئے اسلام کے فکری اور عملی تقاضوں کو سمجھنے پر زور دیا۔

یہ اسلامی تحریک کسی مخصوص طبقہ یا چند افراد کے لئے برپا نہیں

کی گئی۔ یہ تحریک اپنے اعلیٰ ارفع مقاصد کے ساتھ ساتھ عام آدمی سے تعلق رکھنے والی تحریک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک نے ملک کے گوشے گوشے میں پھیل کر ہر رنگ و نسل اور ہر عمر کے انسان سے اپنا تعلق جوڑ رکھا ہے اور اس تحریک سے وابستہ ایک عام انسان بھی اسلام سے اتنی واقفیت ضرور حاصل کر چکا ہے کہ اسلامی اور غیر اسلامی نظریات میں کیا فرق ہے۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے تعلق سے اس پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ دوسرے معنی میں اسلام اور اسلامی تعلیمات جو صدیوں سے مسجدوں خانقاہوں اور دینی مدارس کی تنگ چار دیواری کے اندر محبوس تھی، اور جن کو ایک مخصوص طبقہ نے اپنی اجارہ داری میں لے رکھا تھا۔ تحریک اسلامی نے زندگی کی عظیم شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے۔ اور آج مسلمانوں کا ہر طبقہ اور گروہ اس حقیقت کا اظہار کرنے لگا ہے کہ اسلام چند مراسم کا نام نہیں ہے بلکہ وہ پوری انسانی زندگی کا نظام ہے اور اسلام باطل نظریات سے خوف کھا کر تنگ چار دیواری میں قید ہونے کے لئے نہیں بلکہ باطل افکار پر کڑی چوٹ لگا کر اس دنیا میں غالب ہونے کے لئے آیا ہے۔

لیکن ـــــ

مرید سادہ تو رو رو کر ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق

تحریک اسلامی قرآن و سنت کی بنیاد پر جن اعلیٰ و ارفع مقاصد کے ساتھ وجود میں آئی تھی اور اپنے نیک نفس اور مخلص کارکنوں کے باعث ایک عرصہ تک اپنے صحیح راستے اور صحیح سمت میں سفر کرتی رہی اور جس نے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو زندہ اور متحرک اسلام سے وابستہ کیا۔ اب اپنی افادیت کھو چکی ہے۔ جماعت اسلامی ایک گروہی جماعت میں تبدیل ہو چکی ہے مخلص کارکنان اب اِکا دُکا نظر آتے ہیں۔ نفس پرستوں اور طالع آزماؤں کا زور شور ہے۔

جماعت اسلامی کا دستور اور پالیسی و پروگرام تقریباً اب بھی وہی ہے لیکن اب ان کے معنی اور مفہوم میں تبدیلی آگئی ہے اب بیشتر ذمہ دار اور ارکان تعمیر سیرت و کردار کے بجائے تعمیر ذات کے لئے مصروف نظر آتے ہیں۔ جماعت اب چند معزز حضرات کی ذاتی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنتی جارہی ہے۔

سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کی دولت نے جہاں مشرق وسطیٰ میں اخوان المسلمون کی سرگرمیوں کو ٹھنڈا کیا ہے وہیں جماعت اسلامی ہند بھی اس خداداد دولت کے پھیر میں آچکی ہے۔ ملک کی سیکولر سیاست کبھی شجر ممنوعہ تھی، ارکان جماعت کے لئے الیکشن میں ووٹ دینے پر پابندی تھی۔ اب ووٹ دینے سے آگے بڑھ کر اس میں عملاً شرکت کی راہیں تلاش کی جارہی ہیں۔

ارکان جماعت میں سیرت و کردار کا انحطاط، جوش کار اور جذبۂ ایثار میں کمی اور باہمی محبت و اخوت کا فقدان اور جماعتی عصبیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

غرض تحریک اسلامی اب پوری طرح "جماعت اسلامی" میں تبدیل ہو چکی ہے ممکن ہے آنے والے دنوں میں جماعت کو کچھ مخلصین مل جائیں اور یہ دوبارہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرلے ـــــ اب تو ـــــ

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

باب دوم

تبلیغی جماعت

بانیٔ جماعت حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ

اسلام جہاں دوسری بہت سی خوبیوں کا حامل دین ہے وہیں اس دین کو اللہ نے ایک ایسی خوبی سے بھی نوازا ہے کہ جس سے دوسرے سارے ادیان محروم ہیں اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس دینِ حنیف کو ہر دور میں ایسے زندہ اور متحرک اشخاص عطا فرماتا رہتا ہے جو اسلامی تعلیمات کو زندہ رکھنے اور انسانی زندگیوں میں جاری وساری رکھنے کی صلاحیت سے پوری طرح بہرہ ور ہوتے ہیں۔

"اس رواں دواں اور سدا جوان زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہے اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی حقائق وعقائد" پر ہے مگر وہ زندگی سے پُر ہے اور حرکت اس کی رگ وپے میں بھری ہوئی ہے — اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں اس دنیا کی رہنمائی کرسکے اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے۔" [1]

"چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اس دین کی حامل) امت کے لئے دو

---

[1] سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ ص ۱۰۹

انتظامات فرمائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل ومکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائیں ہیں جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں اور ان میں ہر زمانے کے مسائل ومشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے (اور اس وقت تک کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے۔"[1]

یہ محض ایک اتفاقی امر نہیں ہے بلکہ یہ خدائے کارساز کا ایک منصوبہ ہے کہ جس زمانے اور جن حالات میں جس صلاحیت وقوت کے حامل انسان کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ ایسا ہی باصلاحیت اور مخلص انسان اللہ تعالیٰ اس امت کو عطا کرتا ہے۔

آج تبلیغ کے نام سے جو ایک عظیم حرکت جاری ہے اور جس کے سبب لاکھوں انسانوں میں اپنے دین پر عمل آوری کے لئے ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا ہے۔ اس کی ابتدا اللہ کے فضل وکرم سے ایک ایسے انسان کی مرہون منت ہے جو جسمانی اعتبار سے زیادہ متاثر کن شخصیت نہیں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی حیرت انگیز صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازہ تھا جس کے سبب وہ موجودہ دور میں ایک نمایاں اور منفرد شخصیت نظر آتی ہے اور جس کو لوگ مولانا محمد الیاس رحؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

---

[1] سید ابوالحسن علی ندوی   تاریخ دعوت وعزیمت۔ مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات، ندوۃ العلماء لکھنو   ص ۹۰۸

ابتدائی حالات

"حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق خاندان ولی اللہی سے تھا۔ یہ وہی مشہور و معروف خاندان ہے جس نے ہندوستان میں آل تیمور کی غلط سیاست سے اسلام کو پہنچائے گئے نقصان کا تدارک اور اصلاح کا کام بتوفیق الٰہی کیا۔ مولانا الیاسؒ نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں زندگی میں ہماہمی پیدا کرنے کے لئے لوگوں کو فرضی واقعات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ کئی پشتوں سے ان کے خاندان اور رشتہ داروں میں علماء اور مجاہدین کی شاندار روایات چلی آرہی تھیں"[1]

مولانا محمد الیاس صاحبؒ اپنے وقت کے ایک بزرگ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ کے یہاں ۱۳۰۳ھ (مطابق ۱۸۸۵ء) کو پیدا ہوئے۔ آپ کا تاریخی نام الیاس اختر تھا۔ مولانا کا بچپن اپنے ننھیال کاندھلہ اور بعد ازاں اپنے والد مرحوم کے ساتھ بستی حضرت نظام الدین (دہلی) میں گزرا۔

"اس وقت کاندھلہ کا یہ خاندان دین داری کا گہوارہ تھا۔ مرد تو مرد عورتوں کی دین داری، عبادت گزاری، شب بیداری ذکر و تلاوت کے قصے اور ان کے معمولات اس زمانہ کے پست ہمتوں کے تصور سے بھی بلند ہیں"[2]

آپ کی نانی صاحبہ آمی جی محترم مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی رابعہ سیرت صاحبزادی اپنے وقت کی نہایت عابدہ، زاہدہ اور خدارسیدہ خاتون

---

[1] وحیدالدین خاں۔ تبلیغی تحریک، مکتبہ الرسالہ دہلی ص ۹

[2] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت ص ۴۴

تھیں اور آپ کی والدہ محترمہ صفیہ بی بڑی جید حافظہ تھیں۔

"محترمہ صفیہ بی کا معمول تھا کہ رمضان المبارک میں روزانہ ایک قرآن شریف اور مزید دس پارہ پڑھ لیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ غیر رمضان میں خانہ داری کے کاموں کے ساتھ ساتھ اور درود و اذکار کے معمولات بھی اتنے زائد تھے کہ آج ہم لوگ ان کا تصور نہیں کر سکتے۔ انہیں جیسی ماں اور نانی کی گود میں مولانا محمد الیاس صاحب کی شیر خواری کا زمانہ گزرا ہے۔"[1]

مولانا محمد الیاس صاحب نے خاندانی دستور کے مطابق پہلے قرآن پاک حفظ کیا اس کے بعد ابتدائی دینی تعلیم دہلی میں اپنے والد محترم سے اور کاندھلہ میں مولانا حکیم محمد ابراہیم کاندھلوی سے حاصل کی، لیکن کبھی والد کے پاس دہلی میں رہنا اور کبھی والدہ کے پاس کاندھلہ میں قیام کرنا۔ اس میں وقت زیادہ صرف ہوا اور تعلیم کم حاصل ہوئی، چنانچہ مولانا کے بڑے بھائی صاحب مولانا محمد یحییٰ صاحب، والد صاحب کی اجازت سے آپ کو اپنے ہمراہ گنگوہ لے گئے۔

"۱۳۱۴ھ کا سال تھا۔ گنگوہ اس وقت صلحاء اور علماء کا مرکز تھا جو شمع رشیدی پر پروانہ وار نثار ہو رہے تھے۔ حضرت مولانا الیاس صاحب کو ان علماء کی صحبت شب و روز میسر آنے لگی خود حضرت گنگوہی (رشید احمد گنگوہی) کی محبت و شفقت حضرت مولانا کے اندر دینی جذبات کی پرورش اور دین کی صحیح سمجھ اور سلیقہ پیدا کر رہی تھی۔"[2]

اس پاکیزہ اور نورانی ماحول میں مولانا محمد الیاس صاحب کتابی تعلیم اپنے بڑے

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی، مکتبہ اسلامی لکھنؤ ص ۱۳۲

[2] ایضاً، ص ۱۳۳، ۱۳۴

بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب سے حاصل کرتے اور صحبت و تربیت محترم رشید احمدؒ اور ان کے توسط سے دوسرے مشائخ کی پاتے۔ اس طرح عمر کا وہ حصہ جو تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا بہترین زمانہ ہوتا ہے اس مبارک ماحول میں گزرا۔

"۱۳۲۶ھ میں حدیث کی تکمیل کے لئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے حلقۂ درس میں دیوبند جاکر شریک ہوئے اور ترمذی و بخاری شریف کی سماعت کی اور بعد میں اپنے فاضل یگانہ بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب سے حدیث کا دورہ کیا۔ یہ دورہ چار مہینے میں مکمل ہوگیا"[1]

شوال ۱۳۲۸ھ (مطابق ۱۹۱۰ء) میں بہ حیثیت استاد مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا تقرر مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں ہوا۔ لیکن یہ ایک عارضی تقرر تھا۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کو آپ سے ایک دوسرا ہی کام لینا تھا۔ اس لئے آپ کا اس کام کی تربیت حاصل کرنا ضروری تھا۔

"پہلے ذکر آچکا ہے کہ آپ کے والد صاحب دہلی کے پاس بستی نظام الدین میں رہتے تھے۔ وہاں انھوں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ جاری کیا تھا والد صاحب کے انتقال کے بعد آپ کے بھائی مولانا محمد صاحب نے اس مدرسہ کو سنبھالا۔ ۱۳۲۶ھ میں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس وقت جب آپ (مولانا محمد الیاس صاحبؒ) اس سلسلے میں نظام الدین گئے تو وہاں لوگوں نے اصرار کیا کہ اب یہیں قیام کریں اور والد اور بھائی کی جگہ جو ان کی وفات سے خالی ہوئی ہے اس کو پُر کریں۔ آپ نے اس درخواست کو منظور کر لیا"[2]

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی، مکتبہ اسلامی لکھنؤ ص ۱۳۵

[2] مولانا وحید الدین خاں، تبلیغی تحریک، مکتبہ الرسالہ نئی دہلی، ص ۱۰

تبلیغ کی ابتدا

اس زمانے میں بستی نظام الدین بالکل غیر آباد تھی۔ دور دور تک کسی انسانی آبادی کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف جنگل ہی جنگل تھا۔ بس لے دے کر ایک چھوٹی سی پختہ مسجد، ایک بنگلہ، ایک کوٹھری اور درگاہ کے جنوب میں درگاہ سے متعلق لوگوں کی مختصر سی آبادی تھی۔ یہاں تعلیم کی غرض سے کچھ غریب میواتی طلباء مقیم تھے۔

اس بستی سے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی زندگی کا وہ اہم دور شروع ہوتا ہے جبکہ آپ کو تبلیغی کام کرنے کی جانب توجہ ہوئی۔ تبلیغ کے ابتدائی محرک وہ لوگ بنے جو میواتی قوم کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور دہلی کے جنوب کا وہ علاقہ جو میوات کے نام سے جانا جاتا ہے اس سے تعلق رکھتے ہیں۔

"بستی نظام الدین عین میوات کے دہانے پر واقع تھی[1] اور یہاں کے مدرسہ میں ان کے کچھ بچے پڑھتے تھے۔ اس کے ساتھ مولانا الیاسؒ صاحب کے والد بزرگوار اور آپ کے بھائی صاحب مرحوم کے تعلق سے کچھ میواتی عقیدت مند ہو گئے تھے۔ وہ آتے جاتے رہتے تھے مولانا الیاس صاحبؒ نے میواتیوں کی افسوسناک حالت دیکھی تو ان کے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ فطری طور پر آپ کا ذہن ابتداءً اس طرف گیا کہ ان کی اصلاح کا حقیقی ذریعہ دینی

---

[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ دہلی شہر کے مقابلہ میں یہ علاقہ میوات سے زیادہ قریب ہے۔

تعلیم کا حصول ہے (اس سبب سے) آپ نے خود میوات کے اپنے علاقہ میں دینی مکاتب و مدارس قائم کرنے کی تحریک چلائی۔"[1]

چنانچہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اس غرض سے میوات تشریف لے گئے۔

"اس طرح مکاتب (کے قیام) کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس پہلے سفر میں دس مکتب قائم کئے اور کچھ ہی مدت میں کئی سو مکتب قائم ہو گئے جن میں قرآن مجید کی تعلیم ہوتی تھی۔ لیکن اس طرز (اصلاح) سے میو قوم میں صرف جزئی اصلاح ہوئی اور جس نتیجہ کے حضرت مولانا آرزومند تھے وہ برآمد نہ ہوا۔"[2]

دراصل مسئلہ ایک ناخواندہ اور اپنے دین سے بالکل بے تعلق میو قوم کی عام دینی بیداری کا تھا۔ میوائیوں کو صرف اس قدر معلوم تھا کہ وہ مسلمان ہیں ورنہ ان کے اندر اسلام سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ نام اور کام سارے کے سارے ہندوانہ تھے۔ البتہ ان کے یہاں سید سالار مسعود غازی کا جھنڈا ضرور اٹھتا تھا۔ ان لوگوں کو کلمہ تک یاد نہیں تھا۔ روزہ نماز سے بالکل ناآشنا اور چوری ڈکیتی اور رہزنی ان کا پیشہ تھا۔ غرض علم اور تربیت حاصل نہ ہونے کے باعث میوائی لوگ جنگلی قبائل کی طرح پر زندگی گزار رہے تھے۔

"حضرت مولانا کو میوات کے لوگوں سے گہرا تعلق ہو چکا تھا حضرت مولانا نے جا بجا میوائیوں کے نزاعات اور جھگڑوں کو اپنی حکمت اور روحانیت سے ختم کیا تھا۔ جس سے یہ میوائی حضرت مولانا کو محبوب ترین ذات سمجھنے لگے تھے۔ (پھر) حضرت

---

[1] مولانا وحید الدین خاں، تبلیغی تحریک، مکتبہ الرسالہ نئی دہلی، ص ۱۱

[2] سید محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا محمد یوسف، ص ۱۴۰

مولانا اب اس یقین پر پہنچ چکے تھے کہ نہ صرف بچوں کی تعلیم سے کوئی دینی انقلاب آسکتا ہے۔ نہ خواص اور عمائد کی اصلاح سے کوئی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے بلکہ ایک عوامی دینی تحریک کی ضرورت ہے اور یہی موجودہ فساد اور دینی بے راہ روی کا صحیح علاج ہے۔" [۱]

اس سلسلہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"۱۳۴۴ھ میں دوسرے حج کے موقع پر مدینہ منورہ کے قیام کے دوران مولانا الیاس صاحبؒ نے محسوس کیا کہ انھیں حکم دیا جا رہا ہے کہ ہم تم سے کام لیں گے۔"

چنانچہ حج سے واپسی کے بعد مولانا نے تبلیغی گشت شروع کر دی۔ آپ نے دوسروں کو بھی دعوت دی کہ عوام میں نکل کر دین کے اولین ارکان و اصول (کلمہ توحید و نماز) کی تبلیغ کریں۔ لوگوں کے کان اس دعوت سے نا آشنا تھے۔ دین کی دعوت کے لئے عامیوں کا زبان کھولنا بڑا پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ چند آدمیوں نے بڑی شرم و حیا اور رکاوٹ کے ساتھ یہ خدمت انجام دی۔" [۲]

دین کی تبلیغ کا کام اور اس کے لئے اپنے وقت کو فارغ کرنا میواتیوں کے لئے بالکل اجنبی اور غیر مانوس تھا۔ پھر جن کا حال یہ تھا کہ اپنا بچہ مقامی مدرسہ میں دینا گوارا نہیں وہ خود گھر اور اپنی بستی سے باہر نکلنے کے لئے وقت دیں اور دین سیکھیں اور سکھائیں، بہت مشکل کام تھا۔ بستی سے باہر جانے کے لئے کوئی آمادہ اور تیار نہ تھا لیکن مولانا محترم کا خلوص، اپنے اللہ سے دعائیں

---

[۱] سید محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی، مطبوعہ مکتبہ اسلام لکھنؤ ص ۱۴۰

[۲] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت ص ۸۰

اور آہ و زاری، مسلسل کوشش، غرض حالات میں کچھ تبدیلی آئی۔ یہ ناخواندہ اور سرکش قوم کسی حد تک رام ہوئی اور سارے میوات میں دین کے نام پر ایک حرکت اور بیداری پیدا ہوئی۔

انھیں ایام میں قصبہ نوح میں ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر مولانا الیاس صاحب نے لوگوں سے مطالبہ کیا کہ جماعتیں بنا کر باہر نکلا جائے اور تبلیغ دین کا کام کیا جائے۔ لوگوں نے کچھ مہلت مانگی۔ اس کے بعد جماعت کی تشکیل ہوئی اور پھر ہر جمعہ کے دن مولانا محترم کی موجودگی میں جماعتیں تشکیل پاتیں اور آس پاس کے علاقوں میں نکل جاتیں۔ گشت اور اجتماع کرتیں اور مقامی لوگوں کو باہر نکلنے کے لئے آمادہ کرتیں۔

تبلیغ کے اس ابتدائی کام نے رفتہ رفتہ ترقی کی اور سارے میوات کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"میواتیوں کی کثیر تعداد آپ (مولانا الیاس صاحبؒ) کے ساتھ ہو گئی۔ ان کے قافلے جوق در جوق اپنے علاقوں سے نکل کر نظام الدین، سہارن پور اور دوسرے مقامات کو جانے لگے اور ہفتوں اور مہینوں تک ان (میواتیوں) کی زندگیاں دینی تعلیم و تربیت کے سائے میں گزرنے لگیں۔"[1]

اس طرح میواتیوں میں بڑی نمایاں تبدیلی آنے لگی۔ اب وہ ہفتہ عشرہ کے بعد گھر واپس آتے تو جس طرح وہ خود بدل گئے تھے، اپنے ماحول کو بھی اسی طرح بدلنے کی کوشش اور جد وجہد کرتے۔ ان کی اس کوشش کے نتیجے میں میوات کے حالات بدلنے لگے۔

"پورے علاقے میں دین کی رغبت پیدا ہو گئی جہاں میلوں

---

[1] مولانا وحید الدین خاں، تبلیغی تحریک ص ۱۳

تک مسجد نظر نہ آتی۔ وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بن گئیں۔ مکاتب و مدرسہ نہ صرف تعداد میں بڑھے بلکہ اب انھیں واقعی میوؤں کے درمیان دینی تعلیم وتربیت کے ادارے کا مقام حاصل ہوگیا۔ غیر اسلامی وضع ولباس کی جگہ اسلامی وضع ولباس ہر طرف نظر آنے لگا۔ ہاتھوں کے کڑے اور کانوں کے مرکیاں اترنے لگیں۔ بے کہے لوگوں نے داڑھیاں رکھنا شروع کردیں۔ تقریبات سے مشرکانہ رسوم کا خاتمہ ہوگیا۔ سود خوری کم ہوگئی۔ شراب نوشی کا وجود مٹ گیا۔ قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کی واردات میں کمی آگئی۔ گاؤں کے گاؤں ایسے ہوگئے جہاں ایک بچہ بھی بے نمازی نہیں تھا۔ ان کی معاشرت، ان کے برتاؤ، ان کے لین دین، غرض ہر چیز میں فرق آگیا۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک بزرگ ستمبر ۱۹۲۹ء میں میوات کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک جاہل میواتی کو روک کر پوچھا "یہ تبلیغی دورے تم لوگ کس لیے کر رہے ہو؟" اس نے جواب دیا ــــ "ہم جہالت میں پڑے ہوئے تھے نہ ہم کو خدا کی خبر تھی نہ رسول کی، اس مولوی کا خدا بھلا کرے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں تک بھی یہ نعمت پہنچائیں جو ہمیں ملی ہے"۔[1]

ایک سرکش اور ناخواندہ قوم میں اس قدر زبردست تبدیلی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ایک انسان کو بدلنا، اس کے عادات و اطوار میں تبدیلی لانا ایک انتہائی دشوار کام ہے کجا کہ پوری قوم میں ایک انقلابی تبدیلی کا آجانا بس اللہ تعالیٰ

---

[1] مولانا وحیدالدین خاں، تبلیغی تحریک، ص ۱۳، ۱۴

کے خصوصی فضل وکرم اور کام کرنے والے کے حسن نیت اور خلوص پر مبنی ہے۔
چنانچہ یہ دونوں واقعات اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ مولانا الیاس صاحبؒ نے کام کرنے اور میواتیوں میں اللہ کا سچا دین پہنچانے کا کیا طریقہ اور انداز اختیار کیا تھا۔

'ایک مرتبہ دوران تبلیغ از راہ محبت ایک شخص پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ آگ بگولہ ہوگیا اور کہنے لگا کہ اگر اب کی تم نے ہاتھ لگایا تو میں لٹھ مار دوں گا۔ آپ نے فوراً اس کے پاؤں پکڑ لئے اور فرمایا کہ ـــــ 'پاؤں کو نہیں کہا تھا' اس کے بعد اس کا غصہ کافور ہوگیا اور فوراً نرم پڑ گیا۔

اسی طرح ایک بار ایک میواتی پر تبلیغ کر رہے تھے کہ وہ بگڑ گیا اور آپ کو ایک گھونسا مار دیا۔ مولانا الیاس صاحبؒ دُبلے پتلے کمزور آدمی تھے۔ گھونسا کی تاب نہ لاکر زمین پر گر پڑے۔ کچھ دیر بعد ان کے حواس بجا ہوئے تو گرد جھاڑ کر اٹھے اور میواتی کا دامن پکڑ لیا اور کہا ـــــ "اچھا تم تو اپنا کام کر چکے، اب میری سنو۔" یہ دیکھ کر میواتی آپ کے قدموں پر گر پڑا اور بولا: "مولوی صاحب مجھے معاف کر دو، ورنہ میری بخشش نہیں ہوگی۔"[۱]

ان کے علاوہ اس طرح کے اور بھی بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ جن کی بنیاد پر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا الیاس صاحبؒ نے کیسے اپنے اخلاص محنت، جفاکشی اور اللہ پر مکمل یقین و اعتماد کے سہارے ایک دین سے ناواقف اور بے راہ رو قوم کو ہدایت اور سلامتی کے راستے پر ڈال دیا۔
مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے ۱۳۵۶ھ (مطابق ۱۹۳۷ء) میں آخری حج

---

[۱] مولانا وحیدالدین خاں۔ تبلیغی تحریک، ص ۱۳

کیا۔ ان دنوں تبلیغ کا کام دن ورات ترقی پر تھا۔ اب ہر لمحہ اور ہر گھڑی اسی فکر اور تگ و دو میں گذرتی کہ اللہ کا دین کسی طرح زیادہ سے زیادہ اللہ کے بندوں تک پہنچے چنانچہ ——

"مکہ معظمہ کے دوران قیام میں صبح و شام دونوں وقت جماعت تبلیغ کے لئے جاتی تھی اور حسب استطاعت انفرادی طور پر لوگوں کو تبلیغی باتوں پر آمادہ کرتی تھی۔ چند جلسے بھی ہوئے جن میں مولوی ادریس اور مولوی ظہور محمد صاحبان نے اردو میں تقریر کی۔ سننے والے مانوس اور قدردان ہونے لگے۔"[1]

"رفقاء حج کو مولانا کی تاکید تھی کہ عمرہ اور دوسری عبادات سے زیادہ تبلیغ کا اہتمام کریں کہ اس زمانہ اور اس مقام مقدس میں بالخصوص اس سے افضل کوئی عبادت اور عمل نہیں۔"[2]

مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں بھی تبلیغی سعی شروع ہوئی۔ انفرادی طور پر مختلف قسم کے لوگوں سے گفتگو اور مذاکرے رہے۔ اس مقصد کو لے کر دو مرتبہ قبا بھی جانا ہوا۔ وہاں ایک اجتماع میں مولانا نے تقریر بھی فرمائی۔ چند آدمی آمادہ بھی ہوئے۔ دو مرتبہ اس مقصد کے لئے احد بھی جانا ہوا۔ بدوؤں سے بھی بات چیت ہوئی تھی، بچوں کے کلمے بھی سنے جاتے تھے اور رباط میں بھی جانا ہوتا تھا۔ اس سفر کے دوران اس بات کا بھرپور اندازہ ہوا کہ ہندوستان کے مقابلے میں عرب میں تبلیغ کی زیادہ ضرورت ہے۔[3]

---

[1] مکتوب مولانا احتشام الحسن مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۸ء
بحوالہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت، ص ۹۳

[2] ایضاً ص ۹۳

[3] ایضاً ص ۹۴

پھر آپ حج سے واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔
مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو ایک بڑی فکر اب بھی لاحق تھی۔ تبلیغ کے سلسلہ میں جس قدر لوگ بھی آپ سے وابستہ ہوئے تھے وہ زیادہ تر ان پڑھ یا معمولی پڑھے لکھے لوگ تھے آپ کی شدید خواہش تھی کہ اس کام میں علماء حضرات اور جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی شرکت کریں اور خاص طور پر علماء اس کام کو خود سنبھالیں۔
"آخری بیماری میں ایک مرتبہ گہرے تاثر کے ساتھ فرمایا ——
کاش علماء اس کام کو سنبھال لیتے اور پھر ہم چلے جاتے۔" [1]
انسان اخلاص نیت کے ساتھ کوشش کرے اور اسے اپنے اللہ کی مدد حاصل ہو تو پھر کوئی آرزو اور کوئی کام ادھورا نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ کامیابی کی سیکڑوں اور ہزاروں راہیں پیدا کر دیتا ہے۔
اکثر نئی دہلی کے بعض معززین اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات خصوصاً جامعہ ملیہ کے بعض اساتذہ نیز ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب حضرت مولانا کی خدمت میں آتے اور حضرت مولانا ان کے سامنے بڑے جوش و تاثر کے ساتھ تقریر فرماتے [2]
اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف عربی مدارس کے علماء اور طلباء خصوصاً دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مظاہر العلوم سہارنپور، دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اپنے مقام پر کام شروع کیا ——
اور اہل علم و اہل مدارس نے اس طرف توجہ دی۔ حضرت مولانا اس کے لئے ہمیشہ بیقرار رہتے تھے کہ اہل علم حضرات

---

[1] مولانا وحید الدین خاں، تبلیغی تحریک ص ۱۶
[2] سید محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی ص ۱۴۹

اس کی طرف توجہ کریں۔ جب علمار نے توجہ کی تو حضرت مولانا نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔[1]

مولانا محمد الیاس صاحبؒ جسمانی اعتبار سے ہمیشہ سے نحیف تھے۔ اس پر دین کی تڑپ، اس کے غلبہ کی مسلسل کوشش، دن ورات کی محنت، ہمہ وقت کی مشغولیت اور بے آرامی آخر کار پیچش کے موذی مرض نے آگھیرا، روز بروز کمزوری اور نقاہت بڑھتی گئی۔ مولانا محترم بہت کمزور ہوگئے لیکن اشاعت دین کی تڑپ اور بیقراری ایسے وقت میں بھی موجود تھی اور اس حالت میں بھی تبلیغ دین کا کام پوری مستعدی کے ساتھ جاری تھا۔

"(آخری ایام میں) ضعف بہت بڑھ چکا تھا۔ نماز پڑھانے سے بھی معذور تھے لیکن جماعت میں دو آدمیوں کے سہارے تشریف لاتے تھے اور کھڑے ہوکر نماز پڑھتے تھے۔ کئی بار فرمایا کہ میں اس مرض سے جانبر نہیں ہوں گا ـــــ اہل زمانہ کی شکایت فرماتے کہ فروعی اور معمولی کاموں اور شاخوں اور پتوں میں اس قدر مشغول ہیں کہ اصلی اور بنیادی کام کے لئے وقت نہیں۔ ان ہی دنوں میں دو نہایت لطیف تقریریں فرمائیں جن میں بند لفظوں میں اس کا اظہار تھا کہ وقت آخر کچھ دور نہیں ہے اور اس میں بھی اللہ کے بڑے مصالح ہیں۔"[2]

بہر حال جو اس دنیائے فانی میں آیا ہے اسے ایک دن جانا ضروری ہے البتہ کچھ وہ لوگ ہوتے ہیں جو دنیا کا کیڑہ بن کے زندگی گزارتے ہیں اور اس فکر کے حامل ہوتے ہیں کہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست، اور اس طلسم رنگ و بو

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی، ص ۱۴۹، ۱۵۰

[2] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت ص ۱۳۷

کے ماحول میں کچھ ایسی ہستیاں بھی جنم لیتی ہیں جن کا ایک ایک پل اور ایک ایک لمحہ اپنے اللہ سے تعلق اور اس کے بندوں کی خیر خواہی اور بھلائی میں گزرتا ہے وہ ہمہ وقت اپنے آپ کو اس غم انگیز فکر میں گھلاتے رہتے ہیں کہ اس زمین پر بسنے والا ایک ایک انسان کسی بھی طرح آخرت کی تباہی و بربادی سے بچ جائے۔ انھیں اپنے لیے آرام و سکون کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ نہ انھیں بھوک پیاس ستاتی ہے۔ راتوں کو جاگنا، دن کو حصول مقصد کی لگن میں در در کی ٹھوکریں کھانا اور کبھی پست ہمت نہ ہونا، نہ صحت کی فکر نہ بیماری سے پریشانی یہی ایک دھن ایک لگن —— کیا خیریت اور کیا بے خیریت، خیریت تو جب ہے کہ جس کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں وہ کام ہو۔

الغرض مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا آخری وقت اب قریب تھا۔

"۱۱ر جولائی کی صبح کو آب زمزم پیتے ہوئے حضرت عمرؓ کی یہ دعا اللہ تعالیٰ سے مانگی کہ اے اللہ مجھے اپنے راستہ میں شہادت نصیب فرما" [1]

آخری شب میں پچھلے پہر اپنے صاحبزادے مولانا یوسف صاحب اور مولانا اکرام الحسن کو یاد فرمایا۔ پھر مولانا یوسف سے فرمایا ——

"یوسف آ مل لے، ہم تو چلے" اور صبح کی اذان سے پہلے جان جان آفریں کے حوالے کر دی۔

جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

حضرت مولانا کا انتقال ۲۱ر رجب ۱۳۶۳ھ (مطابق ۴۴ء۱۹) کو ہوا حضرت مولانا کے انتقال سے رنج و غم کی فضا چھا گئی اور ہر ایک نے انتہائی حزن و ملال

---

[1] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت ص ۱۶۷

کا اظہار کیا اور امت محمدیہ نے حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کے لئے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے زبان حال سے کہا ــــ

فَاذْهَبْ كما ذهبت غوادی مزنةٍ

أثنیٰ علیها السهل والساوعادُ

ترجمہ :۔ "بس آپ اس طرح جائیے جس طرح صبح کی بارش کے بادل برس کر جاتے ہیں کہ پہاڑی اور میدانی ہر طرح کی زمین ان بادلوں کی ثنا خواں ہوتی ہیں۔" ؎

مولانا محترم کے انتقال کے بعد اس تحریک کی ذمہ داری ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے کاندھوں پر آئی اور آپ کی بے پناہ کوششوں سے تبلیغی جماعت کی سرگرمیاں ہند و پاک سے نکل کر مغربی ممالک تک پہنچی اور اب دنیا کے لاکھوں انسان ہر سال تبلیغی اسفار اختیار کرتے ہیں۔

؎ سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی ص ۱۵۲

تبلیغی جماعت کے قیام کا پس منظر

ازلی اور ابدی حقیقتوں اور سچائیوں کا حامل دینِ اسلام جس کو اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کے کرۂ ارض پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی جاری فرمایا اور جس کی تکمیل اپنے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی پر فرمائی، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے :-

"آج کے دن میں نے تمھارے لئے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمھارے لئے پسند کر چکا۔" (المائدہ۔ آیت ۳)

اپنے پسندیدہ دین کو مکمل کرنے کے ساتھ ہی اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود ہی لیا ہے اور اس کی دونوں بنیادوں علم اور عمل یعنی قرآن اور سنّت رسولؐ کو قیامت تک کے لئے محفوظ فرما دیا ہے۔

"رہا یہ ذکر، تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔" (الحجر، آیت ۹)

اور ــــــ

"نبی کی زندگی میں مسلمانوں کے لئے بہترین نمونہ ہے۔"

چنانچہ ــــــ

"شروع ہی سے اسلام کے قلب وجگر اور اس کے اعصاب

پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لا سکتا ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں اسلامی روح اور اس کے نظامِ عقائد کے لئے سخت خطرہ تھیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لئے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کی یلغار بالکل کافی تھی۔ دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھو دیتا اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا ــــ لیکن اسلام ان سب داخلی و خارجی حملوں کو برداشت کر گیا اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی باقی رکھی بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں۔" [1]

"اب چونکہ خود اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے اور دنیا کی رہنمائی کا کام اس دین اور اس اُمت سے لینا تھا۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور امت کے مجدّدین و مصلحین سے لے گا۔" [2]

"اسلام کی تاریخ اس حقیقت کی پوری طرح گواہ ہے کہ اسلام پر کبھی کوئی ایسا زمانہ نہیں گزرا کہ جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہو گئی ہو۔ حقیقتِ اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو ــ امتِ اسلامیہ کا ضمیر بالکل بے حس ہو گیا ہو اور تمام عالمِ اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لئے کوئی فتنہ نمودار ہوا۔ اس کی تخریب اور اس کو مسخ کرنے کی

---

[1] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اوّل ص ۱۰

[2] ایضاً، ص ۱۱

کوشش کی گئی یا اس کو غلط طریقے پر پیش کیا گیا۔ مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقت ور شخصیت ضرور ایسی میدان میں آگئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور اس کو میدان سے ہٹا دیا۔"[1]

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی حالت یوں بھی اچھی نہیں تھی۔ آل تیمور کی بے دین سیاست نے اسلام اور مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا تھا۔ اس کے تدارک اور اصلاح کا کام خاندان ولی اللٰہی گو برابر انجام دے رہا تھا لیکن ایک حکمراں قوم میں جو کمزوریاں اور خرابیاں عموماً پیدا ہو جاتی ہیں وہ ہندوستانی مسلمانوں میں سب کی سب پیدا ہو گئی تھیں۔ دین سے دوری عدم اتحاد، نسلی تفاخر، جہالت اور بقول مولانا الطاف حسین حالی ہر فن اور ہر ہنر سے عاری، مزید یہ کہ برطانوی اقتدار کی غلامی نے حالت اور ابتر کر دی اور اب حالت یہ ہو گئی کہ ——

"امہات عقائد میں ضعف پیدا ہو گیا اور بڑھتا ہی جا رہا ہے اور خود مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے گہرے الفاظ میں، امہات عقائد میں امہات ہونے کی شان نہیں رہی۔ ان میں نبات عقائد (ضمنی و فروعی عقائد) کی تربیت اور پرورش کی طاقت نہیں رہی۔ خدا کی خدائی اور محمدؐ کی رسالت کا یقین کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آخرت کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے خدا کی بات کا وقار اور رسولؐ کے کلام کا وزن اور دین و شریعت کا احترام کم ہو رہا ہے، اجر و ثواب کا شوق (ایمان و احتساب) دل سے اٹھتا جا رہا ہے۔"[2]

---

[1] سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول، ص ۲۲

[2] سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت، ص ۲۴۳

اس پر مزید یہ کہ مولانا الیاسؒ صاحب نے جب بستی نظام الدین میں قیام اختیار کیا اور ان کا واسطہ میو قوم سے پڑا جو میوات کے ایک وسیع علاقے میں آباد تھی اور جس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ مسلمان ہے ورنہ ان کی زندگی کا سارا رنگ ڈھنگ غیر اسلامی بلکہ ہندوانہ تھا۔

"دہلی کے جنوب کا وہ علاقہ جس میں قدیم زمانے سے میو قوم آباد ہے میوات کہلاتا ہے اس علاقے میں اس وقت گوڑگانوہ (انبالہ کمشنری صوبہ پنجاب) کا انگریزی ضلع الور، بھرت پور کی ہندو ریاستیں اور صوبہ جات متحدہ (یو، پی) کا ایک ضلع متھرا کا کچھ حصہ شامل ہے۔" [۱]

یہ قوم کب اور کیسے مسلمان ہوئی۔ اس کا تذکرہ تفصیل سے نہیں ملتا لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد بھی مسلمان مبلغین کی غفلت سے یہ قوم اسلامی اور غیر اسلامی عقائد کے لحاظ سے ایک معجون مرکب بن کر رہ گئی تھی۔

میجر پاولٹ جو انیسویں صدی کے آخر میں ریاست الور کا افسر بندوبست رہا تھا، لکھتا ہے ـــــ

"میو اپنے عقائد میں آدھے ہندو ہیں۔ ان کے گاؤں میں شاذ و نادر ہی مسجد ہوتی ہے۔ تحصیل تجارہ میں میوؤں کے ۵۲ گاؤں ہیں جن میں صرف آٹھ مسجدیں ہیں البتہ مندروں کو چھوڑ کر میوؤں کی عبادت کی ویسی ہی جگہیں بنی ہوتی ہیں۔ جیسی ان کے ہمسایہ ہندوؤں کے یہاں ہوتی ہیں مثلاً پانچ پیرا، بھینا چاہنڈ اور چاہنڈ یا کھیڑا دیو مہادیوی کے نام سے ہوتا ہے۔ جس میں قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں شب برات میں سپہ سالار

---

[۱] سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت ص ۶۲

مسعود غازی کا جھنڈا بھی ہر گاؤں میں پوجا جاتا ہے۔" [1]

دوسری جانب بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے ابتدا میں ایک اور مسئلہ پیدا ہوا۔

"آریہ مبلغین سیکڑوں کی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے جن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے وہ باشندے جنھوں نے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا۔ انھیں دوبارہ اپنے مذہب کی طرف واپس لایا جائے۔ ہر طرف ارتداد کی ہوا پھیلنے لگی اور جاہل نومسلم دیہاتی علاقوں میں آریوں کی کامیابی کی خبریں آنے لگیں۔" [2]

مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے ابتدا سے ہی ایک مخصوص دینی اور روحانی ماحول میں زندگی بسر کی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مسلمان انتہائی سرعت کے ساتھ ایمان و یقین کی دولت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں لیکن اب یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

مولانا محترم کی حساس طبیعت، عام مسلمانوں کی دین سے بڑھتی ہوئی بے تعلقی اور اس کی تحقیر اور خصوصاً میواتیوں کا دین سے بالکل ناواقف ہونا اور ان کا غیر اسلامی طریقہ پر زندگی گزارنا، کب گوارہ کر سکتی تھی۔

آپ کے آبائی مدرسہ بستی نظام الدین میں میوات کے کچھ بچے پڑھتے تھے پھر آپ کے والد محترم مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ اور برادر بزرگ مولانا محمد صاحب مرحوم کے تعلق سے کچھ میواتی بھی آپ کے عقیدت مند ہو گئے تھے جو اکثر آپ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا یوسف کاندھلوی، ص ۱۳۷، ۱۳۸

[2] مولانا وحید الدین احمد خاں، تبلیغی تحریک، ص ۱۱

ابتداً مولانا محمد الیاس صاحب نے میواتیوں کی اصلاح کے لئے دینی تعلیم کو ذریعہ بنایا اور کوشش کر کے خود میوات کے اندر بہت سے دینی مدارس قائم کئے۔ ان مدرسوں کے قیام سے حالات میں کسی تبدیلی کے آثار پیدا ہوئے لیکن جو کچھ مولانا محترم چاہتے تھے۔ وہ نہیں ہو پایا۔

اصل مسئلہ سارے میوات کی عام دینی بیداری کا تھا جو مکتب کی دینی تعلیم سے حل نہیں ہو رہا تھا۔

مزید غور و فکر کرنے پر احساس ہوا کہ لوگوں کو ان کے اپنے ماحول میں رکھ کر ان کی خاطر خواہ اصلاح نہیں کی جا سکتی۔

اسی غور و فکر اور کرب و بے چینی کی حالت میں مولانا محترم دوسرے حج کے لئے تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران تبلیغ کے لئے اشارہ ہوا اور یہیں سے اصلاح کا رخ تبدیل ہوا۔

قیام جماعت

مولانا الیاس صاحبؒ نے حج سے واپس آنے کے بعد تبلیغی گشت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دوسرے لوگوں کو بھی آپ نے متوجہ کیا اور ہدایت کی کہ عوام میں نکلیں اور انھیں کلمہ طیبہ اور نماز سکھائیں۔ عام لوگ اشاعت دین کے اس طریقے اور انداز سے بالکل غیر مانوس اور نا آشنا تھے۔ دین کی تبلیغ کے لئے زبان کھولنا ایک امر محال معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی چند لوگ اس کام کے لئے آمادہ ہو گئے اور انھوں نے اس کام کو شروع کر دیا۔

آپ نے قصبہ نوح میں ایک بڑا اجتماع کیا اور دعوت دی

کہ لوگ جماعتیں بنا کر نکلیں۔ ایک ماہ بعد جماعت بنی اور مختلف گاؤں میں اس نے گشت کیا۔ ایک جمعہ سے جماعت چلی۔ دوسرا جمعہ سوہنے ضلع گوڑگانوہ میں پڑھا۔ تیسرا جمعہ تاؤڈو میں اور چوتھا جمعہ نگینہ تحصیل فیروزپور میں ہوا۔ ہر جمعہ کو مولانا محترم جاتے اور نظام بناتے اور ہر دو جمعہ کے درمیان میں جماعت مختلف گاؤں میں گشت اور اجتماع کرتی اور لوگوں کو آگے چلنے پر آمادہ کرتی اور تبلیغی کام کی اس طرح ابتدا ہوئی۔" [1]

جماعت کی تشکیل کرنا اور میوات کے لوگوں کا اپنے گھروں اور بستیوں سے باہر نکلنا ابتداءً بہت مشکل کام تھا کیونکہ ـــــ

"انھیں کلمہ تک یاد نہ تھا حتیٰ کہ نماز کی صورت سے وہ اس قدر نا آشنا تھے کہ کبھی کوئی مسلمان اتفاق سے ان کے علاقے میں پہنچ گیا اور اس نے نماز پڑھی تو گاؤں کے مرد، عورت، بچے سب اس کے گرد یہ دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے کہ یہ شخص آخر کیا کر رہا ہے اس کے پیٹ میں درد ہے یا اس کو جنون ہو گیا ہے کہ بار بار اٹھتا بیٹھتا اور جھکتا ہے۔ ان کی تہذیب کا یہ عالم تھا کہ عورت مرد اکثر نیم برہنہ گھومتے تھے۔ چوری ڈکیتی اور رہزنی ان کا پیشہ تھا۔ آپس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے درمیان لمبی لمبی خوں ریز لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں وہ فطرۃً جفاکش اور بہادر تھے مگر علم و تربیت کی کمی نے انھیں جنگلی قبائل کی سطح سے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔" [2]

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا یوسف کاندھلوی ص ۱۴۴

[2] وحیدالدین احمد خاں، تبلیغی تحریک ، ص ۱۰، ۱۱

دوسری پریشانی یہ بھی کہ ان قبائلی لوگوں کو کسی نہ کسی طرح سے اپنے مشاغل سے چھڑا کر اور بیوی بچوں سے علیحدہ کر کے باہر نکلنے کے لئے آمادہ کر بھی لیا جائے تو ان کی جہالت، سادہ لوحی اور ناشائستگی کے باعث لوگ ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک نہ کر سکیں گے۔

"لیکن مولانا کے نزدیک ایسا ہونا ضرور تھا اور اس کی تدبیر یہ بھی کہ (کسی نہ کسی طرح میوات کے لوگوں کو) کچھ مدت کے لئے جماعتوں کی شکل میں دینی اور علم کے مرکزوں کی طرف نکلنے پر آمادہ کیا جائے۔ وہ وہاں کے عوام اور جہلاء میں کلمہ اور نماز کی تلقین کریں اور اس طرح اپنا پڑھا ہوا سبق پختہ کریں اور وہاں کے اہل علم کی مجلسوں میں بیٹھ کر ان کی باتوں کو بغور سنیں اور ان کی زندگی، نشست و برخاست اور عمل بغور دیکھیں اور اس طرح بالکل فطری طریقہ پر جس طرح بچہ زبان سیکھتا ہے اور آدمی تہذیب و شائستگی حاصل کرتا ہے۔ وہ دین اور علم دین حاصل کریں۔" [1]

یہ تدبیر بہت کارگر اور مفید ثابت ہوئی۔ میوات کے حالات سے واقف کوئی بھی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک کمزور اور ناتواں انسان کا حسن تدبیر سارے علاقے کی کایا پلٹ دے گا اور جاہل و سرکش میواتیوں کی زندگیاں ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہو جائیں گی کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اسلام کے سچے خادم بن جائیں گے۔

"اس چلت پھرت سے میواتیوں کا باہر سے تعلق قائم ہوا۔ میوات میں بھی باہر کے لوگ آنے جانے لگے اور چند ہی سال میں میوات کے

---

[1] سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت ص ۸۰

وسیع علاقہ میں دین اور دین داری کی ایسی اشاعت ہوئی اور اس تاریک خطہ میں ایسی روشنی پھیلی جس کی مثال دور دور نہیں ملتی۔ میواتی جو خود دین سے ناآشنا اور نابلد تھے۔ دوسرے شہروں اور دور دراز علاقوں میں اپنی سادگی کے ساتھ دین کی اشاعت کا کام کرنے لگے جہاں میلوں اور کوسوں تک مسجد نظر نہ آتی تھی۔ وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بننے لگیں۔ جہاں دور دور تک کوئی قرآن پڑھنے والا نہ تھا۔ اب وہاں ایک ایک گھر میں کئی کئی حافظ، ایک ایک گاؤں میں کئی کئی عالم آنے لگے۔ ہندوانہ وضع و لباس سے نفرت پیدا ہونے لگی اسلامی اور شرعی لباس کی وقعت دلوں میں پیدا ہو گئی۔ شادی سے مشرکانہ رسوم کا خاتمہ ہونے لگا۔ جرائم، فسادات اور بداخلاقیوں کا تناسب کم ہو گیا۔" [۱]

ایک میواتی کے اپنے الفاظ میں

"ہم جہالت میں پڑے ہوئے تھے۔ نہ ہم کو خدا کی خبر تھی نہ رسولؐ کی، اس مولوی کا خدا بھلا کرے اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں تک یہ نصیحت پہنچائیں جو ہمیں ملی ہے۔" [۲]

---

[۱] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا یوسف کاندھلوی ص ۱۴۵

[۲] ایضاً ص ۱۴۶

تبلیغی جماعت اور آزادیٔ ہند

بہار آنا قیامت تھا کہ دیوانوں کی بن آئی
ابھی تک سی رہے ہیں دھجیاں جیب و گریباں کی (ضیاء الہادی)

برسہا برس کی کوشش اور جدوجہد کے نتیجے میں آخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا لیکن یہ صبح آزادی ایک سیاہ رات کے ساتھ نمودار ہوئی۔ ہندو اور مسلمان قائدین کی ناعاقبت اندیشی کے باعث ملک تقسیم ہوا۔ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں تبادلہ آبادی کا عمل اور جگہ جگہ فساد کا سلسلہ شروع ہوا۔

"ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ بدنما اور خونی دور جس میں (وہ) انسان جس کو خدا نے رحمت و شفقت کی اعلیٰ صفات عطا کی تھیں، پھاڑنے والا درندہ بن گیا۔ جانوروں کو تکلیف میں مبتلا پاکر جس کی آنکھوں میں آنسو آجایا کرتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔ جس نے معصوم سے معصوم مخلوق تک کو نہ چھوڑا اور اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔"[1]

ایسے پرآشوب حالات میں تبلیغی جماعت اور اس سے وابستہ حضرات کا متاثر ہونا لازمی تھا۔

"بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلی کے بالکل دہانے پر واقع ہے۔ مشرق پنجاب کے علاقے کی رہگذر ہے پھر ہندوستان کے

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی، ص ۲۶۷

اس دارالحکومت میں مسلمان آبادی کا ایک اہم جزو تھے اور صنعت و تجارت میں ممتاز اس لئے ان کا آفت و مصیبت کا نشانہ بننا قدرتی تھا۔ (ان ہی ایام میں) بستی نظام الدین بڑے پُر آشوب حالات سے گذرا۔ ۱؎

دہلی کی کایا ہی پلٹ گئی۔ اس کے چند ہی محلے محفوظ رہے ورنہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک فساد کی آگ پھیل گئی —— حتیٰ کہ (تبلیغی جماعت کا) مرکز بھی اس کی زد میں آگیا۔ ہر وقت اس بات کا خوف لگا رہتا تھا کہ کب فسادیوں کا مرکز پر حملہ ہو جائے۔ رات ہوتی تھی تو صبح کا ٹھیک نہ تھا اور دن ہوتا تھا تو رات کا ٹھیک نہ تھا۔ ایک عرصہ تک نظام الدین کا مرکز ایک جہاز کے مانند ہو گیا تھا۔ جو بلاخیز طوفان کے درمیان ہچکولے کھاتا پھرتا تھا اور بڑے سے بڑے صاحب ہمت انسان کے بھی بعض اوقات قدم اکھڑ جاتے تھے۔" ۲؎

ان حالات میں بھی جہاں سکون تھا تبلیغ کا کام برابر جاری تھا۔ بلکہ اس وقت تبلیغ دین کی اہمیت اور ضرورت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ جب انسان کسی مصیبت یا پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے تو فطری طور پر اس کے دل میں نرمی آجاتی ہے اور دل کی یہ نرمی بڑے کام کی چیز ہوتی ہے اور صاحب بصیرت اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

چنانچہ تبلیغی جماعت کے اس وقت کے مرکزی امیر مولانا محمد یوسف صاحبؒ

۱؎ سید محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی ص ۲۶۷، ۲۶۸

۲؎ ایضاً ص ۲۷۷

اور آپ کے معاون جو حالات پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس بات سے بالکل متفق تھے کہ فساد زدہ علاقوں کے مسلمانوں کی جہاں مادّی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے وہاں ان کے درمیان تبلیغ دین کا کام بھی کیا جائے ان کے نزدیک دراصل یہ ساری بربادی مسلمانوں کے اپنے اعمال کے نتیجے میں آئی تھی۔ اور جب تک وہ اپنے اعمال کی درستگی کی جانب توجہ نہیں دیں گے۔ اس کے لئے محنت نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شامل حال نہ ہوگی۔

"جو عذاب معاصی کی وجہ سے اور اللہ کے فرائض اور اس کے حدود توڑنے کی وجہ سے آرہا ہے اور (آگے) آنے والا ہے۔ اسے تمھارے قوائد پریڈ بلکہ تمھاری توپیں اور تمھارے بم گولے بھی نہیں روک سکیں گے۔ اصل علاج یہ ہے کہ اپنے اندر ایمان پیدا کرو، اللہ کی طرف رجوع کرو۔ صرف یہی چیز تمھیں اور پورے عالم اسلام کو بچا سکتی ہے"[1]

اگرچہ ۱۹۴۷ء کے ہیجان انگیز حالات میں مرکز سے بہت سے لوگ پاکستان چلے گئے لیکن مرکزی شخصیتوں کے رہنے کے باعث تبلیغی جماعت کا کام زیادہ متاثر نہیں ہوا بلکہ اس کے کام میں اضافہ ہی ہوا۔ انھیں حالات میں ایک تبلیغی جماعت دہلی سے لاہور کے لئے گئی۔

یہ جماعت آگ اور خون کے دریا سے گزر کر لاہور پہنچی۔ پورا مشرقی پنجاب مسلمانوں کے لئے آگ کی بھٹی بن چکا تھا نہ مال وزر محفوظ نہ جان وایمان کی خیر تھی۔ بغض وعداوت، نفرت، غیظ وغضب کا دور دورہ تھا اور مسلمان کشی کی وبا پھیل چکی تھی۔ ان علاقوں میں ایک قدم چلنا موت کے مترادف تھا[2]

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا یوسف کاندھلوی ص ۲۸۷

[2] " " " " " " ص ۲۹۲

لیکن تبلیغی جماعت نے تو اس یقین کو اپنے اندر پرورش اور مستحکم کیا ہے کہ ہر معاملہ کا کارساز صرف اللہ رب العزت ہے اور اس پر ایمان، حالات چاہے وہ اچھے ہوں یا برے، کبھی اثر انداز نہیں ہوتے۔ اللہ کے راستے پر پڑنے والے نکلنے والے حالات کی سنگینی سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔

تقسیم ہند کے دو تین سال بعد جبکہ قتل و غارت گری کا جنون سروں سے اترا اور دلوں کے پھپھولے پھوٹ چکے اور دست و بازو شل ہو چکے۔ تلاطم خیز سمندر میں قدرے سکون آیا تو تبلیغی جماعتوں نے کئی بار مشرقی پنجاب کا دورہ کیا جن جن آزمائشوں اور تکلیفوں سے ان کو گزرنا پڑا۔ ان کی روئداد بڑی سبق آموز اور عبرت خیز ہے۔ ہر جماعت بڑے سے بڑے ابتلا سے گزری۔ اپنی دانست میں آمادہ بہ فساد لوگوں نے جماعت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مگر خدا کے نصرت اور غیبی مدد سے ہر بار جماعت موت کے منہ سے صاف نکل گئی اور "من کان اللہ کان اللہ لہ" کی مصداق بن کر دوسروں کے لئے عبرت و موعظت کا سامان بن گئی۔ [1]

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی ص ۲۹۳

مقاصد اور اصول

تبلیغی جماعت کا کوئی مرتب شدہ مطبوعہ دستور نہیں ہے کہ جس کی بنیاد پر تبلیغی جماعت کے مقاصد اور اصول بیان کئے جا سکیں البتہ بانی جماعت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور آپ کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے اپنی دینی دعوت اور دعوت کے طریقے کار کے تحت جو کچھ اظہار خیال کیا ہے اسے پیش نظر رکھ کر تبلیغی جماعت کے مقاصد میں اولین چیز مسلمانوں میں دین کا صحیح تصور پیدا ہو جائے اور ان کی زندگی دین کے مطابق چلنے لگے۔

"یہ تڑپ اور لگن کس کام (مقصد) کے لئے تھی صرف اس لئے کہ لوگوں کے اندر دین کا صحیح تصور آ جائے اور زندگیاں اس کے مطابق چل پڑیں۔" [1]

اللہ کے دین کو اپنانے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے کچھ شرطوں کی پابندی لازمی ہے اور ان میں سے چند شرطیں یہ ہیں :-

۱۔ اپنی خواہش کے اسلام سے اجتناب :-

مسلمانوں نے اسلام کو اپنی خواہشات اور آرزوؤں کا تابع بنا لیا ہے اور اس میں بھی برابر قطع و برید کا عمل جاری ہے۔

---

[1] وحیدالدین خاں، تبلیغی تحریک، ص ۳۹

"آج کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں اسلام پر چلنے والا کوئی نہیں ہے صحیح ہے، اس طرح کا ذہن رکھنے والوں میں دینے کا طریقہ کیسے چلے، اسلام کو اپنی خواہشات کے مطابق چلاؤ گے تو وہ اسلام رہے گا ہی نہیں، وہ تو تمھاری بنائی ہوئی نئی چیز ہو جائے گا۔"[1]

۲۔ اپنے مزاج کو اسلام کے مطابق بنایا جائے۔

ایسا جب ہو پائے گا کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پوری طرح کارساز ہونے کا پکا یقین پیدا ہو جائے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی پر ایمان پختہ ہو جائے۔

"جب اس بات پر یقین پیدا ہو جائے کہ کسی مخلوق سے کچھ نہیں ہوتا، سب اللہ سے ہوتا ہے۔ حالات کا بناؤ بگاڑ، تعمیر و تخریب اور کامیابی و ناکامی چیزوں کے ہونے یا نہ ہونے سے نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ بنانے اور چمکانے کا فیصلہ جب کریں گے، جب میں رسولؐ کے طریقے پر آجاؤں گا اور محمد رسول اللہؐ کے طریقے پر خدا کے خزانوں سے ملنے اور نعمتوں کے دروازے کھلنے کا یقین ہو۔"[2]

۳۔ اندرون میں تبدیلی لانا

عصری تعلیم کا حصول، دولت کی فراوانی، سیاسی اور محکماتی عہدوں کا پالینا اور دوسری کسی بھی طرح کی مادی خوش حالی کامیابی کے ضامن

---

[1] برائے تفصیل، سید محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی ص ۶۹۹، ۷۰۰

[2] " " " " " " ص ۷۰۱، ۷۰۲

نہیں ہو سکتی جب تک کہ دل کی دنیا میں تبدیلی نہیں آتی۔

"کامیابی اور ناکامی انسان کے اندر کے حال کا نام ہے، باہر کے نقشے کا نام کامیابی اور ناکامی نہیں ہے ... ... انسان کے اندر کی مایہ اس کا یقین اور اس کے اعمال ہیں۔ انسان کے اندر کا یقین اور اندر سے نکلنے والے عمل اگر ٹھیک ہوں گے تو اللہ جل شانہٗ اندر کامیابی کی حالت پیدا کر دیں گے۔ خواہ چیزوں کا نقشہ کتنا ہی پست ہو۔" [۱]

۴۔ ایک اُمت کا بننا

آج مسلمان فرقہ فرقہ اور گروہ گروہ میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ایک امت ہونے کا اب احساس تک باقی نہیں رہا ہے۔ جبکہ امت مسلمہ کی ہلاکت و بربادی کا سبب یہی آپس کا عدم اتحاد اور باہمی تفرقہ بازی ہے اور جب تک مسلمان اس دنیا میں ایک امت نہیں بنتے کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے۔

مولانا نے امت کے صحیح تصور کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

"اُمت کسی ایک قوم اور ایک علاقے کے رہنے والوں کا نام نہیں ہے بلکہ سیکڑوں ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جڑ کر اُمت بنتی ہے جو کوئی کسی ایک قوم یا ایک علاقہ کو اپنا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے وہ امت کو ذبح کرتا ہے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے اور حضور اکرمؐ و صحابۂ کرامؓ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے۔ اُمت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پہلے خود ہم نے ذبح کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے

---

[۱] مزید تفصیل کے لئے، سید محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی ل ص ۷۰۳۔

تو اس کے بعد کبھی کٹائی امت کو کاٹا ہے۔ اگر مسلمان اب بھی
ایک امت بن جائیں تو دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی ان کا
بال بیکا نہیں کر سکیں گی۔ ایٹم بم اور راکٹ ان کو ختم نہیں
کر سکیں گے لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کی وجہ
سے باہم امت کے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم تمہارے
ہتھیار اور تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچا سکیں گی۔ [1]

علامہ اقبال نے یہی بات اس انداز سے کہی ہے ـــــ

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

۵۔ ذات اور شخصیت کے بجائے اعمال و اخلاق کو بنیاد بنایا جائے۔

مسلمان کی فلاح وبہبود کسی ذات یا شخصیت سے وابستہ نہیں
ہے اس کا اخلاق اس کے اعمال اسے نصرت خداوندی کا مستحق بناتے ہیں اخلاق
کا مطلب ہے کہ انسان کے اندر اخلاص اور للٰہیت ہو اور عمل وہی مفید ہے جو
اللہ اور اس کے رسول حضرت محمدؐ کی ہدایت کے تحت انجام پائے۔ چنانچہ
مولانا محمد یوسف صاحبؒ فرماتے ہیں ـــــ

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی، ص ۵۰۰۔

"اللہ کی مدد ذاتوں اور شخصیتوں کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ ان کے اعمال اور اخلاق اور اوصاف کی وجہ سے آتی ہے۔ اللہ نے رسول کی جو مدد فرمائی اس طرح آپ کے صحابہ اکرام اور بعد میں اولیاء کرام پر اللہ کے جو انعامات ہوئے ان کی جو مدد فرمائی گئی وہ ان کی شخصیتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے اعمال اور خاص کر اللہ کے لئے ان کی قربانیوں اور دین کے راستے کی ان کی محنتوں کی وجہ سے فرمائی گئی۔ آج بھی جو کوئی اللہ کی مدد یں چاہے وہ ان کے والے اعمال اور ان کی والی قربانی اور محنتوں پر پڑ جائے۔ وہ اللہ کی مددوں کو آتا ہوا خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔" [1]

۶۔ زندگی کے پورے نظام میں تبدیلی لانا۔

اللہ کا دین اسلام انسانی زندگی کے کسی ایک حصہ یا شعبہ کی تبدیلی کا قائل نہیں ہے۔ وہ پورے نظام زندگی کی تبدیلی چاہتا ہے۔ عبادات، معاشرت معیشت، سیاست غرض زندگی کا کوئی بھی شعبہ یا حصہ ہو اسے اسلام کے رنگ میں رنگا ہونا چاہیئے۔ یہ اللہ کے دین کے ساتھ بڑا مذاق ہے کہ ہم چند امور یا ارکان کو اسلام کے تحت انجام دیں، باقی دوسرے سارے معاملات میں اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات کی کوئی پرواہ نہ کریں۔

مولانا فرماتے ہیں ــــــ

"ہم یہ چاہتے ہیں کہ بازار سے مسجد تک کا نظام اور مسجد سے بیت اللہ تک کا نظام درست ہو جائے۔"

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی، ص ۱۰،

اور اپنے طرزِ فکر کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"مسلم کی ہر چیز دین ہے بشرطیکہ اللہ پاک کے بھیجے ہوئے احکام اور آداب کے رنگ سے رنگی ہوئی ہو۔ ہمارا کھانا، پینا، سونا جاگنا، ہمارا بیوی بچوں کے ساتھ اختلاط ہمارا بولنا اور خاموش رہنا، سب ہی ہمیں ترقی دلواتے ہیں اور اللہ کی رضا اور اس کے وعدے پورے کراتے ہیں جبکہ اللہ کو حاضر و ناظر سمجھ کر اس کے احکام و فرمان کے ماتحت اپنے نفس کی خواہشات کو داب کر مسلم والی رکھی ہوئی ترتیب اور اتاری ہوئی ترکیب کے مطابق شب و روز میں ہر کام کو حضور اکرم والی زندگی کی جھلک کے ساتھ کیا جائے۔" [1]

ہر جماعت اور پارٹی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کچھ اصول اور ضابطے متعین کرتی ہے اور ان اصولوں اور ضابطوں پر اخلاص کے ساتھ عمل آوری اسے اور اس کے ارکان کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔

چھ۶ بنیادی اصول

تبلیغی جماعت نے اپنے بلند ترین مقصد کے حصول کے لئے چھ اصول وضع کئے ہیں۔

۱۔ کلمۂ اسلام کو دلوں میں بٹھانا۔
۲۔ نماز کو اس کی حقیقی شکل میں قائم کرنا۔
۳۔ دین کا علم سیکھنا اور اللہ کا ذکر کرنا۔

۴۔ اکرامِ مسلم

۵۔ تفریغِ وقت یعنی دنیوی مشاغل سے اپنے وقت کو فارغ کر کے جماعت کی شکل میں باہر نکلنا۔

۶۔ تصحیحِ نیت یعنی اخلاص و احتساب۔

ان اصولوں یا چھ نکات کی تشریح مولانا وحید الدین خاں نے اس انداز میں کی ہے۔

"ان چھ نکات کو اگر مزید گھٹایا جائے تو اس کو تین پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کلمۂ توحید، نماز اور تفریغ وقت بقیہ تینوں اجزاء (اصول) دراصل انہیں چیزوں (اصولوں) کے تقاضے ہیں جو ان کو صحیح طور پر اختیار کرنے کے بعد لازماً پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو الگ سے بیان کرنا محض وضاحت کے لئے ہے نہ کہ تعیّن کے لئے۔" [۱]

مولانا الیاس صاحبؒ کی دعوت میں کلمۂ توحید کو اوّلین اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کلمۂ توحید کیا ہے؟ یہ اس بات کا یقین ہے کہ خدا ہی اس کائنات کا رب و پروردگار ہے۔ اور اس کے رسول حضرت محمدؐ ہی وہ شخص ہیں جن کے ذریعہ مکمل صداقت کا ظہور ہوا۔

"یہ یقین و اعتماد اور یہ شرحِ صدر ہی دراصل وہ چیز ہے جو سارے انقلابات کی بنیاد ہے۔ دنیا کے کسی بھی انقلاب کی تاریخ پڑھ لیجئے آپ کو ملے گا اس قسم کا احساس ——— خواہ وہ باعتبارِ حقیقت صحیح ہو یا غلط ——— کچھ لوگوں میں پیدا

---

[۱] مولانا وحید الدین خاں، تبلیغی تحریک، ص ۲۶، ۲۷

ہوگیا تھا۔ اور وہی بالآخر تحریک اور انقلاب کا سبب بنا۔ فرانس کا انقلاب، کمیونزم کی کامیابی اور مختلف ملکوں میں قومی آزادی کی جدوجہد دراصل اس قسم کے احساس کی بنیاد پر شروع ہوئی اور اس کی بنیاد پر جیتی گئی ——— ان کا اوّل و آخر سرمایہ یہی ایک تخیل تھا جو ان کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا اور وہ یہ کہ ان پر سیاسی، معاشی یا قومی سچائی کا انکشاف ہوا ہے۔ اس احساس نے ان کے دل و دماغ میں آگ لگا دی۔ ان کی قوتوں کو مجتمع کیا۔ انھیں مستقبل سے بے پرواہ کر کے وقت کے خلاف کھڑا کر دیا اور انھیں ایک ایسی جنونانہ جدوجہد میں لگا دیا۔ جس کا آخری انجام صرف کامیابی ہو سکتا تھا ——— یہ اس یقین کا انجام تھا جو صرف جزئی نوعیت کا تھا اور جس کو ہم صحیح نہیں سمجھتے پر وہ یقین جو کلی صداقت کی بنیاد پر پیدا ہو اور جو فی الواقع صداقت ہو نہ کہ محض غلط فہمی سے صداقت سمجھ لیا گیا ہو، ایسی صداقت اگر دلوں میں اتر جائے اور ایسے دین کے لئے جنون پیدا ہو جائے تو اس کا کیا انجام ہوگا ——— دوسری تحریک کے افراد اگر اپنے خودساختہ تخیلات کی برتری سے لوگوں کو مرعوب کر سکتے تھے تو عالم کل اور خالق فطرت کے دئے ہوئے تصورات میں جہاں گیری کی کیا کچھ طاقت ہوگی۔" [1]

مولانا کی دعوت کا دوسرا جز نماز ہے ——— عام طور پر لوگ نماز

---

[1] مولانا وحیدالدین خاں، تبلیغی تحریک ص ۲۷، ۲۸

کی حقیقت اور اس کی اہمیت کو نہیں جانتے، اس لئے وہ اس کی عظمت کو واقعی نہیں سمجھ سکتے ـــــ نماز اپنی اصل اور اندرونی حقیقت کے اعتبار سے خدا کی طرف متوجہ ہونے اور اس سے حیاتی ربط قائم کرنے کا نام ہے ـــــ نماز، وہ مقام ہے جہاں خدا اپنے بندوں سے ملاقات کرتا ہے ـــــ (نماز کی صحیح ادائگی کے باعث انسان کی روح) ایک ایسے تجربہ سے دوچار ہوتی ہے جہاں عبدیت اور معبودیت کی حدیں ملنے لگتی ہیں۔ بندگی خدائی کے جلوؤں میں نہا اٹھتی ہے ـــــ یہ تجربہ انسان کی شخصیت کو ایک نئی جلا دیتا ہے اور اس کو ایسی عجیب وغریب نعمتیں عطا کرتا ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔[1]

مولانا کی دعوت کا تیسرا جز تفریغ وقت ہے ـــــ تفریغ وقت دراصل اس حقیقت کا مظہر ہے کہ آدمی اپنے عقیدے میں اتنا بے تاب ہو چکا ہے کہ اس کے لئے اپنی مصروفیتوں کو چھوڑ کر گھر سے باہر نکل پڑا ہے۔ ایمان کے ساتھ تبلیغ کا سودا بھی اس کے سر میں سما گیا ہے۔ وہ اپنے درد کو سارے عالم کا درد بنا دینا چاہتا ہے۔ یہ کیفیت جب عملی شکل اختیار کر لیتی ہے جو تبلیغ کی اصطلاح میں اس کا دوسرا نام وقت کا فارغ کرنا یا اس کی ایک مقررہ مدت کا نام چلّہ ہے۔

تبلیغی جماعت کے مقاصد، اصول اور طریقہ کار کو مزید سمجھنے کے لئے جو بہت ضروری ہے۔ ذیل میں مولانا محمد یوسف صاحب کے ایک تفصیلی مکتوب کے کچھ ضروری اجزاء مختصراً پیش کئے جا رہے ہیں۔

یہ مکتوب عمرہ کے لئے حجاز مقدس جانے والی ایک جماعت کے لئے مولانا نے تحریر کیا تھا لیکن یہ مکتوب ساری ان جماعتوں کے لئے

---

[1] مولانا وحید الدین خاں، تبلیغی تحریک ص ۲۸، ۲۹

جو تبلیغی سفروں پر روانہ ہوتی رہتی ہیں اور اُن سارے حضرات
کے لئے جو اس راہ میں اپنے اوقات فارغ کرتے ہیں نہایت
مفید ـــــ اور ضروری ہے۔ ؎

اس مکتوب کو مزید مفید بنانے کے لئے ذیلی عنوانات یا نکات کے تحت
تحریر کیا جارہا ہے جو حسب ذیل ہیں:۔

ایمان باللہ:۔

اللہ تعالیٰ تمام کائنات کے ہر ذرّے کے اور ہر فرد کے خالق و مالک
ہیں سب کچھ ان کے بنانے سے بنا ہے ـــــ جو کچھ قدرت سے بنا ہے وہ
قدرت کے ماتحت ہے (یعنی خالق ہی مالک ہوتا ہے اور مالک امر ہوتا ہے)
تربیت کا نظام (بھی) وہی چلاتے ہیں۔ ساری چیزوں کے بغیر ریت پر ڈال کے
پال دیں اور سارے ساز و سامان میں پرورش بگاڑ دیں۔

ایمان بالرّسالۃ

اس بات پر پختہ یقین واعتماد کرنا کہ حضرت محمدؐ اللہ کی طرف سے طریقے
لے کر آئے ہیں۔ جب ان کے طریقے زندگیوں میں آئیں گے تو اللہ تعالیٰ ہر نقشہ
میں کامیابی دے کر دکھائیں گے۔

نماز کا اہتمام اور اس کی دعوت:۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت سے براہ راست فائدے حاصل کرنے کے لئے
نماز کا عمل دیا گیا ہے۔ خشوع و خضوع والی نماز کی دعوت و ترغیب دی جائے۔

؎ سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ ص ۷۴۵

اس پر آخرت اور دنیا کے نفع سمجھائے جائیں۔ حضور اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کی نماز کو سنانا۔ خود اپنی نماز کو اچھا کرنے کی مشق کرنا۔ اہتمام سے وضو کرنا، دھیان جمانا، قیام میں، قعدہ میں، رکوع میں، سجدے میں، دھیان کم از کم تین مرتبہ جمایا جائے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ نماز کے بعد سوچا جائے کہ اللہ کی شان کے مطابق نماز ہوئی۔ اس پر رونا اور کہنا کہ اللہ ہماری نماز میں حقیقت پیدا فرما۔

علم و ذکر :

علم سے مراد یہ کہ ہم میں تحقیق کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ میرے اللہ مجھ سے اس حال میں کیا چاہتے ہیں اور پھر اس دھیان کے ساتھ اپنے آپ کو اس عمل میں لگا دینا یہ ذکر ہے۔ دوسروں میں علم کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ فضائل سنائے جائیں۔ خود تعلیم کے حلقوں میں بیٹھا جائے۔ علماء کی خدمت میں حاضری دی جائے اس کو بھی عبادت یقین کیا جائے۔ خود اللہ تعالیٰ کا دھیان پیدا کرنے کے لئے دوسروں کو اللہ کے ذکر پر آمادہ کرنا۔ ترغیب دینا۔ خود دھیان جما کر میرے اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ ذکر کرنا اور رو رو کر دعا مانگنا کہ اے اللہ مجھے ذکر کی حقیقت عطا فرما۔

اکرام مسلم :

ہر مسلمان کا بہ حیثیت رسول کا امتی ہونے کے اکرام بھی کرنا ہے ہر شخص کے حقوق کو ادا کرنا اور اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کرنا۔ جو آدمی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔ جب تک آدمی اپنے مسلمان بھائی کے کام میں لگا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے کام میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے لئے دوسروں میں ترغیب کے ذریعہ اکرام مسلم کا شوق پیدا کرنا ہے۔ مسلمان کی قیمت بتانی ہے۔ حضور اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ

کے اخلاق، ہمدردی اور ایثار کے واقعات سناتے ہیں خود اس کی مشق کرنی ہے اور رو رو کر اللہ تعالیٰ سے حضور اکرمؐ کے اخلاق کی توفیق مانگنی ہے۔

حسنِ نیت :-

ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا جذبہ ہو۔ کسی عمل سے دنیا کی طلب یا اپنی حیثیت بنانا مقصود نہ ہو اللہ تعالیٰ کی رضا کے جذبہ سے تھوڑا سا عمل بھی بہت انعامات دلوائے گا ـــــ رو رو کر اللہ تعالیٰ سے اخلاص مانگا جائے۔

اللہ کے راستہ کی محنت اور دُعا :-

آج امت میں کسی حد تک انفرادی اعمال کا رواج ہے۔ گو ان کی حقیقت ہوئی ہے۔ حضور اکرمؐ کی ختم نبوت کے طفیل پوری امت کو دعوت والی محنت ملی تھی۔ اس (دعوت دین کے) راستے میں ایک صبح یا ایک شام کا نکلنا پوری دنیا اور جو کچھ اس میں ہے (باعتبار عمل کے بھی اور باعتبار چیزوں کے بھی) اس سب سے بہتر ہے۔ اس راستہ میں ہر مال کے خرچ اور اللہ کے ہر ذکر و تسبیح اور ہر نماز کا ثواب سات لاکھ گنا ہو جاتا ہے۔ اس راستے میں محنت کرنے والوں کی دعائیں بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السّلام کی دعاؤں کی طرح قبول ہوتی ہیں۔ یعنی جس طرح ان کی دعاؤں پر اللہ تعالیٰ نے ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کو استعمال فرما کر ان کو کامیاب فرمایا اور باطل کے خاکوں کو توڑ دیا۔ اسی طرح اس محنت کے کرنے والوں کی دعاؤں پر اللہ تعالیٰ ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کے مظاہرے فرمائیں گے اور اگر عالمی بنیاد پر محنت کی گئی تو تمام اہل عالم کے قلوب میں ان کی محنت کے اثر سے تبدیلیاں لائیں گے

مسجدوں میں کرنے کے کام :-

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر امتی کو مسجد والا بنایا تھا۔ مسجد کے کچھ مخصوص اعمال دئے تھے۔ ان اعمال سے مسلمانوں کی زندگی میں امتیاز تھا۔ مسجد میں اللہ کی بڑائی کی، ایمان کی اور آخرت کی باتیں ہوتی تھیں۔ اعمال سے زندگی بننے کی باتیں ہوتی تھیں۔ ایمان وعمل صالح کی دعوت کے لئے ملکوں اور علاقوں میں جانے کی تشکیل بھی مسجد سے ہی ہوتی تھی۔ مسجد میں آکر آدمی داعی بنتا تھا۔ معلم اور متعلم بنتا تھا۔ ذاکر بنتا تھا۔ نمازی بنتا تھا۔ متقی وزاہد بنتا تھا۔ مطیع بنتا تھا، خلیق بنتا تھا۔ باہر جاکر ٹھیک زندگی گزارتا تھا۔ مسجد، بازار والوں کو چلاتی تھی۔ ان چار ماہ میں ہر جگہ جاکر مسجدوں میں ہر امتی کو لانے کی مشق کریں۔ مسجد والے اعمال سیکھتے ہوئے دوسروں کو یہ محنت سیکھنے کے لئے تین چلوں کے واسطے آمادہ کریں۔

چلّے، گشت، اجتماع اور ان کی دعوت دینا :-

ہر سال اہتمام سے چلّہ لگایا جائے۔ عمر میں کم از کم تین چلّے لگائے جائیں۔ اور یہی دوسروں کو تین چلوں کی دعوت خوب جم کر دیں۔ اس کے بغیر زندگیوں کے رُخ نہ بدلیں گے۔ اپنے شہر یا بستی کے قریب دیہات میں کام کی فضا بنانا اس کے لئے ہر مسجد سے تین دن کے لئے جماعتیں پانچ کوس کے علاقے میں جائیں ــــ واپس اپنے مقام پر آکر اپنی بستی کی مسجد میں ان اعمال کو زندہ کرنا ہے۔ ہفتہ میں دو مرتبہ گشت کے ذریعہ بستی والوں کو جمع کرکے ان ہی چیزوں کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ گشت کا عمل اس کام میں ریڑھ کی ہڈی کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ گشت کا موضوع یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے ہماری دنیا اور آخرت کے مسائل کا حل حضرت محمد ﷺ کے زندگی گزارنے میں رکھا ہے۔ ان کے طریقے ہماری زندگیوں میں آجائیں۔ اس کے لئے محنت کی ضرورت ہے ـــــ جس ساتھی کے بارے میں مشورہ ہوجائے وہ دعوت دے ـــــ سادے انداز میں بیان ہو ـــــ دعوت میں انبیاء علیہ السلام وصحابہؓ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو مدد یں فرمائی ہیں وہ بیان کی جائیں۔[1]

[1] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ۔ ص ۴۶۷، تا ۴۶۳

تبلیغی جماعت کی سرگرمیاں

اسلام اپنے ماننے والوں کو ایمان محکم اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ کی بھی سختی کے ساتھ تاکید کرتا ہے۔ اور جیسا کہ علمار اسلام لکھتے اور بیان کرتے ہیں کہ ایمان ایک کیفیت اور احساس کا نام ہے اور یہ کیفیت اور احساس جب تک عمل کی صورت نہ اختیار کرے کسی بھی شخص کے ایمان کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس لئے ایمان کے ساتھ عمل ضروری ہے۔ اللہ تعالےٰ نے بھی اپنے مقدس کلام میں بار بار یہی فرمایا کہ کامیابی صرف انھیں کے لئے ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح اختیار کیا۔

تبلیغی جماعت ایک دینی جماعت ہے اور ایک دینی جماعت کے تمام فکر وعمل کا انحصار کتاب وسنّت پر ہوتا ہے۔ وہ اس سے الگ نہ کچھ سوچتی ہے اور نہ کرتی ہے۔ اس کے نزدیک تمام تر کامیابی کا دارمدار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری حضرت محمدؐ کے طریقے کے مطابق کرنے میں ہے۔

تبلیغی جماعت خاص طور پر اس فکر وعمل کی بنیاد پر اٹھی ہے ـــ

"کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کا اس ذات پر یقین ہو جائے جس کے کرنے سے کام ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر،

اور اس کی حیثیت کام کرنے والے پر ایسی منکشف ہو کر اپنی
ذات اور کوئی دوسری ذات دکھائی نہ دے۔ دوسرا یقین یہ ہو کہ جب
میں ظاہر و باطن سے حضورؐ کے طریقوں پر آجاؤں گا تو رب العزت
دنیا و آخرت میں اچھے حالات لائے گا۔" [1]

چنانچہ تبلیغی جماعت نے اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان پختہ کرنے کے ساتھ ساتھ عمل پر بھی بہت زور دیا ہے۔

"اعمال سے زندگی بننے کی باتیں ہوتی تھیں۔ عملوں کے
ٹھیک کرنے کی تعلیمیں ہوتی تھیں ——— (اب ہمیں بھی)
اپنی بستی کی مسجد میں ان اعمال کو زندہ کرنا ہے" [2]

اس مقصد کے لئے جماعت نے ایک طریق کار وضع کیا ہے جو بہت سادہ ہے اور اس کے مطابق اس کی ساری عملی سرگرمیاں جاری ہیں۔

مسجد سرگرمیوں کا مرکز:

مسجد اپنے ابتدائی دور میں اپنی اصل حیثیت پر قائم تھی۔ یہ ایک عبادت گاہ بھی تھی اور درس گاہ بھی۔ فوجی اور جنگی حکمت عملی بھی یہیں تیار کی جاتی تھی اور آنے والے وفود سے ملاقات بھی مسجد میں کی جاتی تھی نیز مسجد میں ہی مقدمات کے فیصلے بھی ہوتے تھے۔ یہیں سیاست، عہدہ داروں کی تقرری، قصاص اور دیت کے فیصلے بھی ہوتے تھے۔

غرض ابتداءً مسجد مسلمانوں کی ساری عملی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے لیکن جیسے جیسے مسلمانوں کا دین سے تعلق کمزور ہوتا گیا مسجد سے

---

[1] مولانا وحیدالدین خاں، تبلیغی تحریک ص ۳۹

[2] سید محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی ص ۵۲،

بھی دوری پیدا ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ مسجد کا مصرف صرف نماز کی ادائیگی کے لئے ہو گیا۔ تبلیغی جماعت نے مسجد کی اصل حیثیت کو پھر زندہ کیا اور مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ ـــ

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر امتی کو مسجد والا بنایا تھا۔ مسجد کے کچھ مخصوص اعمال دئے تھے۔ ان اعمال سے مسلمانوں کی زندگی میں امتیاز تھا۔ مسجد میں اللہ کی بڑائی کی، ایمان اور آخرت کی باتیں ہوتی تھیں۔ اعمال سے زندگی بنانے کی باتیں ہوتی تھیں۔ عملوں کو ٹھیک کرنے کے لئے تعلیمیں ہوتی تھیں۔ ایمان وعمل صالح کی دعوت کے لئے ملکوں اور علاقوں میں جانے کی تشکیل بھی مسجد سے ہی ہوتی تھی۔ اللہ کے ذکر کی مجلسیں مسجدوں میں ہوتی تھیں۔ یہاں تعاون، ایثار، ہمدردیوں کے اعمال ہوتے تھے ـــ اور (اب) مسجدیں اعمال سے خالی ہوگئی ہیں ـــ مسجدوں میں ہر امتی کو لانے کی مشق کریں ـــ مسجد والے اعمال سیکھتے ہوئے دوسروں کو یہ محنت سیکھنے کے لئے تین تین چلوں کے لئے آمادہ کریں۔" [1]

چنانچہ تبلیغی کام کی ابتدا بستی نظام الدین کی ایک مسجد بنگلہ والی سے ہوئی اور اب ملک کے اندر اور ملک سے باہر لاکھوں مساجد تبلیغی جماعت کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔

گشت اور اجتماع :۔

دین کی تعلیم حاصل کرنا اور دوسروں تک دین کا علم پہنچانا، حالات اور واقعات کی مناسبت سے اس کے متعدد طریقے ہو سکتے ہیں۔

۱۔ دینی اداروں اور اسلامی درس گاہوں کے ذریعہ۔

۲۔ دینی لٹریچر کی اشاعت کے ذریعہ۔
۳۔ دینی اجتماعات کے ذریعہ۔
۴۔ باہمی ملاقاتوں کے ذریعہ۔

مولانا الیاس صاحبؒ نے ابتداءً دین کی اشاعت کا ذریعہ مکاتب ہی کو بنایا لیکن اس وقت کے حالات میں وہ زیادہ مفید اور کارگر ثابت نہ ہوئے۔ اور مزید غور وفکر کرنے پر یہ اہم بات سمجھ میں آئی کہ غیر دینی ماحول میں رکھ کر دین کی تعلیم دینا بیکار محض ہے۔ انسان جب تک کچھ عرصہ کے لئے ہی سہی اپنے ماحول سے الگ نہیں ہوگا۔ دین اور دینی تعلیم کا اس پر اثر نہیں ہوگا۔

چنانچہ تبلیغی جماعت میں اپنے ماحول سے باہر نکلنا، گشت اور اجتماعات کرنا ایک ضروری امر ہے۔ تبلیغی جماعت سے وابستہ ہر شخص اپنی مسجد کے ماحول میں، بستی کی دوسری مساجد کے ماحول میں اور بعد ازاں بستی سے باہر نکل کر گشت کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ گشت کا عمل تبلیغی جماعت کے نکتہ نظر سے اتنا اہم ہے کہ ـــــ

"گشت قبول نہ ہوا تو دعوت قبول نہ ہوگی، دعوت قبول نہ ہوئی تو دعا قبول نہ ہوگی ـــــ دعا قبول نہ ہوئی، ہدایت نہیں آئے گی۔"[1]

اس گشت کے ذریعہ دوسرے مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا جاتا ہے۔ انھیں دین کی تعلیم دی جاتی ہے اور گھر سے باہر نکلنے اور دین کے لئے کچھ وقت دینے کو آمادہ کیا جاتا ہے اور اس کے لئے بہت سے نئے لوگ آمادہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے تبلیغی جماعت کے قائدین حضرات کہتے ہیں کہ "گشت کا عمل اس کام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔"[2]

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ ص ۵۲،
[2] " " " " " ص ۵۳،

چلّے لگانا :-

تبلیغی جماعت میں چلّے دینا جماعت کی ایک پہچان بن گیا ہے۔ اپنے ماحول سے بچنے اور دور رہنے کے لئے کچھ ہی مدت کے واسطے سہی، ضروری ہے کہ ــــــ

"ہر سال اہتمام سے چلّہ لگایا جائے (اور) عمر میں کم از کم تین۳ چلّے۔ (دوسروں کو بھی) عمر میں کم از کم تین۳ چلّوں کی دعوت خوب جم کر دی جائے۔ اس کے بغیر زندگیوں کے رُخ نہیں بدلیں گے"[۱]

تبلیغی جماعت میں چلّے لگانا اور اس کی دعوت دینے کا کام بڑے اہتمام سے ہوتا ہے۔ ایک ایک وقت میں ہزاروں لاکھوں انسان چلّے کے نام سے ملک اور بیرونِ ملک تبلیغی سفر پر رواں دواں ہوتے ہیں۔ ان میں بوڑھے، جوان اور نوعمر بھی ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں اور اَن پڑھ جاہل بھی، کالج اور یونیورسٹیوں کے استاد و طلبار بھی ہوتے ہیں اور دینی مدارس سے وابستہ حضرات بھی۔

یہ لوگ قریہ قریہ، بستی بستی، شہر در شہر، اور ملکوں ملکوں جاتے ہیں تاکہ اس طرح اپنے دائمی اور جامد ماحول سے نکل کر ایک نئے، صالح اور متحرک ماحول میں جائیں۔ دین کے لئے محنت و مشقت کرنے کی عادت پڑے اور خود دین سیکھیں اور دوسروں کو دین سکھائیں۔

"اس طرح بے شمار قافلے آج ساری دنیا میں اپنے قدموں کو دین کی راہ میں گرد آلود کر رہے ہیں۔ شاید چوبیس۲۴ گھنٹے میں کوئی وقت ایسا نہیں ہوگا جبکہ دین کے لئے یہ

---

[۱] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی، ص ۵۴۳۔

نقل و حرکت کہیں نہ کہیں جاری نہ ہو۔" [1]

پناہ گزینوں میں تبلیغی کام:۔

بعض ناواقف یا کم واقف لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تبلیغی جماعت کے ارکان کا سارا عمل ذکر و تلاوت اور کلمہ و نماز تک محدود ہے۔ عام انسانی مسائل اور ان کے بہت سے دوسرے معاملات سے قطعی کوئی سروکار نہیں ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تبلیغی جماعت یقینی طور پر انسان کے روحانی اور اخلاقی ارتقاء کی داعی ہے لیکن اس نے انسان کی مادّی ضرورت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب کے فساد زدہ مسلمان اپنے اپنے گھروں سے اجڑ کر دہلی آ گئے تھے اور ان پناہ گزینوں کا ایک بڑا پڑاؤ جامع مسجد کے سامنے میدان میں تھا۔

ان اُجڑے اور تباہ حال مسلمانوں کی اکثریت دین سے ناواقف حتّیٰ کہ انھیں کلمہ تک یاد نہیں تھا۔ غذا اور لباس کے جس قدر ضرورت مند تھے، اس سے کہیں زیادہ کلمہ و نماز سے واقف ہونے کے محتاج تھے۔

چنانچہ ارکان جماعت نے ان پناہ گزینوں میں پہنچ کر کام کرنا شروع کیا جبکہ کرفیو لگا ہوا تھا اور فوج کا سخت پہرہ تھا۔

تبلیغی جماعت نے مچھلی والوں کی مسجد میں (جو جامع مسجد کے سامنے والے میدان کے جنوب میں واقع ہے) پڑاؤ ڈالا۔ میدان میں جانا دشوار تھا لیکن موقع پاکر تیزی سے میدان میں پہنچ جاتے اور پناہ گزینوں میں کام کرتے۔

(ان پناہ گزینوں کی)، اخلاقی پستی، دینی بدحالی، دنیوی مصیبت کا طوفان (جس نے ہر دردمند دل کو تڑپا دیا تھا) تبلیغی جماعتوں نے موت سے بے پرواہ

---

[1] مولانا وحیدالدین خاں، تبلیغی تحریک ص ۸

ہو کر سر سے کفن باندھا اور بے خطر شب و روز ان میں کام کرنا شروع کر دیا[1]
تبلیغی جماعت اور اس سے وابستہ لوگوں نے ان پناہ گزینوں میں دین کی تبلیغ بھی کی اور ان کی مادّی ضروریات کو بھی پورا کیا۔ جبکہ دوسری بہت سی تنظیمیں اور جماعتیں صرف ان کی مادّی ضروریات پورا کرنے کی خدمت میں لگی ہوئی تھیں۔

وہ حضرات جو اس وقت دہلی میں اچھے عہدوں پر فائز تھے اور ان کا تعلق تبلیغی جماعت سے تھا، مادّی ضروریات، جیسے ان پناہ گزینوں کی غذا اور لباس وغیرہ کے انتظام میں مشغول تھے لیکن مولانا اس مصیبت کے حقیقی اسباب پر نظر رکھتے ہوئے ان میں تبلیغی کام پر زور دے رہے تھے۔ (ان کا کہنا تھا) کہ اس وقت ان کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں یہ آپ کے کام کرنے سے خدا کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جائیں گے تو عذاب ٹلے گا۔[2]

خواتین میں تبلیغ کا کام:

دین کا کوئی کام ہو یا کوئی دنیاوی کام ہو، عورت کی شمولیت کے بغیر وہ ادھورا رہتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ عورت انسانیت کا نصف بہتر ہے۔ انسانیت کی تکمیل جب ہی ممکن ہے کہ جب مرد کے ساتھ عورت بھی شریک کار ہو۔ اسلام کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب صدیوں کی دبی کچلی، ذلیل اور بے حیثیت بنائی ہوئی عورت کو اسلام نے اس کا صحیح اور جائز مقام عطا کیا تو خواتین اسلام نے وہ عظیم کارنامے انجام دئے جو آج ہماری تاریخ کی زیب و زینت ہیں۔

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی ص ۲۶۹ / ۲۷۰

[2] " " " " " ص ۲۶۹

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان خواتین نے اپنے دین کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ اس کے لئے انھوں نے قریب ترین تعلقات اور رشتوں پر چھری پھیر دی۔ خاندان اور قبیلے سے جنگ مول لی۔ مصیبتیں سہیں، گھر بار چھوڑا غرض یہ کہ مفاد دین سے ان کا جو بھی مفاد ٹکرایا۔ اسے ٹھکرانے میں انھوں نے کوئی تامل اور پس و پیش نہیں کیا اور آخری وقت تک' اپنے رب سے وفاداری کا جو عہد کیا تھا اس پر کوئی آنچ نہ آنے دیں۔ [۱]

مسلم خواتین کے ان عظیم کارناموں اور اعلیٰ خدمات سے کوئی بھی دینی تخصیت اور جماعت ناواقف نہیں ہو سکتی جب بھی کوئی فرد یا جماعت دین کا کام کرنے کے لئے اٹھے گی۔ خواتین کی ان گزشتہ خدمات کے پیش نظر انھیں کس پہلو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

جرأت قلب اور ہمت مردانہ اس صنف کی مرہون منت ہے جس کو صنف نازک سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ یہ عورت ہی ہے کہ جو بچوں کو اپنا خون جگر پلاکر ان کو دین اور قوم و ملت پر قربان کرنے کے لئے تیار کرتی ہے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ قوم کی قوتوں کا اصل مخزن اس کی خواتین ہیں۔ جن کو نظر انداز کرنا قوم کو طاقت سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ [۲]

تبلیغی جماعت بھی اس صداقت سے واقف ہے۔ اس نے مردوں کے ساتھ خواتین کو بھی دعوت دین میں شامل کر رکھا ہے اور ان کی حقیقی ضرورت کو پوری طرح محسوس کیا ہے۔

مولانا جس طرح مردوں میں دینی دعوت کا کام ضروری سمجھتے تھے اسی طرح عورتوں میں بھی اس کام کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے۔ اس لئے کہ عورتوں کی خدمات

---

[۱] سید جلال الدین عمری، عورت اسلامی معاشرت میں، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ دہلی ص، ۱۴۳

[۲] محمد ایوب اصلاحی، عورت تہذیب کے دوراہے پر، سلامک پبلشر، رام پور ص ۱۰

سے مردوں اور بچوں میں دینی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے اور عورتوں کی خدمات سے ہی مردوں کی کوتاہی دور ہو کر اس کام میں لگنے کی راہیں کھلتی ہیں۔ [1]

لیکن خواتین میں دعوت دین کا طریقہ یہ ہوگا ـــــ

عورتوں کی تبلیغ میں صرف یہ کیا جاوے کہ عورتیں دینی کتب پڑھیں پڑھائیں، سنائیں۔ اسلامی رواج کی پوری پابندی کریں اور اپنے متعلقین کو بھی اس کا پابند کریں۔ اپنے مردوں کو دین سیکھنے کے لئے تبلیغ کے تحت باہر بھیجیں تاکہ جو کچھ سیکھ کر آئیں وہ ان کو سکھائیں (عورتوں کو)۔ گشت کی قطعاً اجازت نہ دی جائے۔ [2]

طلباء میں دعوتی کام :-

نوجوان قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اور اس اعتبار سے تعلیم یافتہ نوجوانوں یا طلباء کی حیثیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

یہی ریڑھ کی ہڈی اگر ذرا کمزور ہو جائے تو قومی یا ملی جسم پریشانی اور تکلیف میں مبتلا ہو جائے گا تو ضروری ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو راہ راست سے وابستہ کیا جائے انھیں زندگی کی بے راہ رویوں اور کمزوریوں سے بچا کر زندگی کی صحیح اور سیدھی راہ پر گامزن کیا جائے تاکہ وہ قوم و ملت کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکیں۔

دینی جماعتیں اور تحریکیں نوجوانوں کی صلاحیتوں کو صحیح سمت عطا کرنے کا بہت واضح شعور رکھتی ہیں۔ چنانچہ دنیا کی کوئی بھی دینی جماعت یا تحریک نوجوانوں اور خاص طور پر طلباء سے بے تعلق نہیں ہے۔

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی ص ۴۲،

[2] " " " " " " ص ۴۲،

طلبا اور نوجوانوں میں تبلیغی جماعت نے دین کی دعوت کا کام بہت بڑے پیمانے پر کیا ہے اور ابتداءً طلبا کے تعلق سے جو ایک شدید خواہش تھی کہ۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا میں اس کام کو اٹھایا جائے۔ ہوسٹلوں میں مقامی کام کے لئے جماعتیں بنائی جائیں۔ ایک گشت ہوسٹل والے اپنے ہوسٹل میں کریں اور ہفتہ کا دوسرا گشت باہر کسی محلہ میں یا کسی دوسرے ہوسٹل میں کریں۔ قریب کے محلوں کی جماعتیں بھی ہوسٹلوں میں جاکر گشت کریں۔ ہوسٹل والے احباب اپنی روزانہ کی تعلیم اور مہینہ میں تین یوم کی بھی ترتیب اٹھائیں۔[1]

اس خواہش یا ہدایت کو عملی شکل دی گئی۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو ہدف بنایا گیا اور کام شروع کر دیا گیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جہاں اساتذہ اور طلبا مغرب کے مادہ پرستانہ طرزِ فکر کے حامل نصاب تعلیم کے باعث دین کے قدر داں نہیں رہے تھے، بلکہ دین اور دینی احکام کی مخالفت کو باعث فخر سمجھتے تھے تبلیغی جماعت نے نمایاں طور پر مسلم یونیورسٹی کا انتخاب کیا اور اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کئی سال سے کام ہو رہا تھا اور وہاں کے طلبا، برابر مرکز نظام الدین آتے جاتے تھے اور مولانا کی تقریریں سنتے تھے۔ مولانا کی تقریروں اور مجلس گفتگوؤں سے علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ میں ایمان ویقین کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اور یونیورسٹی کے طلبا و اساتذہ... دوسری یونیورسٹی کے کالجوں کے طلبا میں کام کرنے لگے۔ ان میں سے کئی تعلیمی سلسلہ میں یورپین ممالک بھی گئے اور انھوں نے وہاں پر کام کیا۔[2]

تبلیغی جماعت نے مسلم یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ کا نقشہ ہی بدل

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا یوسف کاندھلوی ص ۶۹۲

[2] مولانا وحید الدین خان، تبلیغی تحریک ص ۷۰

دیا ہے۔

علی گڑھ میں آج ایک دینی فضا معلوم ہوتی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ صرف چند سال پہلے کی بات ہے کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب وہاں تقریر کرنے کے لئے تشریف لائے لیکن اس وقت طلبار میں دین کے استخفاف کا ایسا ذہن تھا کہ فقرے بازی اور شور وغل کی وجہ سے مولانا اپنی تقریر مکمل نہ کر سکے اور قبل از وقت اٹھ کر چلے آئے۔ اب پچھلے سال وہ دوبارہ یونیورسٹی میں آئے اور ڈھائی تین ہزار کے مجمع میں ان کی تقریر ہوئی مگر سارا مجمع آخر تک ساکت وجامد بنا رہا۔ یونیورسٹی کی فضا میں یہ تبدیلی تبلیغی جماعتوں کا ثمرہ ہے۔ ہر ہوسٹل میں باقاعدہ مسجد اور امام اور مؤذن کا انتظام ہے دینی امور کی نگرانی کے لئے ایک مستقل ناظم کا عہدہ ہے۔ سیکڑوں طلبار میں جن کے اندر خدا ترسی، نماز با جماعت، نوافل، خدمت خلق، انفاق، دعا ذمہ داری اور اسلامی وضع قطع کی صفات پیدا ہو گئی ہیں۔ [1]

بڑے اجتماعات :-

تبلیغی جماعتوں کی جانب سے مساجد میں اجتماع اور تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور ان چھوٹے چھوٹے اجتماعات سے ایک خاص حلقہ کے لوگ فیض یاب بھی ہوتے ہیں لیکن تبلیغی جماعت اکثر بڑے اجتماعات بھی منعقد کرتی ہے۔ ان اجتماعات کے انعقاد میں ابتدائی کئی مقاصد شامل تھے۔

(آزادی کے بعد) جب حالات کچھ بہتر ہوئے اور مختلف علاقوں میں اجتماعات کرنے کے راستے کھلے تو مولانا نے اجتماعات کی ابتدا فرمائی۔ اس لئے کہ اجتماعات سے ٹوٹے ہوئے دلوں کو قوت اور اکھڑے ہوئے قدموں کو ثبات

---

[1] مولانا وحید الدین خاں، تبلیغی تحریک ، ص ۷۰

ملتا تھا۔ جہاں جہاں اجتماعات ہوئے وہاں پر ہمت اور جرأت کی فضا پیدا ہوگئی۔[1]

تبلیغی جماعت کے زیر اہتمام جگہ جگہ بہت سے عام اجتماعات ہوئے جن میں سے چند مقامات کے نام یہ ہیں :

رائے پور کا اجتماع :

ہندوستان کی آزادی کے بعد تبلیغی جماعت کا یہ سب سے پہلا اجتماع تھا۔ یہ اجتماع ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو ہوا تھا۔ رائے پور سہارن پور سے تقریباً ۲۱، ۲۲ میل دور ایک قصبہ ہے جس میں حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوری اور حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کا قیام رہا ہے۔ ان حضرات کی وجہ سے اس قصبہ کی اہمیت کافی بڑھ گئی تھی۔

کرسی کا اجتماع :

یہ ضلع بارہ بنکی کا ایک قصبہ ہے۔ یہاں پر ۱۹ مئی ۱۹۴۸ء میں ایک بڑا اجتماع ہوا۔ اس پر آشوب دور میں اس نواح میں اتنا بڑا اجتماع دیکھنے میں نہیں آیا۔

نوح کا اجتماع :

قصبہ نوح ضلع گڑگانواں کے اس اجتماع میں مرکز کے اکابرین کے علاوہ دوسرے علماء حضرات نے بھی شرکت فرمائی میوات کے اہل تعلق اور کثیر تعداد میں میوائی شریک ہوئے

مگراہاٹ کا اجتماع :۔ مگراہاٹ کلکتہ کے مضافات میں ہے۔ کلکتہ کے اطراف کے لوگ ایک عرصہ سے ایک تبلیغی اجتماع کے

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ ص ۳۰۹

آرزومند تھے اس تبلیغی اجتماع کا یہاں کے ماحول پر بہت خوشگوار اثر پڑا۔
یہ اجتماع ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ (ستمبر ۱۹۴۹ء) میں منعقد ہوا تھا۔ [۱]

کیرانہ کا اجتماع :-

کیرانہ ضلع مظفر نگر کا تبلیغی اجتماع بعض حیثیتوں سے بڑا نمایاں تھا۔ اس اجتماع میں ایک بڑی تعداد میں باہر کی جماعتوں نے بھی شرکت کی۔ اس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بعض طلبار بھی شریک ہوئے۔ یہ اجتماع صفر ۱۳۷۱ھ (نومبر ۱۹۵۱ء) میں ہوا تھا۔ [۲]

بھوپال کا اجتماع :

صوبہ مدھیہ پردیش کا دارالحکومت بھوپال مسلمانوں کا ایک بڑا دینی اور تہذیبی مرکز رہا ہے۔ ایک زمانہ میں اسے ایک اہم تعلیمی اور دینی مرکز ہونے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ یہاں ایک بڑا تبلیغی اجتماع فروری ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد بھوپال میں ہر سال ملک گیر سطح کا اجتماع ہونے لگا۔ یہاں کے تبلیغی اجتماعات شرکار کی تعداد کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دیگر کالجوں کے مسلم طلبار اور غیر ملکی جماعتیں بھی بڑی تعداد میں بھوپال کے اجتماعات میں شرکت کرتی ہیں۔

کانپور کا اجتماع :

یہ اجتماع مسلم حلیم انٹر کالج کے وسیع میدان میں مئی ۱۹۵۲ء (شعبان ۱۳۷۱ھ)

---

[۱] عیسوی تاریخ مفتاح التقویم از حبیب الرحمٰن صابری، ناشر ترقی اردو بورڈ نئی دہلی سے لی گئی۔
[۲] ایضاً

میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع نے خاص طور پر کانپور کے ماحول پر بڑا اچھا اثر ڈالا۔ کانپور کا شاید ہی کوئی ایسا محلہ ہوگا جہاں تبلیغی جماعتیں نہ گئی ہوں۔ اس اجتماع سے کان پور میں کام بہت بڑھ گیا۔ اب آسانی سے دور و نزدیک کی جماعتیں نکلنے لگیں اور یہاں کے لوگوں کی مرکز نظام الدین میں بھی آمد و رفت بڑھ گئی۔

مراد آباد کا اجتماع :

یہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اہم اور بڑا اجتماع تھا۔ قرب وجوار کی بہت سی جماعتیں شریک ہوئی تھیں۔ ان میں سے کئی جماعتیں ہندوستان کے دوسرے مقامات کے علاوہ عرب ممالک میں بھی متعدد بار گئیں۔ حجاز میں تبلیغی کام کا سہرا مراد آباد کے لوگوں کے ہی سر ہے۔ مراد آباد کا یہ دوسرا بڑا اجتماع تھا اور اپریل ۱۹۵۳ء میں منعقد ہوا تھا۔

اجراڑہ ضلع سہارنپور کا اجتماع :

ضلع سہارنپور کا یہ ایک بڑا تبلیغی اجتماع تھا جو تین دن برابر جاری رہا۔ اس اجتماع میں بہت دور دور سے لوگ شریک ہوئے۔ یہ اجتماع اپریل ۱۹۵۳ء (مطابق شعبان ۱۳۷۲ھ) میں ہوا۔

بستی کا اجتماع :

اس ضلع میں کئی اجتماعات ہوئے اور ان اجتماعات میں دوسرے صوبوں اور اضلاع سے آکر بھی جماعتوں نے شرکت کی۔ بستی کا یہ اجتماع مئی ۱۹۵۸ء (مطابق شوال ۱۳۷۷ھ) میں منعقد ہوا تھا۔

آگرہ کا اجتماع :۔

اب سے پہلے یہاں چھوٹے موٹے بہت سے تبلیغی اجتماعات ہو چکے تھے۔ لیکن یہ ایک سہ روزہ بڑا اجتماع تھا۔ اس اجتماع کا آگرہ کے اطراف میں بہت اثر پڑا۔ یہ اجتماع جولائی ۱۹۵۸ء (مطابق ۱۳۷۸ھ) میں ہوا۔

سیتاپور کا اجتماع :۔

اس اجتماع میں ضلع سیتاپور کے سارے علاقوں کے ہزاروں مسلمان شریک ہوئے جبکہ یہ کوئی بڑا ضلع نہیں ہے۔ یہاں لکھنؤ، کانپور اور مشرقی اضلاع کی بہت سی جماعتیں بھی شریک ہوئیں۔ یہ اجتماع مشرقی یو، پی کے کامیاب اجتماعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ اجتماع دسمبر ۱۹۵۸ء (مطابق جمادی الاوّل ۱۳۷۸ھ) میں ہوا۔

لکھنؤ کا اجتماع :۔

یہ اجتماع بڑے اہتمام سے منعقد ہوا۔ یہاں سے ملک اور بیرون ملک بہت سی جماعتیں نکلیں۔ اس تبلیغی اجتماع کا انعقاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وسیع احاطہ میں ہوا۔ یہ اجتماع دوسرے بہت سے اجتماعات کے مقابلے میں بڑا کامیاب اور موثر ثابت ہوا۔

ان مقامات کے علاوہ تبلیغی جماعت کے بڑے بڑے اجتماعات جو عام مسلمانوں کے لئے فیض رسانی کا باعث بنے دوسرے بہت سے مقامات پر بھی ہوئے مثلاً گڑھی دولت پور، اجراڑہ، پھپھر گڑھ، ڈاسنا، سیکری، بڑوت، گنگوہ، مالیگاؤں نہٹور، پنڈوہ، کاوی، مراد نگر، اور بہت وغیرہ لکھنؤ کا یہ اجتماع فروری ۱۹۶۰ء (مطابق ۱۳۷۹ھ) میں منعقد ہوا۔

بیرونی ممالک میں تبلیغی جماعت کی سرگرمیاں :-

ملک کے اندر تبلیغی جماعت کا کام بڑھنے کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک کے لئے بھی جماعتیں نکلنا شروع ہوئیں۔ عرب ممالک پر خاص توجہ دی گئی اس لئے کہ سرزمین عرب سے دنیا کے مسلمانوں کا جو جذباتی تعلق ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس جیسے مبارک شہر آباد ہیں جن کی زیارت کو ہر مسلمان کی آنکھ ترستی ہے اور جن پر فدا ہونے کے لئے ہر مسلمان کا دل بیقرار رہتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حجاز و عرب کے دوسرے اکثر ممالک میں صحابہ کرامؓ کے مبارک قدم پڑے۔ حق و باطل کے درمیان معرکہ ہوئے اور اسلامی پرچم لہرائے —— پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرہویں صدی کے آخر تک عرب ممالک کو دنیا کے نقشہ میں نمایاں اور ممتاز جگہ حاصل تھی۔ اور اسلام کا رعب پوری دنیا پر قائم تھا۔

عرب ممالک کے علاوہ دوسرے ایشیائی مسلم اور غیر مسلم ممالک میں تبلیغی جماعت کی نقل و حرکت عمل میں آئی جیسے افغانستان، ترکی، انڈونیشیا، ملایا، برما اور سری لنکا وغیرہ افریقہ، یورپ اور امریکی ممالک میں بھی تبلیغی جماعت نے اپنی مسلسل اور انتھک کوششوں کے نتیجے میں ایک نیا ماحول اور ایک نیا احساس پیدا کر دیا۔

۱؎ سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ ص ۴۲۶، ۴۲۷

تبلیغی جماعت کا تنقیدی جائزہ

اللہ تعالیٰ نے ایک نحیف و نزار انسان مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو اپنے خصوصی فضل و کرم سے نوازہ اور دین کی ایک ایسی عظیم خدمت کے لئے مامور کیا جو ایک آب جو سے آج سمندر کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

تبلیغی جماعت کے تحت آج کرۂ زمین پر بے شمار قافلے اپنے قدموں کو دین کی سربلندی کے لئے گرد آلود کر رہے ہیں اور غالباً دن و رات میں کوئی ایسا وقت نہیں ہوگا جبکہ دین کے لئے چلت پھرت جاری نہ ہو۔

تبلیغ دین کے نام سے ساری دنیا میں یہ چلت پھرت ابتداءً ایک کمزور و ناتواں انسان کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

ہرچند مولانا الیاس صاحبؒ کی یہ تاکید رہی ہے کہ ان کی دعوت کو ان کی شخصیت سے وابستہ نہ کیا جائے بلکہ مولانا محترم کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ دعوت کے تعارف کے سلسلے میں بھی ان کا نام نہ لیا جائے لیکن تبلیغی جماعت کا جائزہ لینے والے کسی بھی شخص کے لئے یقیناً یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ تبلیغی جماعت کی کسی بھی پہلو اور رُخ سے بات ہو اور مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور بعد ازاں مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا تذکرہ نہ آئے۔

تبلیغی جماعت اور یہ دونوں بزرگ حضرات ایک دوسرے کے ساتھ گوشت

اور ناخن کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تبلیغی جماعت کے جائزہ میں ان حضرات کا ذکر لازمی حیثیت رکھتا ہے۔

دین کی دعوت کا کام کوئی نو ایجاد یا اختراعی چیز نہیں ہے بلکہ قرآن پاک کے اصول دعوت اور حضرت محمدؐ کا طریقۂ دعوت اس کام کی اصل اور بنیاد ہے اور کوئی بھی فرد یا جماعت اس اصل اور بنیاد سے صرف نظر کر کے دین کی دعوت کا کام صحیح طریقہ پر انجام نہیں دے سکتی۔

"اس کی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ کہ ہر قوم اور ملت کا ایک مزاج ہوتا ہے جب تک پیش نظر اصلاح و تجدید کا کام قوم و ملت کے مزاج کے مطابق نہ ہوگا اس کو کامیابی اور سرسبزی حاصل نہ ہوگی۔

لہٰذا ضروری ہے کہ دین کی دعوت کا کام کرنے والا ہر فرد اور جماعت، اپنے علم و عمل، فکر و نظر، طریقہ دعوت اور ذوق و حال میں انبیاء علیہم السّلام اور خصوصاً حضرت محمّد صلے اللّٰہ علیہ وسلم سے ایک خاص مناسبت رکھتا ہو۔ صحتِ ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ اس کے باطنی احوال بھی منہاج نبوّت پر ہوں۔ محبتِ الٰہی اور خشیت الٰہی سے اس کا دل معمور ہو۔ اخلاق و عادات و شمائل میں اتباع سنن نبوی کی کیفیت ہو، حب اللّٰہ، راحت و رحمت بالمسلمین، اور شفقت علی الخلق اس کی دعوت کا محرک ہو اور انبیاء علیہم السّلام کے بار بار دہرائے ہوئے اصول کے مطابق سوائے اجر الٰہی کی طلب کے کوئی مقصود نہ ہو۔[1]

ان اصولوں اور کسوٹی پر تبلیغی جماعت کے کام اور اس کے داعیٔ اوّل کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب لکھتے ہیں :۔

"مولانا کی دعوت بڑی عمیق اور اصولی دعوت ہے جو محض غلبہ حال کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللّٰہ تعالیٰ کی خاص عنایت و توفیق کے

---

[1] مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت ص ۷، ۸

ساتھ اصول دین میں بہت گہرے غور و تدبر، قرآن و سنت، کے مطالعہ و تفکر، دین کے مزاج و طبیعت سے واقفیت اور صحابہ اکرامؓ اور قرونِ اوّل کے طرز زندگی کے وسیع اور گہرے علم پر مبنی ہے۔" [۱]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"مولانا فرماتے تھے کہ مدینہ طیبہ کے اس قیام کے دوران میں مجھے اس کام کے لئے امر ہوا اور ارشاد ہوا کہ ہم تم سے کام لیں گے کچھ دن میرے اس بے چینی میں گزرے کہ میں ناتوان کیا کر سکوں گا؟ کسی عارف سے ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ پریشانی کی کیا بات ہے۔ یہ تو نہیں کہا گیا کہ تم کام کروگے۔ یہ کہا گیا ہے کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ بس کام لینے والے کام لیں گے۔" [۲]

میاں محمد عیسیٰ صاحب مصنف "تبلیغ کا مقامی کام" اس امر کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"اللہ رب العزت کو آپ کی یہ کیفیت پسند آگئی اور اللہ نے محض اپنے لطف و کرم سے اس گمراہی کے دور میں ہدایت پر آنے کے اصول آپ پر الہام فرمائے۔ ان کے ملنے کے بعد آپ کے چہرہ پر انوار کا پرتو محسوس کیا گیا اور آپ کی طبیعت میں سکون و طمانیت محسوس ہونے لگی اور آپ پر تقاضا ہو گیا کہ جلد از جلد ہندوستان چلنا ہے۔" [۳]

---

[۱] مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت ص ۲۳

[۲] " " " " " " " ص ۷۷، ۷۸

[۳] میاں محمد عیسیٰ، تبلیغ کا مقامی کام ص ۴۷

محمد عیسیٰ صاحب مزید فرماتے ہیں:۔

"اصل بات یہ ہے کہ اصولوں کا متن حضرت مولانا الیاس صاحبؒ پر اللہ نے کھولا تھا اور ان کی تشریح حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ سے کرائی تھی۔ اب بعد والوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کو معلوم کرتے رہیں اور ان پر جم کر کام کرتے رہیں کیوں کہ اصل اصول وہی ہیں جو یہ حضرات بتلا گئے ہیں۔" [۱]

بہر حال جو کام بھی اللہ کی ہدایت کے مطابق اس کی رضا اور خوشنودی کے لئے اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقہ پر کیا جائے گا اللہ اس کام کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرے گا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اپنے مضمون "ایک اہم دینی تحریک" میں تبلیغی جماعت کے کام کی کامیابی اور مولانا الیاس صاحبؒ کی کوششوں کے نتیجہ کے طور پر لکھتے ہیں:

"مولانا نے عام دیہاتیوں کے اندر تبلیغ و اصلاح اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایسی اسپرٹ پیدا کر دی ہے کہ جو لوگ کل تک خود گمراہ تھے وہ اب دوسروں کو راہ راست بتاتے پھرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کے کاموں سے فرصت پانے کے بعد مختلف قریوں سے ان دیہاتیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ تبلیغ کے لئے نکلتے ہیں۔ گاؤں گاؤں پہنچ کر لوگوں کو خیر و صلاح کی طرف دعوت دیتے ہیں ان کا رخت سفر ان کے کاندھوں پر ہوتا ہے کسی پر اپنا بار نہیں ڈالتے نہ کسی سے اپنے لئے کچھ طلب کرتے ہیں محض اللہ کی خوشنودی ان کے پیش نظر ہوتی ہے اور بے غرضانہ

---

[۱] میاں محمد عیسیٰ، تبلیغ کا مقامی کام ص ۴۷

کام کرتے ہیں اس لئے جہاں جاتے ہیں دیہات اور قصبات کی آبادیوں پر ان کا غیر معمولی اثر ہوتا ہے مجھے معلوم ہوا کہ بسا اوقات یہ لوگ پیدل گشت کرتے ہوئے دو دو سو میل تک چلتے جاتے ہیں اور جن جن بستیوں پر ان کا گزر ہوتا ہے وہ مذہبی بیداری اور کلمہ و نماز کے نور سے منور ہو جاتی ہیں۔" ؎۱

سید مودودی صاحبؒ مزید لکھتے ہیں۔

"خود مجھے بھی ان میں سے بعض بدوی مبلغین سے بات کرنے کا اتفاق ہوا اور ان کی سیدھی سادی زبانوں سے جب میں نے ان کے مقاصد اور ارادے سنے تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ آغاز اسلام میں عرب بدوؤں کو جس روح نے صراط مستقیم کی تبلیغ کے لئے اٹھایا تھا۔ وہی روح ان لوگوں میں پیدا ہو رہی ہے ایک جاہل کسان سے میں نے پوچھا کہ تم دورے کیوں کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ ـــــــ ہم جہالت میں پڑے ہوئے تھے نہ ہم کو خدا کی خبر تھی نہ رسولؐ کی اس مولوی کا خدا بھلا کرے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ بتایا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں تک بھی یہ نعمت پہنچائیں جو ہمیں ملی ہے۔

یہ الفاظ سن کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہی جذبہ تو تھا جس سے مخمور ہو کر صحابہ اکرام اٹھے تھے اور اس طرح اٹھے تھے کہ انھیں اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔" ؎۲

؎۱ ماہنامہ زندگی، ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ ص ۱۵

؎۲ ماہنامہ زندگی، ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ ص ۱۶

تبلیغی جماعت کا یہ مطالبہ کہ دین سیکھنے اور سکھانے کے لیے کچھ مدت کے واسطے اپنے گھروں سے نکلیں۔ اس مطالبہ پر عمل کرنے کے نتیجے میں انسان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب بیان فرماتے ہیں :

"اس ایک سفر کا وہ اثر ہوتا ہے جو اپنے ماحول میں برسہا برس کی کوشش اور مدرسوں اور خانقاہوں کے مہینوں کے قیام میں نہیں ہوتا۔ چنانچہ جو لوگ سفر سے واپس آتے ہیں وہ عملی اور اخلاقی حالت اور اپنے جذبات میں بالکل ممتاز ہوتے ہیں۔ ان کو جو اسلامی تربیت و تہذیب حاصل ہوتی ہے وہ بعض اوقات دینی مرکزوں میں رہنے والوں میں نظر نہیں آتی جس مقصد کے لئے وہ گھر بار اور مشاغل چھوڑتے ہیں وہ ہر وقت ان کے پیش نظر اور ان کے قلب و ذہن پر طاری رہتا ہے۔ تربیت یافتہ لوگوں کی رفاقت اہل دین اہل علم اصحاب کی خدمت میں حاضری سے ایسا دینی سلیقہ اور ادب پیدا ہو جاتا ہے جو دینی مدارس کے طلبا اور خانقاہوں کے اہل ارادت میں بھی کم پایا جاتا ہے۔ وہ دین کو (تبلیغی جماعت کے طریقہ کار کے مطابق) چونکہ اس کے بالکل فطری اور زندہ طریقہ پر حاصل کرتے ہیں اس لئے ان کی دین داری غیر متوازن اور غیر مناسب نہیں ہوتی کہ ان کی عبادت کا پہلو بالکل مکمل ہو اور اخلاق و معاملات کا پہلو بالکل ناقص ہو جائے۔ ان میں ایک طرف ذوق عبادت اور روحانیت ہوتی ہے تو دوسری طرف جفاکشی، مکمل مجاہدہ تواضع، خدمت کا ذوق اور مجاہدانہ روح بھی ہوتی ہے۔"[1]

---

[1] سید ابوالحسن علی ندوی، ایک اہم دینی دعوت ص ۴۳، ۴۴

مولانا وحید الدین خاں صاحب کہتے ہیں کہ تبلیغی جماعت اپنی بعض اہم خصوصیات کے باعث عصر حاضر کی دوسری تمام دینی جماعتوں سے ممتاز ہے اور اس کی وہ خصوصیات یہ ہیں :-

۱۔ "بنگلہ والی مسجد" کی اس دنیا میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلی چیز جو آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہے وہ یہاں کا مجمع ہے (جس کو دیکھ کر انسان سوچتا ہے کہ) آخر وہ کیا چیز ہے جو ان بے شمار انسانوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ یہ سب سے پہلا سوال ہے جو نو وارد کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے مگر قبل اس کے کہ وہ کسی سے پوچھ کر اس کا جواب معلوم کرے وہ خود اس کا جواب پا لیتا ہے۔ جب وہ یہاں کے پروگراموں میں شریک ہوتا ہے۔ یہاں کی باتوں کو سنتا ہے، یہاں کی بلبلا دینے والی دعاؤں پر آمین کہتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک غیر معمولی تسخیری قوت ہے جو اس کے دل و دماغ پر قبضہ کیے جا رہی ہے۔ کوئی روحانی مقناطیس ہے جو بے پناہ کشش سے اس کو اپنی طرف کھینچے چلا جا رہا ہے۔

۲۔ (ایک اور خصوصیت) جو ایک نو وارد یہاں محسوس کرتا ہے (وہ یہ ہے کہ جب) اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "مرکز تبلیغ" دوسری جماعتوں اور پارٹیوں کے مراکز سے کسی قدر مختلف ہے۔ تمام جماعتیں خواہ وہ دینی یا غیر دینی، بلا استثناء ان کے مراکز آج ایک "دفتر" میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ جماعتوں اور پارٹیوں کے مراکز میں جا کر کوئی شخص ان کی تحریک کو نہیں پاتا۔ اور یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا فرق ہے جو نظام الدین کی اس بنگلہ والی مسجد کو مدینہ کی قدیم مسجد نبویؐ سے مشابہ کر دیتا ہے۔

۳۔ (تبلیغ دین کا) یہ طریقہ کار جو مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر کھلا تھا۔ اس سے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ لوگ جو نہایت غلط قسم کی زندگی میں پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس سے متاثر ہو کر اپنی زندگیاں بدل ڈالیں۔ بدکاریوں میں لت پت نکلے اور وہ ایسی اس حالت میں ہوئے کہ یہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ یہ وہی شخص ہے۔

۴۔ تبلیغ کے اس کام کی ایک خصوصیت یہ (بھی) ہے کہ اس کی عمر پچاس برس سے زیادہ ہو گئی ہے اور اس دوران اس کے رہنماؤں میں بار بار تبدیلی ہوئی مگر اس کے باوجود اس کا کام برابر بڑھ رہا ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو جدید تاریخ میں کسی بھی دینی یا غیر دینی جماعت کو حاصل نہیں۔

۵۔ تبلیغ کے اس کام میں زیادہ تر شخصی طور پر بات پہنچانے پر بھروسہ کیا جا رہا ہے یعنی گفتگو، تقریر، ملاقاتوں اور سفروں کے ذریعہ براہ راست طور سے اپنے خیالات دوسروں کو منتقل کرنا ــــ (اس طریقہ نے) تبلیغ کے اس کام میں ایک خاصی قدر پیدا کر دی ہے۔ جو اس وقت کسی بھی تحریک میں موجود نہیں ہے۔

۶۔ "خدایا! اس نقل و حرکت کو دین کے تمام شعبوں کو زندہ کرنے کا ذریعہ بنا" (دعا کا) یہ فقرہ اس واقعہ کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ کام محض کلمہ و نماز کی تبلیغ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ ان کی نگاہ پورے دین پر ہے اور وہ پورے دین کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔

اب گفتگو ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں ہم اپنی آخری بات کہہ سکتے ہیں۔ "جماعت تبلیغ کا جو کام کر رہی ہے کیا یہ دین

کا صحیح اور مکمل کام ہے ؟!"

قرآن وسنت کے مطالعہ سے دین کا جو مطلب میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ دین کے تقاضے دو قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک تقاضا تو وہ ہے جو دین کی اصل اور اس کی روح ہے ــــ دوسرا تقاضا وہ ہے جو مادی دنیا اور دین کی تصادم سے پیدا ہوتا ہے ــــ جہاں تک پہلے تقاضے کا تعلق ہے وہ دین کی اصل ہے اور دائمی طور پر دین کے مطلوب کی حیثیت رکھتا ہے (جس کو تبلیغی جماعت نے مطمح نظر بنایا ہے) [۱]

تبلیغی جماعت کے جائزہ کا یہ ایک پہلو تھا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مولانا محمد الیاس صاحب رح نے ابتدائی طور پر تبلیغ کا کام جس محنت وجانفشانی اور اپنی غیر معمولی صلاحیت کے باعث ترقی دے کر آگے بڑھایا تھا بعد کے برسوں میں خصوصاً حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رح کے انتقال کے بعد اسے صحیح طریقہ سے نہیں سمجھا گیا اور اب اس کی نوعیت ہی بدل کر رہ گئی ہے۔

مولانا حکیم خواجہ اقبال احمد صاحب ندوی لکھتے ہیں :-

"یہ قابل قدر نتائج مولانا الیاس صاحب رح کے ایسے سخت موقف اور برسوں کی مسلسل محنت شاقہ کا ثمرہ تھے جن میں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے انھیں اس کے علاوہ اور کسی دوسری چیز کی فکر نہیں رہی۔ پھر اس کے ساتھ اس پورے عرصہ میں مولانا موصوف کی عالی ہمتی، بلند حوصلگی، مضبوط عزم وارادہ صبر واستقامت اور اپنے باپ اور بڑے بھائی کے تربیت یافتہ افراد اور دو پشتوں کی محبتوں اور وابستگیوں سے اس کام میں پورا پورا فائدہ اٹھانے کی ایک غیر معمولی صلاحیت، ایک

---

[۱] مولانا وحید الدین خاں، تبلیغی تحریک، ص ۶۰ تا ۶۹

موثر عامل بنی رہی مگر بعد کے برسوں میں غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ نتائج محض حضرت مولانا موصوف کے "طریقِ تبلیغ" کا ثمرہ تھے۔ اس لئے اس سے میوات کے جیسے اثرات پھر دوسری جگہ کسی ایک محلہ تک بھی مرتب نہ ہو سکے۔" [1]

حکیم صاحب آگے لکھتے ہیں:

مولانا محترم اور ان کے صاحبزادہ کا زمانہ دیکھے ہوئے میوات کے ایک بزرگ (میاں محمد عیسٰی صاحب فیروز پوری) کی کتاب (تبلیغ کا مقامی کام) سے معلوم ہوتا ہے کہ میوات کی ان بستیوں میں جہاں ۱۰۰ فی صدی نمازی تھے وہاں پچاس ۵۰ فی صدی نمازی نہیں رہ گئے۔ ملاحظہ ہو:

"حضرت بہت ہی خوش ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پوری بستی ۱۰۰ فیصدی نمازی بن گئی۔ اس طرح دوسری بستیوں کا جائزہ بھی آپ لیتے رہتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر محنت کرتے رہو گے تب تو یہ چیز باقی رہے گی ورنہ پھر غفلت اور بے دینی لوٹ آوے گی۔ چنانچہ یہی ہو رہا ہے کہ آج انھیں بستیوں میں پچاس ۵۰ فی صدی نمازی نہیں ہیں۔" [2]

یہ کتاب برسوں پہلے کی شائع شدہ ہے اس لئے اس عرصہ میں وہاں کی مزید غفلت و بے دینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خواجہ اقبال ندوی صاحب نے مزید لکھا ہے۔

"بہر حال بات اس غلطی تک رہتی تب بھی غنیمت تھی۔ کیونکہ

---

[1] حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی، مقالہ (میں بھی حاضر تھا وہاں) مطبوعہ ماہنامہ "زندگی" رامپور، ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ ص ۱۶، ۱۷

[2] " " " " " " " " " ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ ص ۱۷۔

اللہ کے دین کے جس جز یا شعبہ کی خدمت کی جس قدر بھی کسی فرد یا جماعت کو توفیق حاصل ہو وہ اس کے لئے باعث سعادت بھی ہے اور اپنی اس خدمت کے لئے یہ پوری امت کی طرف سے شکریہ کی بھی مستحق ہے مگر جب اس متعلقہ خدمت کے ساتھ یہ اصرار اور مطالبہ شروع ہو جائے کہ یہی اصل دین ہے اور باقی دین کا کھلم کھلا استخفاف ہونے لگے جیسا کہ تبلیغی جماعت کی طرف سے ہوا تو اس سے معاملہ کی نوعیت بالکل بدل جاتی ہے دین اور دینی اقدار کو بہر حال افراد، جماعتوں اور وقتی فائدوں پر قربان نہیں کیا جاسکتا ہے[1]

تبلیغی جماعت کے شارحین اور ترجمان حضرات نے مولانا الیاس صاحبؒ کے ابتدائی کام کو جو اصل کام کی حیثیت دے ڈالی ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی ذات گرامی جس طرح غلو سے پاک تھی۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی ان سے مخفی نہ تھی کہ عموماً غالی عقیدتمند غلو میں آکر معاملہ کو بدل ڈالتے ہیں اس لئے وہ اپنی جماعت کے لوگوں کو اس انجام سے خبردار کرتے رہتے تھے جو ان کے ابتدائی کام کو "اصل کام" قرار دینے کی صورت میں ہو سکتا تھا۔

ملاحظہ ہو: ــــــــ

"فرمایا ــــ لوگ میری تبلیغ کی برکات دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ کام ہو رہا ہے حالانکہ کام اور چیز ہے اور برکات اور چیز ہیں۔ دیکھو رسول اللہ ﷺ کی ولادت شریفہ ہی سے برکات کا تو ظہور ہونے لگا تھا مگر کام بہت بعد میں شروع ہوا۔ اس طرح یہاں یہ سمجھو میں سچ کہتا ہوں کہ ابھی تک اصل کام شروع نہیں

---

[1] حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی، مقالہ (میں بھی حاضر تھا وہاں) ماہنامہ زندگی رامپور، ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ ص ۱۷

ہوا ...... بلکہ اسی حالت پر رہا جس پر اب تک ہے اور لوگوں نے
اس کو بھی منجملہ تحریکات کے ایک تحریک سمجھ لیا اور کام کرنے
والے اس راہ میں نکل گئے تو جو فتنے صدیوں میں آتے ہیں
وہ مہینوں میں آجائیں گے اس لئے اس کو سمجھنے کی ضرورت
ہے۔"[1]

اور میاں محمد عیسیٰ صاحب (فیروز پوری) اپنی کتاب (تبلیغ کا مقامی کام صفحہ ۲۲) میں
اس ملفوظ کو نقل کرنے کے بعد اس پر تبصرہ فرماتے ہیں :۔

"یہ ملفوظ بہت ہی غور طلب ہے کیونکہ آپ کی زندگی کے آخری
دنوں تک جس قدر کام ہو رہا ہے اس کے بارے میں آپ خود
فرما رہے ہیں کہ یہ کام نہیں ہے بلکہ کام کی برکات ہیں حالانکہ
آپ کے زمانے میں ہندوستان کے آخری کناروں تک جماعتیں
پہنچ چکی تھیں۔ تقسیم سے پہلے ۱۹۴۴ء میں آپ کا انتقال ہوا۔
اور اس وقت جماعتیں پشاور، کلکتہ، کراچی اور شاید بمبئی
تک بھی دہلی سے پیدل سفر کرتے ہوئے گاؤں گاؤں کام
کرتے ہوئے پہنچ چکی تھیں اور دوآبہ میوات میں مسلسل جماعتیں
پھرنے لگی تھیں۔"[2]

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ اقبال احمد صاحب ندوی لکھتے ہیں :۔

"مگر مولانا الیاس صاحبؒ کی اس سخت تنبیہہ کے باوجود
اس "چلت پھرت" اور ابتدائی کام کو "اصل کام" اور "اصل
دین" بنا ڈالا گیا اور جس انجام سے انھیں خبردار کیا تھا وہ

---

[1] حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی صاحب، مقالہ (میں بھی حاضر تھا وہاں) ماہنامہ "زندگی" رامپور، ربیع الآخر ۱۴۰۵ھ ص ۱۴
[2] میاں محمد عیسیٰ صاحب، تبلیغ کا مقامی کام، بحوالہ ماہنامہ "زندگی" رامپور، ربیع الآخر ۱۴۰۴ھ ص ۱۴

ہو کر رہا۔" [1]

تبلیغی جماعت کے کام میں خرابی کی ابتدا اس بات سے ہوئی کہ مولانا الیاس صاحبؒ کو اس کام کے لئے اللہ کی جانب سے مامور قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا کہ ہدایت کے اصولوں کا متن تو اللہ نے مولانا الیاس صاحبؒ پر الہام کیا تھا اور اس کی تشریح ان کے صاحبزادے سے کرائی۔ [2] اس کی تائید تبلیغی جماعت کے ایک اہم کارکن میاں جی عیسیٰ صاحب کے مندرجہ قول سے ہوتی ہے:۔

"اصل بات یہ ہے کہ اصولوں کا متن حضرت مولانا محمد الیاسؒ پر اللہ نے کھولا تھا۔ اور ان کی تشریح حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ سے کرائی تھی اب بعد والوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کو معلوم کرتے رہیں ......" [3]

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس نئی ہدایت اور اس کی شرح کا کتاب وسنت کا تابع نہ ہونا اور کتاب وسنت کے بالمقابل اور مستقل بالذات ہونا ہی شائد اس امر کا سبب بن گیا ہے کہ تبلیغی جماعت کے پلیٹ فارم سے دینی اقدار کا انہدام ہوتا رہتا ہے اور علماء کرامؒ نہایت اطمینان سے بالکل خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔" [4]

دراصل جماعت کے کچھ اہم لوگوں نے طریقہ تبلیغ اور اس کے اصولوں کو خواب و خیال اور کشف والہام کے تابع بنا دیا ہے اور اس کی بنیاد پر ایک نیا نظام فکر وعمل تصنیف کر ڈالا گیا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد منظور صاحب حضرت مولانا محمد الیاسؒ

---

[1] جناب حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی صاحب، زندگی، ربیع الآخر ۱۴۰۴ھ ص ۴۱
[2] " " " " " " ص ۴۳
[3] " " " " " ۱۴۰۴ھ ص ۴۲
[4] ایضاً ص ۴۳

صاحب کا ایک ملفوظ نقل کرتے ہیں :۔

"آج کل خواب میں مجھ پر علوم صحیحہ کا القا ہوتا ہے اس لئے کوشش کرو کہ مجھے نیند زیادہ آئے (خشکی کی وجہ سے نیند کم ہونے لگی تھی تو میں نے حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے مشورے سے سر میں تیل کی مالش کرائی جس سے نیند میں ترقی ہوئی) آپ نے فرمایا کہ اس تبلیغ کا طریقہ مجھ پر خواب میں منکشف ہوا ہے۔" [1]

خواب و خیال و کشف والہام کی بنیاد پر شروع ہونے والے اس کام کو تین ہی چیزیں ایسی تھیں جو راہ راست پر رکھ سکتی تھیں "اللہ کی کتاب" اس کے رسول کا اسوۂ حسنہ جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا یہاں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ محض اس بات پر کہ "اصولوں کا متن حضرت مولانا الیاس صاحب پر اللہ نے کھولا تھا اور ان کی تشریح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے کرائی تھی۔" ہمارے علماء اکرام کا علم کتاب و سنت کس طرح مفلوج اور معطل ہو جاتا ہے۔ [2]

پھر یہ تاکید و ہدایت کہ ــــ "اب بعد والوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کو (اصولوں کے متن اور ان کی تشریح) معلوم کرتے رہیں اور ان پر جم کر کام کرتے رہیں کیوں کہ اصل اصول وہی ہیں جو یہ حضرات بتلا گئے ہیں ۔" اس کے باوجود بعض علماء ان تمام نقائص کی بھی تائید کرتے گئے جو تبلیغی جماعت میں بعد میں آنے والوں کی بے راہ روی سے پیدا ہو گئے ہیں۔

---

[1] مولانا محمد منظور نعمانی، ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس صاحب، ناشر 'الفرقان' لکھنؤ ص ۵۰

[2] حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی، 'میں بھی حاضر تھا وہاں' ماہنامہ زندگی، رام پور جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ ص ۲۶

تبلیغی جماعت پر چند اہم اعتراضات کا جائزہ

۱۔ ہجرت کا غلط مفہوم :۔

جو دینی مصطلحات اور جو دینی اقدار اس توڑ پھوڑ کا نشانہ بنے، ان میں سے ایک ہجرت بھی تھی۔ ہجرت کا نام تبلیغی جماعت کے نکلنے کو دے دیا گیا اب جہاں تک ہجرت کا تعلق ہے تو ہجرت قرآن مجید کا ایک حکم ہے اور تعلیم کتاب اور قرآن مجید کے منشا و مقصد کی توضیح و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سے تھی۔ اس لئے ہجرت سے قرآن کی جو منشا و مراد تھی اس کی آپ نے اپنے قول و عمل دونوں سے کما حقہ تشریح فرما دی اور ان کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک احادیث اور سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں اس لئے ہجرت ہمیشہ ایک معلوم و معروف چیز رہی اور علماء امت کے درمیان کبھی بھی اس امر میں کوئی اختلاف نہیں رہا کہ ہجرت سے کیا مراد ہے۔ خود علماء ہند ہجرت کے وجوب کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب و سنت میں ہجرت کے احکام موجود ہیں اور علماء امت مفسرین اور محدثین کی متفقہ تصریحات کے مطابق مخصوص حالات میں مخصوص شرائط کے ساتھ اس کا وجوب قیامت تک باقی رہے گا چنانچہ سورہ نساء کی ہجرت سے متعلق آیات کی تشریح کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی تحریر فرماتے ہیں :

ان آیات میں ہجرت کے متعلق مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں
ایکؔ یہ کہ ہر نقل مکانی ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت یہ ہے کہ مسلمان ایک
ایسے مقام کو جہاں اس کے لئے اپنے دین وایمان پر قائم رہنا جان جوکھوں
کا کام بن گیا ہو، چھوڑ کر ایک ایسے مقام کو منتقل ہو جائے جہاں
اسے توقع ہو کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکے گا۔ دوسرےؔ
یہ کہ اگر دارالسلام موجود ہو، اس کی طرف ہجرت کی راہ باز ہو، کوئی
سخت مجبوری نہ ہو تو ایسے مقام سے ہجرت کر کے دارالسلام میں
منتقل ہو جانا واجب ہے۔ ورنہ ایسے شخص کا ایمان معتبر نہیں۔
تیسرےؔ یہ کہ ہجرت کے معاملہ میں ہر عذر، عذر نہیں ہے معتبر
عذر یہ ہے کہ آدمی اتنا بے بس ہو کر نہ اس سے خود کوئی تدبیر بن آرہی
ہو، نہ اس کے لئے کوئی راہ کھل رہی ہو۔ ایسی مجبوری میں بھی اس
پر اپنے ایمان کی حفاظت بہرحال لازم ہے اگرچہ اس کو اصحاب
کہف کی طرح کسی غار ہی میں پناہ لینی پڑے۔
چوتھا یہ کہ ہجرت کا اجر آخرت میں تو جو ہے وہ ہے، دنیا
میں بھی مہاجر کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص بدرقہ فراہم
ہوتا ہے۔ خدا کی زمین اس کے لئے راہیں کھولتی ہے اور
غیب سے اس کے لئے اسباب وسامان فراہم ہوتے ہیں
پانچواںؔ یہ کہ اس راہ میں پہلا قدم بھی منزل کی حیثیت رکھتا
ہے۔ نیت خالص اور ارادہ راسخ ہو تو گھر سے نکلتے ہی مہاجر
کو موت آجائے تو ہجرت کا اجر اس کے لئے لازم ہو گیا۔[1]
ایسی حالت میں تبلیغی جماعت کا اپنے ایسے نکلنے کو ہجرت کا نام دینا، جس پر ہجرت

---

[1] مولانا امین احسن اصلاحی: تدبر قرآن جلد دوم ص ۱۳۷، ۱۳۸ بحوالہ ماہنامہ "زندگی" رامپور شمارہ ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ صفحہ ۱۹، ۲۰

کا کسی طرح اطلاق نہیں ہو سکتا۔ صرف ہجرت ہی کو نہیں بلکہ ہجرت کے سلسلے میں آئے ہوئے اللہ اور رسول کے سارے احکام کو پامال کر ڈالنا ہے [۱]

۲۔ جہاد کی احادیث کو تبلیغ پر منطبق کرنا :۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ "تبلیغ والے جہاد کی احادیث کو اپنے تبلیغی اسفار کی تائید میں پیش کرتے ہیں" [۲]

یعنی تبلیغی جماعت کے افراد کا کہنا ہے کہ تبلیغ کے سلسلہ میں جو سفر کئے جاتے ہیں ان کی شمولیت جہاد فی سبیل اللہ کے زمرہ میں ہے۔ اور وہ تمام احادیث جن میں جہاد کے فوائد بیان کئے گئے ہیں ان تمام کا اطلاق تبلیغی اسفار پر بھی کرتے ہیں اور تبلیغی اسفار کی اہمیت کی تائید میں ان احادیث کو پیش کرتے ہیں جبکہ جہاد کا حکم قرآن سے ظاہر ہے اور اس کا مقصد صرف اعلاے کلمۃ اللہ ہے۔

اس اعتراض کے سلسلہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا صاحب فرماتے ہیں کہ ـــــ

اگرچہ جہاد کے اسفار میں قتال زیادہ معروف ہے لیکن لغوی لحاظ سے قتال کو جہاد کے ساتھ مخصوص نہیں کر سکتے چونکہ جہاد کا اصل مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور اس کے لئے آخری و مجبوری کا درجہ قتال ہے۔ لہٰذا قتال اصل مقصد نہیں۔ [۳]

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد ذکریا صاحب لکھتے ہیں ـــــ

"جہاد کے لغوی معنی مشقت اٹھانے کے ہیں اور شرعاً مشقت

---

[۱] حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی، میں بھی حاضر تھا وہاں، بحوالہ ماہنامہ "زندگی" رامپور ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ ص ۲۰

[۲] حضرت مولانا محمد ذکریا کاندھلوی، تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات ص ۵

[۳] ایضاً ص ۵

کا اٹھانا کفار سے قتال میں ہے لیکن اس کا اطلاق مجاہدہ نفس پر بھی آتا ہے اور شیطان سے مجاہدہ پر بھی آتا ہے اور فاسقوں کے ساتھ مجاہدہ پر بھی، اور کفار سے جہاد ہاتھ سے بھی ہوتا ہے، زبان سے بھی ہوتا اور مال سے بھی ہوتا ہے۔" [1]

اس کے بعد مولانا محمد ذکریا صاحب شعب الایمان للبیہقی کے حوالے سے مشکوٰۃ شریف کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ــــ

"اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔" [2]

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا صاحب ایک دوسری حدیث پیش کرتے ہیں کہ بخاری شریف میں حضرت ابو عبسؓ سے روایت ہے :ــــ

"وہ شخص کہ جس کے دونوں پاؤں اللہ کے راستہ میں غبار آلود ہوئے ہوں، اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ کو اس پر حرام کر دیتے ہیں۔" [3]

مولانا محمد ذکریا صاحب کا کہنا ہے کہ اگر امام بخاریؒ اس حدیث کا اطلاق جمعہ کی نماز کے پیدل چلنے کی فضیلت پر کر سکتے ہیں تو پھر اگر مبلغین اللہ کے راستہ میں اعلائے کلمۃ اللہ کی خدمت کے لئے پاؤں چلنے پر اس حدیث سے استدلال کریں تو کیا غلط ہے جبکہ حضرت علیؓ کو جنگ بدر میں شریک نہ ہو کر حضرت فاطمہؓ کی تیمارداری کرنے کو زیادہ بہتر بتایا تھا

دوسری بات یہ کہ قتال کا مقصد بھی صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے صرف جنگ ضروری نہیں بلکہ دوسرا راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے تب اسفار پر جہاد کا اطلاق کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔

---

[1] مولانا محمد ذکریا کاندھلوی، تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات، ص ۶

[2] " " " " " " " ص ۶

[3] " " " " ص ۶

حالانکہ بہت سی مستند احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوج کو روانہ کرتے تو اس کے امیر کو احکام دیتے کہ پہلے اسلام کی دعوت دو، اگر انکار کرے تو جزیہ کے لئے آمادہ کرو۔ اس سے بھی انکار کرے تو قتال کرو۔ [1]

آخر میں مولانا محمد ذکریا صاحب فرماتے ہیں کہ ـــــ

"کہ جو لوگ خروج فی سبیل اللہ کو صرف جہاد معروف کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں ان کے لئے تنبیہہ ہے کہ فی سبیل اللہ کا لفظ جہاد معروف کے ساتھ مخصوص نہیں .... جہاں تک اس کوتاہ نظر کی معلومات کا حاصل ہے وہ مفسرین محدثین کے کلام میں فی سبیل اللہ کا لفظ قتال کے ساتھ مخصوص نہیں پایا۔ اس لئے اہل تبلیغ کا ان آیات اور روایات سے خروج للتبلیغ جو فی سبیل اللہ کا اعلیٰ فرد ہے پر استدلال کرنا بے محل نہیں ہے۔" [2]

۳۔ مسلمانوں کے پاس تبلیغ کے لئے جماعتیں بھیجنا :

تبلیغی جماعت پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے عام لوگوں کا ایک اعتراض یہ ہے کہ رسولؐ کے زمانے میں یہ طریقہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کے پاس تبلیغ کے لئے جماعتیں بھیجی جائیں بلکہ غیر مسلموں کے پاس جماعتیں بھیجی جاتی تھیں اس لئے تبلیغ کے لوگوں کا مسلمانوں کے پاس جماعتیں بھیجنے کا عمل ایک بدعت ہے کیونکہ جو کام رسولؐ کے زمانے میں نہیں ہوا اس کو ایک جماعت نے رواج دیا اور ان کے مطابق یہ بدعت ہے۔

---

[1] مولانا محمد ذکریا کاندھلوی، تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات ص ۶، ۸، ۱۰

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ص ۱۴، ۱۵

اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت مولانا محمد ذکریا صاحبؒ فرماتے ہیں :۔۔۔۔

"کیا رسول اللہؐ کے زمانے میں مدارس کا موجودہ طریقہ، مدرسین کو اسباق کی تقسیم گھنٹوں کی پابندی، سہ ماہی، ششماہی، سالانہ امتحانات وغیرہ (جو اس زمانے میں نہایت ضروری ہیں) تھے یا تصانیف اوران کی طباعت کے سارے مروجہ طریقے رسولؐ کے زمانے میں تھے !!؟

یا اس طرح کوئی عقل مند یہ کہہ سکتا ہے کہ حضور کے زمانے میں توپ اور بندوق سے لڑائی نہیں تھی لہذا یہ بدعت ہے۔ تیروں سے جہاد ہونا چاہیئے لیکن ان امور میں کسی کو بھی کوئی بدعت نہیں کہتا۔" [۱]

مولانا مزید فرماتے ہیں کہ ۔۔۔۔

"یہ کہنا بھی سراسر غلط ہے کہ رسولؐ کے زمانے میں مسلمانوں کے پاس جماعتیں بھیجنے کا طریقہ نہیں تھا۔"

اس سلسلے میں خود مولانا محمد ذکریا صاحب نے مولانا الحاج محمد یوسف صاحب کی کتاب "حیاۃ الصحابہ" (جس کی اصل عربی میں ہے) کے ایک مستقل باب "ارسال الصحابۃ الی البلدان للتعلیم" کے حوالے سے کچھ احادیث پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے میں مسلمانوں کے پاس اسلامی تعلیمات کے لیۓ جماعتیں روانہ کرتے تھے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کا ارشاد ہے :۔

"رسولؐ نے حضرت معاذؓ اور ابوموسیٰؓ کو یمن بھیجا تاکہ وہاں کے لوگوں کو دین سکھلائیں۔" [۲]

---

[۱] مولانا محمد ذکریا کاندھلوی، تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات ص ۱۵، ۱۶

[۲] " " " " " " " " ص ۱۷

اس کے علاوہ حضرت عاصم بن عمر کی روایات سے نقل کیا گیا ہے کہ ــــ

"قبیلہ عضل اور قبیلہ قارہ کے چند آدمی رسول اللہؐ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ ہمارے یہاں مسلمان ہیں چند آدمیوں کو ہمارے یہاں بھیج دیجئے جو ہمیں دین سکھائیں۔ حضور اکرمؐ نے چھ نفر کی جماعت روانہ کی۔" [1]

مولانا محمد ذکریا صاحب مزید فرماتے ہیں کہ غیر مسلموں کی طرف جماعتیں بھیجنے کا مقصد ان کی ہدایت تھا اور جب مسلمان دین سے بے توجہی اور بے خبری میں ان کے قریب یا ان سے آگے بڑھ گئے ہوں تو کیا ان کی ہدایت کی ضرورت نہیں [2]

مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی (مفتی دارالعلوم دیوبند) نے اس اعتراض کے سلسلہ میں اپنے رسالہ "کیا تبلیغی کام ضروری ہے" میں لکھا ہے۔

"کوفہ اور قرقیسیا میں صحابہ اکرامؓ کا تبلیغ کے لئے جانا جلد اوّل میں مذکور ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت مغفل بن یسار عبداللہ بن مغفل وغیرہ حضرات کی جماعت کو شام بھیجا یہ جماعتیں مسلمانوں کے پاس گئیں۔" [2]

۴۔ مدارس و خانقاہوں کو بیکار بتانا :

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ تبلیغی جماعت کے افراد تعلیم و خانقاہوں کو خاص اہمیت نہیں دیتے اور انھیں بیکار بتاتے ہیں جبکہ اسلام میں ان کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں جواب دیتے ہوئے مولانا محمد ذکریا صاحب یہ فرماتے ہیں کہ ــــ

---

[1] مولانا محمد ذکریا کاندھلوی، تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات ص ۱۸

[2] " " " " " " " " " " " ص ۲۱

"یہ اعتراض یا تو عناد کی بنا پر ہے یا پھر حالات سے ناواقفیت کی بنا پر ہے تبلیغ کے تو اصول موضوعہ کے درمیان میں جو اس کے چھ۶ نمبر معروف ہیں اور بالکل بنیادی ہیں اس میں علم و ذکر مستقل نمبر ہے۔ اس کے علاوہ بانی تحریک حضرت مولانا محمد الیاس صاحب دہلوی اور ان کے خلف الرشید مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی تقاریر میں علم و ذکر پر جتنا زور ہے اتنا شاید اور کسی چیز پر نہیں۔ حضرت دہلویؒ کا تو مشہور مقولہ جس کو وہ ہمیشہ اپنی مجالس میں بار بار دہراتے رہے کہ علم و ذکر میری تحریک کے دو بازو ہیں اگر ایک بازو ٹوٹ جائے تو پرندہ کا اڑنا مشکل ہے۔ [۱]

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ملفوظات میں ہے کہ ایک بار فرمایا:-

"علم سے عمل پیدا ہونا چاہیئے اور عمل سے ذکر پیدا ہونا چاہیئے۔ جب ہی علم، علم ہے اور عمل عمل ہے، اگر علم سے عمل پیدا نہ ہو تو سراسر ظلمت ہے اور عمل سے اللہ کی یاد دل میں پیدا نہ ہوئی تو پھس پھسا ہے اور ذکر بلا علم بھی فتنہ ہے۔" [۲]

اس کے علاوہ سوانح یوسفی میں لکھا ہے کہ مولانا یوسف صاحبؒ اپنے ایک اہم مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"علم و ذکر اس کام کے دو بازو ہیں ان میں کسی ایک کی کمی اور سستی اصل کام کے لئے سخت مضر اور کمزور کرنے والی ہے ہر ایک اپنی جگہ نہایت ضروری ولابدی ہے۔ علم و ذکر کے مراکز خانقاہ اور مدارس میں ہم اپنے دونوں بازوؤں کو قوی

---

[۱] مولانا محمد ذکریا کاندھلوی، تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات ص ۲۱، ۲۲

[۲] " " " " " " " " ص ۲۴

کرنے کے اندر ہر طرح ہر وقت اہل علم علماء و صلحاء مشائخ کے محتاج ہیں وہ ہمارے بالخصوص ان دونوں امور میں مقتدا ہیں۔" [1]

آخر میں محمد ذکریا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر اس طرح کے اعتراض کرنے والے حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی اور مولانا یوسف صاحبؒ کے ملفوظات و سوانح عمری پر نظر ڈال لیتے تو کبھی اس قسم کے الفاظ زبان یا قلم سے نکالنے کی ہمت نہیں کرتے۔ [2]

۵۔ تبلیغ علماء کا کام ہے جہلا کا نہیں :۔

تبلیغی جماعت پر یہ ایک عام اعتراض بہت عرصہ سے یہ کیا جا رہا ہے کہ تبلیغی جماعت کے افراد جو تبلیغ دین کا کام انجام دے رہے ہیں یہ کام ان کا نہیں ہے بلکہ دین کی تبلیغ کا کام تو علماء کرام کا ہے اور وہ اس کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں اور اس کی ذمہ داری بھی علماء کی ہے۔

اس اعتراض کے سلسلہ میں مولانا زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ دراصل یہ اعتراض ان حضرات کی طرف سے ہوتا ہے جو وعظ و تبلیغ میں فرق نہیں کرتے۔ وعظ درحقیقت صرف عالموں کا کام ہے جہلا کو وعظ کہنا جائز نہیں۔ کیونکہ وعظ کہنے کے لئے عالم ہونا بہت ضروری ہے تاکہ جو کچھ کہہ رہا ہو وہ شریعت کے مطابق ہو اور کوئی چیز اس میں قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہو۔ اور تبلیغ جس کے معنی صرف پیام پہنچا دینے کے ہیں لہٰذا پیام پہنچانے والے کے لئے پیام کا عالم ہونا ضروری نہیں ہے جن حضرات نے تبلیغ کو علماء کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے انھوں نے تبلیغ دین کے بنیادی تقاضوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ حالانکہ تبلیغی جماعت پر یہ اشکال وارد نہیں ہوتا

---

[1] مولانا محمد زکریا کاندھلوی، تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات ص ۲۷

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۲۲

کیونکہ انھوں نے اپنی تبلیغ میں صرف چھ ۶ نمبر متعین کئے ہیں اور اس کی ہی مشق کر کے یہ لوگ اس پیام کو پہنچانے کے لئے شہر در شہر ملک در ملک جاتے ہیں، اور ساتھ ہی ان کے ان چھ ۶ نمبروں کے ساتھ ساتواں نمبر یہ ہے کہ جماعت کے افراد جہلا و علمار دونوں ان چھ ۶ امور کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول نہیں ہوں گے۔ ؎[1]

حضرت حکیم الامت کا ارشاد ہے :۔

"جو مسائل مخصوص صاف صاف شریعت کے ہیں ان کی تبلیغ صرف علمار کے ساتھ خاص نہیں ہر شخص بآواز بلند کہہ سکتا ہے امور اجتہادیہ سے خطاب کرنا البتہ علمار کے ساتھ خاص ہے کہ عوام اس میں غلطی کریں گے۔" ؎[2]

۶۔ چلّہ کی کوئی اصل نہیں :۔

معترضین کے اس اعتراض میں "کہ تبلیغی جماعت نے چلّہ کہاں سے شامل کر لیا جبکہ اس کی کوئی حقیقت یا اصل نہیں ہے" کے جواب میں شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ چلّہ کی اصل قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے اور پھر اپنی بات کی تائید میں قرآن کی آیت شریفہ پیش کرتے ہیں۔

قرآن کا ارشاد ہے :۔

" وٰعدنا موسیٰ ثلٰثین لیلۃ و اتممنٰھا بعشرٍ فتم میقات ربہٖ اربعین لیلۃ۔

حضرت حکیم الامت نے تفسیر بیان القرآن میں اس آیت شریفہ کو مشائخ

؎[1] مولانا محمد زکریا کاندھلوی، تبلیغی جماعت میں چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات ص ۴۵، ۴۶

؎[2] " " " " " " " " " " ص ۴۶

کے چلوں کی اصل بتایا ہے۔ پھر حدیث پیش کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ آدمی کی ابتدائی خلقت ماں کے رحم میں چالیس دن تو نطفہ رہتا ہے اور پھر چالیس دن تک خون کا لوتھڑا رہتا ہے پھر چالیس دن تک بوٹی بنا رہتا ہے۔ (مشکوٰۃ، بخاری، مسلم)

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ تغیر حالات میں چالیس دن کو خاص دخل ہے۔

اس کے علاوہ آپ دوسری حدیث بھی پیش کرتے ہیں :۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ ۔

"جو شخص چالیس دن کسی مسجد میں نماز اس طرح پڑھے کہ رکعت اولیٰ فوت نہ ہو، اس کو جہنم سے آزادی مل جاتی ہے۔"

(فضائل نماز)

اس لئے تبلیغی جماعت میں چالیس دن (چلّہ) پر بہت دھیان دیا جاتا ہے[1] کیونکہ اس سے اصلاح عمل میں کافی فائدہ ہونے کی امید ہے۔

---

[1] مولانا محمد زکریا کاندھلوی، تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات ص ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰
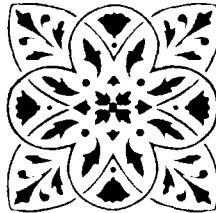
خلاصۂ کلام

تبلیغی جماعت اس کے اصول و مقاصد، عملی سرگرمیاں اور تنقیدی جائزہ کے مطالعہ سے کھل کر جو ایک حقیقت سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ ہر فرد اور جماعت میں کچھ خوبیاں اور کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں کوئی بھی فرد یا جماعت اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتی کہ اس میں صرف اچھائیاں ہی اچھائیاں ہیں اور اس کا دامن کمزوریوں و خامیوں سے پاک ہے۔ یہی بات تبلیغی جماعت کے سلسلہ میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ یہ جماعت جس طرح اپنی بعض خوبیوں کے لئے منفرد ہے وہیں بعد کے دنوں میں اس میں کچھ کمزوریاں اور خامیاں بھی راہ پاگئی ہیں۔

لیکن جس طرح اللہ تعالےٰ نے بے نقص و بے عیب قرآن پاک کی ہدایت پر عمل کرنے کے بارے میں کہا ہے کہ اس کے اچھے پہلو کی پیروی اختیار کرو (فَيَتَّبِعُونَ اَحْسَنَه۔ زمر ۱۸) یہی انداز اور طریقہ ہمیں دینی جماعتوں کے بارے میں بھی اپنانا پڑے گا۔ پھر دینی جماعتوں سے متعلق یہ حقیقت بھی مدنظر رہے کہ جو جس درجہ میں اللہ تعالےٰ کے دین کی کوئی خدمت کر رہا ہے بس غنیمت ہے مخالف دین تحریکوں کے مقابلے میں دین کا کام کرنے والے حقیقت میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ ہمیں خوش ہونا چاہیئے کہ ہمارے سوا کوئی اور بھی اس خدا کا کام کر رہا

ہے اگر کوئی کلمہ پڑھوا رہا ہے تو وہ بھی بہرحال خدا ہی کی راہ میں ایک خدمت انجام دے رہا ہے اور اگر کوئی وضو اور غسل کے مسائل ہی بتلا رہا ہے تو وہ بھی اس راہ کی ایک خدمت کر رہا ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضور اکرمؐ نے اپنے وقت میں جو ایک معاشرہ اور سوسائٹی بنالی تھی۔ جو ایک "الجماعت" تشکیل کی تھی۔ اس کا بدل بعد کی کوئی ایک جماعت کبھی نہیں بن سکتی۔ الجماعت نے پورے دین کے قیام کا فریضہ انجام دیا تھا اور جماعت صرف دین کے کسی ایک پہلو کی تعمیر کر سکتی ہے۔ کسی دینی جماعت کی طرف سے پورے دین کی اقامت کا دعویٰ تو کیا جا سکتا ہے لیکن عملاً یہ ناممکن ہے۔

اس طرح تبلیغی جماعت نے جیسا کہ مولانا وحیدالدین خاں کہتے ہیں کہ ــــ

"قرآن وسنت کے مطالعہ سے دین کا جو مطلب میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ دین کے تقاضے دو قسم سے تعلق رکھتے ہیں ایک تقاضہ تو وہ ہے جو دین کی اصل اور اس کی روح ہے ــــ یہ ہے اللہ کی معرفت، اس سے خشیت و معرفت کا تعلق، اس کے اوپر اعتماد، اور پھر اس طرح مومن و خائف بن کر خدا کی عبادت و معاملاتِ زندگی میں اس کی تابعداری ــــ دوسرا تقاضہ وہ ہے جو مادی دنیا اور دین کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ دین کو فکری اور عملی طور پر غالب و سربلند رکھنے کے لئے مختلف صورتیں پیش آتی ہیں اور موقع کے اعتبار سے مومن کو ہر جگہ نمٹنا پڑتا ہے۔ کہیں رکانہ سے کشتی لڑی جاتی ہے ــــ کہیں حسان بن ثابت کو حکم دیا جاتا ہے کہ نظم سنائیں۔ کہیں وقت کے عقلاء کو مطمئن کرنے کے لئے حجت ابراہیمی ظہور میں آتی ہے کہیں بدر و حنین کے معرکہ پیش آتے ہیں، کہیں غیرمسلموں

سے معاہدہ کیا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔" [1]

اب جہاں تک تبلیغی جماعت کا تعلق ہے وہ دین کے پہلے تقاضہ کو مطلوب کی حیثیت دیتی ہے اور اس کی ساری سرگرمیاں اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں۔

نتیجے کے طور پر تبلیغی جماعت کی دعوت کو سمجھنے کے لئے، دعوت کو سمجھ کر تبلیغ کے واسطے نکلنے کے لئے بغیر کسی مادّی لالچ اور طمع کے انسانوں کا ایک ہجوم ہے جو تبلیغی جماعت کے مرکز نظام الدین میں امنڈا چلا آتا ہے اس ہجوم میں علماء وفضلاء بھی ہوتے ہیں۔ بوڑھے اور جوان، دیسی اور پردیسی، ہر خطۂ زمین سے تعلق رکھنے والے جن کے لباس الگ الگ ہوتے ہیں۔ جن کی زبانیں جدا جدا ہوتی ہیں ——— مگر ایک جذبہ ——— اللہ کے دین سے وابستگی اور تعلق کا جذبہ، ان سارے لوگوں کو ایک تیز رو دریا کی طرح بہاتا چلا آتا ہے۔

اس طرح تبلیغی جماعت کے تحت آج کرۂ زمین پر بے شمار قافلے اپنے قدموں کو دین کی سربلندی کے لئے گرد آلود کر رہے ہیں اور غالباً دن و رات میں کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرتا ہوگا جبکہ دین کے لئے چلت پھرت نہ ہو۔

اور سیدابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اعتراف کہ ———

"مولانا نے عام دیہاتیوں کے اندر تبلیغ واصلاح اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایسی اسپرٹ پیدا کر دی ہے کہ جو لوگ کل تک خود گمراہ تھے۔ وہ اب دوسروں کو راہ راست بتاتے پھرتے ہیں۔"

اس جذبہ اور احساس کے ساتھ کہ ———

---

[1] مولانا وحیدالدین خاں، تبلیغی تحریک ص ۸۰

"ہم جہالت میں پڑے ہوئے تھے، نہ ہم کو خدا کی خبر تھی اور نہ رسولؐ کی، اس مولوی کا خدا بھلا کرے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ بتایا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں تک بھی یہ نعمت پہنچائیں جو ہمیں ملی ہے۔"

اس طرح تبلیغی جماعت کو اس کے اپنے اصول اور طریق کار، اس کے ممبران کا جذبۂ خیر خواہی، اللہ پر بھروسا اور اعتماد، اسے دینی تحریکوں میں ایک منفرد حیثیت کا حامل بنا دیتا ہے۔

باب سوم

جمعیۃ العلماء
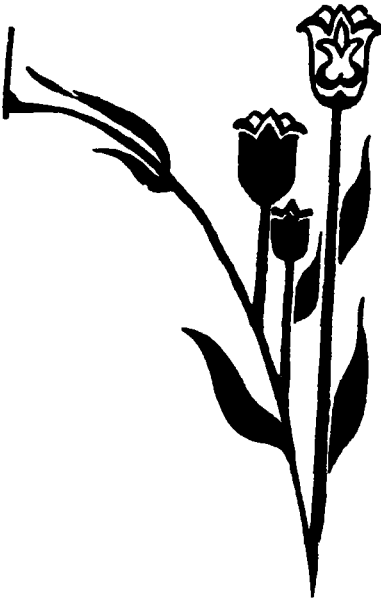
جمعیۃ العلماء ہند

مسلمانوں کے لئے مصائب و آلام، تنزل و ہلاکت اور تباہی و بربادی کا دور یوں تو آٹھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے اور مسلمانوں پر ہر زمانہ میں نت نئی آفات نازل ہوتی رہی ہیں جن سے ہماری تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں لیکن بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے واقعات مسلمانوں کے لئے قیامت صغریٰ کی حیثیت کے حامل ہیں۔

محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ ـــــــ

"جب ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفےٰ کمال پاشا (کمال اتاترک) نے خلافت کے خاتمہ کا اعلان کیا تو ہندوستانی مسلمانوں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور ان کو دنیا تیرہ و تار نظر آنے لگی۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر کہا تھا ـــــ

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

یہ زمانہ پورے عالم اسلام کے لئے روح فرسا اور ہوشربا تھا۔ اس کو ساتویں صدی ہجری کے اس نصف اوّل سے مماثلت تھی جن میں نیم وحشی تاتاریوں نے عالم اسلام کی زرخیز و مردم خیز متمدن اور مرکزی ممالک پر حملہ اور پھر قبضہ کر کے

اسلامی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا اور مسلمانوں کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا تھا۔“ [1]

لیکن اس وقت ایک نیم وحشی قوم کی محض فوجی یلغار کا معاملہ تھا۔ اور حالات بالکل مختلف نوعیت کے تھے۔

محترم علی میاں صاحب مزید لکھتے ہیں کہ ــــــ

”لیکن مغربی قوموں اور ملکوں کی اس تاخت کی جو بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی، نوعیت بالکل جدا تھی۔ اس کے ساتھ نئے فلسفے، نیا نظام تعلیم، نئے افکار و اقدار، ایجاد، تشکیک کا نیا لشکر، اور مادیت و مادّہ پرستی کا نیا مذہب تھا۔“ [2]

یہی وجہ تھی کہ ان ہیجان انگیز حالات اور سراسیمگی کے دور میں ہندوستان کے مسلمان اور ان کے بیدار ذہن علماء نے حالات و حقائق کو سمجھنے کی کوشش کی اور ان کے سدّباب پر بھی غور و خوض کیا۔

آخر اللہ پاک نے ان حضرات کی رہنمائی فرمائی اور حکمائے امت کو ان امراض مہلکہ کی تشخیص کی توفیق عطا فرمائی اور پھر فوری طور پر اس ہلاکت کے ہیجان و ثوران کو توڑنے کے لئے جو کچھ تدبیریں ہو سکتی تھیں، کی گئیں۔ انھیں تدابیر میں سے ایک اہم تدبیر جمعیۃ العلماء ہند کا قیام تھا۔ [3]

---

[1] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ پندرھویں صدی ہجری۔ ماضی و حال کے آئینہ میں۔ ناشر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ۔ ص ۴۰

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۴۱

[3] پروین روزینہ، جمعیۃ العلماء ہند جلد اول۔ مطبوعہ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد۔ پاکستان ص ۱۴۲

جمعیۃ العلماء کا قیام

برطانوی حکومت سے، اس کے مسلمانوں سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرانے کے سلسلہ میں ۲۲ر نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کانفرنس کے ایک اجلاس کا انعقاد ہوا۔ اس اجلاس میں پورے ملک سے پچیس ۲۵ چوٹی کے علماء نے شرکت کی اور اس موقع پر بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر تمام علماء نے اتفاق رائے سے طے کیا کہ ایک جمعیت قائم کی جائے۔ جس کا نام جمعیۃ العلماء ہند رکھا جائے جو تمام ہندوستان میں کام کرے اور ہر گوشۂ ملک میں اس کے ارکان اور شاخیں ہوں اور مسلمانوں کے فلاح و بہبود کے ذرائع و وسائل پر غور کرکے سچی مذہبی خیرخواہی اور ہمدردی کے ساتھ ان کی رہنمائی کرے۔ [1]

اس تجویز کے منظور ہونے کے بعد جمعیۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا اور تمام شرکاء اجلاس جمعیۃ العلماء ہند کے رکن بن گئے اور اس کے عارضی صدر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور ناظم سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب دہلوی منتخب کیے گئے۔ [2]

---

[1] پروین روزینہ، جمعیۃ العلماء ہند ص ۱۳، ۱۴

[2] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ العلماء ہند، ناشر شعبہ نشر و اشاعت جمعیۃ العلماء ہند نئی دہلی ص ۵۴

ایک سال بعد نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں جمعیۃ العلماء کا ایک باقاعدہ اجلاس ہوا اور اب شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب مستقل صدر، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نائب صدر اور مولانا احمد سعید صاحب مستقل ناظم بنائے گئے۔ لیکن جلد ہی شیخ الہند کا انتقال ہوگیا۔ کچھ عرصہ تک مفتی صاحب نے قائم مقام صدر کی حیثیت سے کام کیا پھر ۶ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مجلس منتظمہ کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ کے موقع پر وہ مستقل صدر منتخب کر لئے گئے اور اندازاً بیس سال تک عہدۂ صدارت پر فائز رہے۔ [1]

اغراض و مقاصد

ہر تنظیم کا اپنا ایک مرتب دستور ہوتا ہے جو اس تنظیم کے اغراض و مقاصد اور طریقۂ کار کا تعین کرتا ہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کا بھی دستور اساسی ہے۔ اس کی دفعہ ۳ کے مطابق جمعیۃ العلماء کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:

الف: اسلام اور شعائر اسلام اور مسلمانوں کے مآثر و معابد کی حفاظت۔

ب: مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی اور معاشرتی اصلاح۔

ج: ایسے اداروں کا قیام جو مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی (سوشل) زندگی کی ترقی و استحکام کا ذریعہ ہوں۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انڈین یونین کے مختلف فرقوں کے درمیان میل جول پیدا کرنا اور اس کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنا۔

---

[1] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ العلماء ہند۔ ناشر شعبہ نشر و اشاعت جمعیۃ العلماء ہند نئی دہلی ص ۵۵

(و) علوم عربیہ و اسلامیہ کا احیاء اور زمانہ حال کے مقتضیات کے مطابق نظام تعلیم کا اجراء۔

(ز) تعلیمات اسلامی کی نشر و اشاعت۔

(ح) اسلامی اوقاف کی تنظیم و حفاظت۔[1]

ان اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے جمعیۃ العلماء ہند کے دستور کی مختلف دفعات کے تحت لائحہ عمل متعین کیا گیا۔

۱۔ دینی تعلیم :-

(الف) اسلامی علوم و فنون اور عربی زبان و ادب کی اشاعت ترقی و استحکام کے لئے کوشش کرنا۔

(ب) عربی کا ایسا نصاب تعلیم مرتب کرنا جس سے علم و فن کے عصری تقاضے بھی پورے ہو سکیں۔

(ج) دینی اداروں میں بچوں کی شخصیت سازی کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔

۲۔ دنیاوی تعلیم :-

(الف) ابتدائی بنیادی تعلیم کے تحت دینی و دنیوی دونوں مضامین کا انتظام کرنا۔

(ب) اسکول و کالج قائم کرنا اور ان میں مذہبی اور ٹیکنیکل تعلیم کا بھی بندوبست کرنا۔

(ج) طلباء کے لئے تعلیمی وظائف فراہم کرنا۔

(د) ٹریننگ سینٹر یا کیمپ کھول کر اساتذہ کو طریقہ تعلیم اور اصول تربیت سکھانا۔

۳۔ دینی حلقے :-

(الف) سیرت یا اخلاق یا تاریخ اسلام وغیرہ موضوعات پر اجتماع کرنا۔

---

[1] دستور اساسی جمعیۃ العلماء ہند ص ۳

(ب) ترجمہ قرآن کریم اور درس حدیث کا اہتمام کرنا اور رواج دینا۔
(ج) مذہبی، اخلاقی اور اصلاحی لٹریچر کی نشر و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۴۔ سماجی خدمات :۔

(الف) مختلف مذہبی فرقے کے لوگوں کا مشترکہ اجتماع کرنا۔
(ب) شرعی پنچایت قائم کر کے خاندانی تنازعات کو ختم کرانا۔
(ج) شہری ضروریات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرنا۔
(د) مزدوروں، کسانوں اور پس ماندہ لوگوں کی خدمت کرنا۔
(ہ) یتیموں، بیواؤں، مجبور لوگوں اور غریب لڑکیوں کی شادی کرنے میں مدد کرنا۔
(و) فضول رسم و رواج اور اسراف بے جا کی اصلاح کے لئے اجتماعی جدوجہد کرنا۔

۵۔ اقتصادی حلقے :۔

(الف) مسلم فنڈ یا امدادی فنڈ قائم کرنا اور اسے چلانا۔
(ب) کارپوریشن یا کوآپریٹو سوسائٹی کے ذریعہ کاروبار کو فروغ دینا۔
(ج) گھریلو دستکاری اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو رواج دینا۔

۶۔ دار المطالعہ :۔

(الف) مذہبی، اخلاقی، اصلاحی اور علمی کتابیں اور کتابچے فراہم کرنا۔
(ب) ماحول کے مطابق اصلاحی مقالے مرتب کرنا یا مباحثے (سیمنار) کا انتظام کرنا۔
(ج) معیاری اور سنجیدہ اخبارات و رسائل جاری کرانا۔
(د) انفرادی اور اجتماعی مطالعہ کرنے کا ماحول بنانا۔[1]

---

[1] دستور اساسی، ص ۵ تا ۹

جمعیۃ العلماء کا نظام

ہر جماعت اور تنظیم کا اپنا ایک نظام ترکیبی ہوا کرتا ہے جو اس کے نصب العین کو بروئے کار لانے کے لئے بنیادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کا بھی ایک نظام ترکیبی ہے جو حسب ذیل ہے:

دفعہ ۱۱

۱۔ ہر وہ مسلمان (مرد و عورت) جمعیۃ العلماء کا ممبر بن سکتا ہے جو شرعاً عاقل و بالغ ہو اور جس کو جمعیۃ العلماء ہند کے مقاصد سے پوری طرح اتفاق ہو اور ممبری فارم پر دستخط کرے۔

۲۔ اس کی فیس ممبری پچاس ۵۰ پیسے ہوگی (ابتدا میں پچیس ۲۵ پیسے تھی)۔

۳۔ جمعیۃ العلماء ہند اور اس کے نظام ترکیبی کی ہر یونٹ کا ٹرم اس تاریخ سے شروع ہوگا جب مرکزی جماعت کے انتخاب کی تکمیل کے بعد نیا صدر چارج لے گا۔ یہ ٹرم دو سال کا ہوگا اور ممبری سازی ہر ٹرم کے بعد شروع ہوا کرے گی جس کی میعاد مجلس عاملہ مقرر کرے گی۔ البتہ غیر معمولی حالات میں ناظم عمومی کو بہ مشورہ صدر میعاد مقررہ کی توسیع کا اختیار ہوگا۔

دفعہ ۱۲

جمعیۃ العلماء ہند کے نظام ترکیبی میں حسب ذیل جماعتیں شامل ہوں گی۔

(الف) مقامی جمعیۃ

(ب) شہری جمعیۃ

(ج) ضلعی جمعیۃ

(د) علاقائی جمعیۃ

(ہ) ریاستی جمعیۃ

دفعہ ۱۳

جمعیۃ العلماء ہند کے نظام ترکیبی میں شامل ہونے والی تمام جماعتوں کے انتخاب دو سالہ ہوا کریں گے۔

دفعہ ۱۴

مقامی جمعیتوں کے عہدیداران حسب ذیل ہوں گے:

(الف) صدر ایک، ناظم ایک، خازن ایک، نائبین کی تعداد اور انتخاب مجلس منتظمہ کی صوابدید کے مطابق ہوگا۔

(ب) اس کی مجلس عاملہ عہدیداران کے علاوہ چھ ۶ ارکان پر مشتمل ہوگی۔

(ج) ابتدائی ممبران کی تعداد اگر ایک ہزار سے زیادہ ہے تو عہدیداروں کے علاوہ مجلس عاملہ آٹھ ۸ ارکان پر مشتمل ہوگی۔

(د) مجلس عاملہ کے ارکان کو صدر نامزد کرے گا۔

(ہ) عہدیداران کا انتخاب مجلس منتظمہ میں سے ہوگا۔

اس طرح مرکزی جمعیۃ علماء کے عہدے دار دفعہ ۸ کے مطابق حسبِ ذیل ہوں گے۔

صدر ایک، نائب صدر ایک، خازن ایک، ناظم عمومی ایک اور نظار چار ۴ مجلس عاملہ اپنی ضرورت کے مطابق نظار کی تعداد میں اضافہ کر سکے گی۔ [1]

جمعیۃ العلماء کی عملی سرگرمیاں

جمعیۃ علماء ہند یوں تو علمائے دین کی ایک جماعت کا نام ہے اور دستور

---

[1] دستور اساس، ص ۱۱، ۱۲، ۱۹

کے مطابق اس کا دائرہ کار تعلیمی اور خدمت خلق کی سرگرمیوں تک محدود نظر آتا ہے لیکن اپنے قیام کے اوّل دن سے جمعیۃ علمار نے سیاسی امور اور ملک و ملت کے بہت سے معاملات سے اپنے آپ کو پوری طرح وابستہ کر رکھا ہے اس لئے کہ جماعت کے قیام کے وقت ملک اور ملک سے باہر ذلت و ادبار کی جو تند و تیز آندھیاں چل رہی تھیں اور ساری امت مسلمہ کی ناموس داؤں پر لگی ہوئی تھی تو لازمی تھا کہ یہی مقصد سب سے پہلے سامنا آنا چاہیئے تھا۔

چنانچہ حجرہ نشین زاہد، کتاب کے کیڑے طالب علم، مدرسوں میں درس دینے والے، برق تقریر عالم، دکانوں پر بیٹھنے والے تاجر، اسباب ڈھونے والے مزدور، سب ایک صف میں آکر کھڑے ہوگئے۔ یہی نہیں بلکہ دول یورپ اور بالخصوص برطانیہ کی ظالمانہ اور غاصبانہ پالیسی دیکھ کر اکتیس کروڑ برادران وطن بھی ان کے ساتھ ہمدردی کے لئے تیار ہو گئے۔[1]

اس وجہ سے جمعیۃ علمار کو بھی سیاست کے میدان میں آنے کے لئے مجبور ہونا پڑا ــــ مؤلف تاریخ جمعیۃ علماء ہند لکھتا ہے کہ ــــ

"علمار کا اپنا ایک مخصوص دائرہ کار رہا ہے۔ ان کی دنیا تعلیم و تربیت اور اصلاح قوم تک محدود تھی لیکن قدرتاً ایسے اسباب پیدا ہوتے گئے کہ علمار کو سب سے پہلے سیاست کے میدان میں آنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ علمار نے بظاہر اپنے مذہب کی مدافعت میں یہ خطرناک اقدام کیا تھا لیکن آپ بہ نظر غائر اس جدوجہد پر اسباب وعلل کی روشنی میں غور کریں تو آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اگر علمار نے عیسائیت کے طوفان کو نہ روکا ہوتا تو ہندوستان دوسرا اندلس بن کر رہ جاتا اور اس کی غلامی کی مدت اتنی طویل ہو جاتی کہ لغت میں آزادی کا لفظ ایک بے معنی لفظ بن کر رہ جاتا۔

---

[1] پروین روزینہ، جمعیت علمار ہند جلد اوّل، ص ۶۲

لیکن علماء نے اس بنیاد ہی کو ڈھا دیا جس پر وہ اپنی دائمی شہنشاہیت کا تاج محل تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ علماء کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ اس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ علماء کی سیاسی زندگی کا ایک روشن باب اور ان کی سیاسی بصیرت کا بے مثال شاہکار ہے۔ [1]

ترکِ موالات (NON-COOPERATION) تحریک میں شرکت :۔

خلافت کانفرنس نے ۹ جون ۱۹۲۰ء کو اپنے الہ آباد کے اجلاس میں اصولی طور پر ترکِ موالات NON Cooperation کا اصول منظور کیا اور تین ماہ کے اندر اندر برطانوی حکومت سے عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی۔ مسلمانوں میں اس تحریک سے بہت زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور وہ ہر مصیبت و پریشانی برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جمعیۃ علماء ہند نے بھی اس ترکِ موالات تحریک سے تعاون کیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس دہلی میں نومبر ۱۹۲۰ء کو ہوا۔ اس اجلاس میں ترکِ موالات کے حکم شرعی ہونے کا فیصلہ کیا گیا۔ انگریز حکومت سے تعاون کو حرام ہونے کا فتویٰ مرتب کیا گیا ـــــ اور یہ فتویٰ ۴۸۴ علماء کے دستخطوں سے شائع کر دیا گیا۔ اس فتویٰ میں کہا گیا کہ انگریز حکومت کی معاونت اور قتل مسلم کی ملازمت کرنا، ملازم رہنا، ملازم کرانا، فوج میں بھرتی ہونا، بھرتی کرانا سب حرام ہے۔ ۱۸ اگست ۱۹۲۱ء کو یہ فتویٰ اور اس کا خلاصہ دونوں گورنمنٹ نے ضبط کر لئے اور وسط ستمبر میں جمعیۃ علماء ہند کے رہنماؤں کو ملک کے مختلف مقامات سے گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور دو دو سال کی قید بامشقت ہوئی۔ [2]

---

[1] پروین روزینہ، جمعیۃ علماء ہند جلد اوّل ص ۳۸، ۳۹

[2] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ العلماء ہند، ص ۵۷

سائمن کمیشن کا بائیکاٹ :-

متعدد اسباب کی وجہ سے خلافت کانفرنس کی سرگرمیاں اور سول نافرمانی کی تحریک آہستہ آہستہ پژمردہ ہوگئی اور سیاسی جوش وخروش تقریباً سرد پڑگیا تھا کہ ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے ہندوستان میں آنے کا معاملہ سامنے آیا۔ کمیشن کے ہندوستان آنے کا مقصد ایک رپورٹ مرتب کر کے حکومت کو آئندہ کے لئے سفارشات پیش کرنا تھیں کہ وہ مستقبل میں کیا لائحۂ عمل اختیار کرے، ان سفارشات سے ہندوستان میں مسلم اقلیت کے بہت سے حقوق تلف ہونے کا قوی امکان تھا۔ جیسے ہی سائمن کمیشن کے ہندوستان آنے کا اعلان ہوا جمعیۃ العلماء نے سب سے پہلے اس کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا ساتواں اجلاس پشاور میں علامہ انور شاہ کشمیری کی صدارت میں ستمبر ۱۹۲۷ء کو ہوا۔ یہی وہ وقت تھا کہ ہندوستان میں سائمن کمیشن کی آمد کا شور برپا تھا۔ یہ کمیشن اس لئے ہندوستان آرہا تھا کہ وہ اپنی سفارشات گورنمنٹ کو پیش کرے۔ جمعیۃ علماء ہند تجربات کی روشنی میں یہ خوب سمجھتی تھی کہ کمیشن کیا سفارشات پیش کرے گا اور اس کا ردعمل ملک پر کیا ہوگا؟ ابھی تک کوئی جماعت اس طرف توجہ نہیں دے رہی تھی۔ سب سے پہلے جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس میں اعلان کیا کہ آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ اپنی جدوجہد اور قوت بازو سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہندوستان کا دستور اساسی وضع کرنے کا حق صرف ہندوستانیوں کو ہے کسی اجنبی قوم کو ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اس لئے اس اجلاس میں تمام ہندوستانیوں سے اپیل کی گئی کہ وہ سب مل کر آنے والے کمیشن کا متحد قوت کے ساتھ مقاطعہ کریں۔ [1]

---

[1] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علماء ہند ص ۶۸، ۶۹

نہرو رپورٹ کی مخالفت :-

برطانوی وزیر اعظم نے اپنی پارلیمنٹ کی ایک تقریر میں ہندوستانیوں کو چیلنج کیا کہ وہ ملک کی آزادی کی بہت دہائی دے رہے ہیں پہلے وہ اس کا دستور مرتب کر کے دکھائیں۔ اس کے جواب میں موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس کمیٹی نے دستور کا ایک خاکہ مرتب کیا جو نہرو رپورٹ کے نام سے معروف ہے۔ اس رپورٹ کے تحت مسلمانوں کو دوسرے درجے کا شہری تسلیم کیا گیا تھا اور اس میں مسلمانوں کی بہت زیادہ حق تلفی کی گئی تھی۔ جمعیۃ علماء نے اس رپورٹ کی شدید مخالفت کی اور اپنی رائے کو دسمبر ۱۹۲۸ء کے اجلاس میں ان الفاظ میں پیش کیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا مطمع نظر اور نصب العین مکمل آزادی ہے اور اس کے نمائندے اس نصب العین کے خلاف کسی تجویز یا قاعدہ یا دفعہ کی تصدیق وتائید نہیں کر سکتے۔ ہم آزادی کے دستور اساسی کے مخالف نہیں ہیں لیکن یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ان میں ایسی ضمانتیں شامل کر دی جائیں جن سے حفاظت حقوق کا یقین حاصل ہو جائے۔ جمعیۃ علماء ہند مسلمانوں کے لئے کوئی ناواجب اور غیر منصفانہ رعایتیں نہیں مانگتی وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ برائے قانون عقل و انصاف مسلمان جتنے حصے کے حق دار ہیں وہ ان کو دئے جائیں اور اس کی حفاظت کا اطمینان ہو جائے۔ [1]

کانگریس کے ساتھ تعاون :-

تیسری دہائی کے اختتام تک ہندوستان کی آزادی کی تحریک بہت آگے

---

[1] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علماء ہند ص ۷۰

بڑھ چکی تھی اور حالات اب کچھ اس طرح کے نظر آنے لگے تھے کہ ہندوستان کی آزادی غیر متوقع نہیں رہی تھی۔ لیکن ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد اب بھی ایسی تھی جو تحریک آزادی کو خودکشی کے مترادف سمجھتی تھی۔ برطانوی حکومت کا رویہ بھی بہت زیادہ مستبدانہ ہو گیا تھا مگر جمعیۃ علما، ہندوستان کی مکمل آزادی کے حصول کے لئے پوری طرح کوشاں تھی۔ کانگریس کی جانب سے بھی بہت تیزی کے ساتھ آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں گاندھی جی کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی۔ ملک کا گوشہ گوشہ آزادی کی تحریک سے متاثر ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ وہ صرف تماشائی بنے رہیں چنانچہ ـــــ

مئی ۱۹۳۰ء کو جمعیۃ علمار کا سالانہ اجلاس امروہہ ضلع مراد آباد.... میں زیر صدارت مولانا شاہ معین الدین اجمیری ہوا۔ جس میں تحریک آزادی میں کانگریس سے تعاون کی تجویز منظور ہوئی۔ اور جمعیۃ علمار کے پلیٹ فارم سے کانگریس کی ہمنوائی اور اس کی تحریکوں میں شرکت کا اعلان کر دیا گیا۔ کانگریس کی تحریک آزادی میں شرکت کی تجویز جو اس وقت آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی باعزت زندگی کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی تھی۔ ۱۹۲۹ء کے ماحول میں انوکھی اور اجنبی بھیانک اور بعض مصلحتوں سے خوفناک اور دہشت آفریں تھی۔[۱]

جمعیۃ علما، ہند کی سرگرمیوں کا محور و مرکز اب پوری طرح ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو کامیاب بنانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانان ہند کو مذہبی، سیاسی اور تہذیبی مسائل کی طرف سے اطمینان بھی حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ اس کے حصول کے لئے جمعیۃ نے ایک "چار نکاتی" فارمولا مرتب کر رکھا تھا۔

۱۔ آزادیٔ کامل۔

---

[۱] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علمار ہند ص ۱،

۲۔ ایسی وطنی آزادی کہ مسلمان اپنے مذہب، کلچر، تہذیب، ثقافت کے لحاظ سے بھی آزاد ہوں۔

۳۔ صوبے کامل خود مختار ہوں، مرکز کو صرف وہی اختیارات حاصل ہوں جن کو صوبے طے کر دیں۔ باقی غیر مصرح اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں۔

۴۔ ہندوستان کا ایک وفاق ہو مگر وہ اس طرح مرتب کیا گیا ہو کہ مسلمان اپنے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں وہ کسی عددی اکثریت کے رحم وکرم پر مجبور نہ ہوں۔ [1]

جمعیۃ علماء ہند کی برطانوی حکومت اور پاکستان بنانے کی خواہاں مسلم لیگ کی مخالفت اور کانگریس کی معاونت میں تحریک آزادی کی سرگرمیاں جاری تھیں کہ بہت سے نشیب و فراز سے گزر کر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء آگیا۔ ہندوستان کی آزادی کا سنہرا دن جمعیۃ علماء کی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کا دن تھا لیکن ؎

بہار آنا قیامت تھا کہ دیوانوں کی بن آئی (ضیاء الہادی)

مسرت و شادمانی کی ان شہنائیوں کی تان ابھی ٹوٹی بھی نہیں تھی کہ درد و کرب اور سوز و گداز سے بھری انسانی چیخوں نے یک لخت فضا کو کرب ناک بنا دیا، ابھی فضا نور و نکہت اور بہجت و مسرت کی رنگینیوں سے مکمل طور پر مصور بھی نہیں ہوئی تھی کہ سلگتے ہوئے مکانوں اور آگ اگلتی ہوئی عمارتوں کے کثیف دھوئیں نے فضا میں ہولناک تاریکی بھر دی اور انسانی خون سے ہولی کھیلی جانے لگی۔ [2]

جمعیۃ علماء ہند نے ان قیامت انگیز حالات میں استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستان میں آلام و مصائب کے شکار مسلمانوں کی ہمت بندھائی۔ ملک کی ہندو اکثریت اور حکومت کو متنبہ کیا۔

---

[1] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علماء ہند ص ۱۱۲، ۱۱۳

[2] ایضاً ص ۱۷۵

"ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ یہ ہماری روایات کا مخزن ہے ہماری تہذیب و ثقافت کا گہوارہ ہے اس کے در و دیوار پر ہمارے ہزار سالہ تاریخ کے نشانات کندہ ہیں۔ اگر پنڈت جواہر لال نہرو کو یہاں رہنے کا حق ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انھیں جیسا ہمارا حق بھی اس سرزمین پر نہ ہو۔ وطن عزیز پر بہت سے حوادث آئے۔ ایک حادثہ وہ تھا کہ برطانوی سامراج یہاں مسلط تھا۔ ایک حادثہ وہ تھا کہ مسلمانوں میں فرقہ واریت کا بھوت ناچ رہا تھا۔ (مسلم لیگ کے زیر اثر مسلمانوں کی پاکستان بنانے کی تحریک) ایک حادثہ یہ بھی ہے کہ ہندو فرقہ واریت کا دیو حملہ آور ہو رہا ہے اگر ہم نے اپنی تمام مجبوریوں اور لاچاریوں کے باوجود برطانوی سامراج کا مقابلہ کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندو فرقہ واریت کے مقابلے میں بہادر نہ بنیں اور مرعوب ہو کر وطن کو خیر آباد کہہ دیں۔ ہمیں یہیں رہنا ہے اور باعزت طور پر رہنا ہے اور ان تمام حقوق کے ساتھ رہنا ہے جو ایک باعزت شہری کو حاصل ہو سکتے ہیں۔" [1]

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے جمعیۃ علماء ہند کے سامنے ایک بڑے مسئلہ کی صورت میں صرف ہندوستان کی آزادی اور ہندو مسلمان اتحاد کا مسئلہ تھا لیکن آزادی کے بعد اب مسائل ہی مسائل تھے۔

نادار مظلوموں کی امداد، اُجڑے ہوئے لوگوں کی آبادکاری، مساجد اور عبادت گاہوں کا تخلیہ اور بحالی، پولیس ایکشن میں کام آنے والے لوگوں کے لاوارث اور یتیم بچے، بیوائیں اور پسماندگان کی نگہداشت اور امداد، ریلوے کے محکمہ سے جبری طور پر نکالے جانے والے مسلمانوں کی دوبارہ تقرری

---

[1] اسیر ادروی، تاریخ، جمعیۃ علماء ہند ص ۲۵۶، ۲۵۷

اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی اور اس طرح بہت سے دوسرے مسائل جن کے حل کرنے میں جمعیۃ علماء نے اپنی ساری قوت و توانائی لگا دی۔ لیکن پھر بھی ایک کے بعد ایک مسئلہ جمعیۃ علماء کے سامنے آتا رہا۔

آزاد ہندوستان کے دستور کا مسئلہ:۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوؤں کی اکثریت اس بات کی خواہاں تھی کہ ہندوستان کو ایک سیکولر ملک ہونے کے بجائے ہندو راشٹر بنایا جائے۔ جمعیۃ علماء نے اس امر کی سختی سے مخالفت کی اور ہندوستان کو سیکولر ملک بنانے کی جدوجہد اور کوشش کی۔

مسلمانانِ ہند کے لئے جمعیۃ علماء کی سب سے اہم خدمت اور کارگزاری ہندوستانی دستور کا موجودہ ڈھانچہ ہے اور اس دستور میں جو اقلیتوں کے حقوق دئے گئے ہیں ان میں سب سے بڑا ہاتھ مولانا حفظ الرحمٰن (ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند) کا ہے آج دستور کی وہی دفعات ہیں جو مسلمانوں کو ہندوستان میں سربلند رکھنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں ـــــ آپ دستور ساز اسمبلی کی کارروائی پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں (یعنی ملک کو سیکولر بنانے میں) جمعیۃ علماء کا ہاتھ کام کر رہا تھا اور مولانا حفظ الرحمٰن کی زبان جمعیۃ علماء ہند کے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی۔ [1]

اُردو زبان کا مسئلہ:۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں اُردو نے ایک اہم کردار ادا کیا اور ملک کی یہی وہ واحد زبان ہے جو پورے ملک میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے

---

[1] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علماء ہند ص ۲۵۶، ۲۵۷

لیکن حالات کی ستم ظریفی کہ یہ زبان بھی فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہوگئی۔ مسلمانوں کی سادہ لوحی اور مخالفین کی سازشوں نے اُردو کو صرف مسلمانوں کی زبان بنا دیا، اور جب مسلمانوں کی اس ملک میں کوئی حیثیت نہیں تو ان کی زبان کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے۔ جمعیۃ علمار ہند جو سیاسی طور پر انڈین نیشنل کانگریس کی حلیف جماعت بنی ہوئی تھی اور اپنے آپ کو اس حیثیت میں سمجھتی تھی۔ اس لئے سب سے پہلے جمعیۃ علمار ہند نے (اردو پر) وار کرنے والے ہاتھوں کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وار کرنے والے ہاتھ زیادہ طاقت ور تھے۔" [1]

کانگریس کے ستمبر ۱۹۴۹ء کے اجلاس کے موقع پر زبان کا مسئلہ زیر بحث لایا گیا تو جمعیۃ علمار کے ناظم عمومی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ڈاکٹر امبیڈکر کے مسودہ قانون پر سخت تنقید کی اور اسے غیر منصفانہ قرار دیتے ہوئے کہا۔

یونین کی زبان ہندی ہوگی اور اس کا رسم الخط دیوناگری ہوگا۔ یہ نہ صرف گاندھی جی کے اصولوں کو چیلنج ہے بلکہ کانگریس کے اس تیس سالہ تاریخ کو بھی چیلنج ہے جس میں کانگریس بار بار یقین دلاتی رہی ہے کہ ملک کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو دیوناگری اور اُردو رسم الخطوں میں لکھی جائے گی ـــــــ میرے نزدیک انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا حادثہ ہے جو آج پیش آیا ہے۔ "سیکولر اسٹیٹ" اور "ون نیشن" کے دعوے کے باوجود ہند یونین کے کروڑوں انسانوں کی مادری زبان کو جو بلا تفریق مذہب و ملت اور بلا امتیاز نسل و خاندان پورے ملک کے گوشے گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نفرت و عداوت سے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ [2]

---

[1] اسیرادروی، تاریخ جمعیۃ علمار ہند ص ۲۵۷

[2] " " " ص ۲۵۸

اس درمیان پارلیمنٹ میں یو، پی میں چلائی جانے والی اُردو تحریک کو جب ایک ممبر نے فرقہ وارانہ تحریک کہا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جواب میں کہا کہ ــــــ

اُردو تحریک جو اتر پردیش میں چلائی جارہی ہے، تحریک چلانے والے فرقہ پرست نہیں ہیں اس کی مخالفت کرنے والے خود فرقہ پرست ہیں۔ ہم نہ پاکستان کے لفظ سے مرعوب ہو سکتے ہیں، نہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے نام سے، اس لئے کہ ہماری قوم پروری پنڈت نہرو اور دوسرے چوٹی کے لیڈروں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ پاکستان اُردو نے نہیں بنوایا بلکہ سیاسی بے ایمانی اور دلوں کی کھوٹ نے، تنگ نظری نے اس کو چار چاند لگادئے۔ لہ

ان سب کے علاوہ جمعیۃ علمار نے اُردو کے لئے چلائی جانے والی دستوری جنگ میں بھی پورا حصہ لیا۔ دستخطوں کی مہم چلانے میں شرکت کی۔ اُردو کانفرنس کو تعاون دیا۔

غرض یہ کہ اُردو زبان کا مسئلہ جمعیۃ علمار کے لئے ہمیشہ اہمیت کا حامل بنا رہا اور اس نے اُردو کے لئے جو کچھ بھی ہو سکا، اسے آگے بڑھ کر کیا۔

فرقہ وارانہ فسادات :-

"ہندوستان کی آزادی سے چند سال پہلے سے فرقہ وارانہ فسادات کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ آج تک قائم ہے۔ گویا فرقہ وارانہ فسادات اس ملک کا مقدر بن گئے ہیں اور کسی طرح یہ فسادات ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے ہیں بلکہ آئے دن ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔"

۷ رنومبر ۱۹۸۷ء کو مجلس منتظمہ کے اجلاس کے موقع پر جمعیۃ علمار ہند

لہ اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علمار ہند ص ۲۶۸

کے ناظم عمومی کی جانب سے پیش کی جانے والی اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ ـــ

"ہندوستان میں چالیس[۴۰] سال کے عرصہ میں پندرہ[۱۵] ہزار سے زائد فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں اور اب یہ ہنگامے مسلمانوں پر یک طرفہ حملہ کی شکل میں کئے جاتے ہیں جن میں جان لینے کے ساتھ ان کی عورتوں کی عصمت اور ان کی اقتصادیات پر خاص طور سے وار کیا جاتا ہے۔ ان ہنگاموں میں ہزارہا انسانوں کی جانیں لی گئی ہیں اور اربوں روپے کی مالیت برباد کی گئی ہے۔ سفاکی کی انتہا یہاں تک ہے کہ مسلمانوں، ان کی عورتوں اور بچوں کو زندہ جلایا گیا ہے ـــ

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد فرقہ واریت، فسادات تشدد، قتل و غارت گری، تباہی و بربادی کو ملک کا مقدر بنا دیا گیا ہے (اور یہ اس وجہ سے ہے) کہ نصابی کتابیں خاص کر تاریخی کتابیں جس طرح پڑھائی جا رہی ہیں وہ ہندوستان کی فضا کو نہایت زہریلا اور نفرت انگیز بنا رہی ہیں۔ ان تمام غیر انسانی پروپیگنڈہ کا نتیجہ ایڈ منسٹریشن میں مسلمانوں کے ساتھ بدترین امتیاز و نفرت کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے اور ملک کی فضا کو فاشزم کی طرف پہنچایا جا رہا ہے۔"[۱]

جمعیۃ علماء ہند جو اپنی ابتداء سے ہی اس بات کے لیے کوشاں رہی ہے کہ ہندوستان امن و سکون کا گہوارہ بنے اور یہاں آباد ساری قومیں اور تمام مذاہب اور ملتوں کے لوگ آپس میں اتحاد و یک جہتی اور باہمی اخوت و بھائی چارہ کی فضا میں زندگی گزاریں۔ جمعیۃ یہ کب گوارہ کر سکتی تھی کہ فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے

---

[۱] مولانا محمد اسرار الحق قاسمی ملی زندگی کا اہم موڑ، شعبہ نشر و اشاعت جمعیۃ علماء ہند نئی دہلی ص ۳، ۴

میں ملک کا وقار مجروح ہو اور اس ملک کے باشندوں کے درمیان ہمیشہ خون کی ہولی کھیلی جاتی رہے۔

اس نے (جمعیۃ علماء ہند) شروع ہی سے ہر قسم کی فرقہ واریت کی مخالفت کی ہے۔ اور ہر موقع پر آئین اور سیکولر کردار کی حفاظت کے لئے ملک کو متنبہ کرتی رہی ہے، ہر فساد کے موقع پر اپنی حیثیت سے بڑھ کر عوامی تعاون سے مظلوموں کی امداد کی سعی کی ہے۔ [1]

جمعیۃ علماء کے وفود نے اکثر فساد زدہ شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کے دورے کیے حالات کا جائزہ لیا۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا، مظالم، نا انصافی، ظلم و زیادتی، انتظامیہ، پولیس اور خود حکومت کی نااہلیوں کوتاہیوں کی طرف انھیں توجہ دلائی۔ [2]

جمعیۃ علماء نے فسادات کے شکار لوگوں کی مالی امداد کے لئے ہمیشہ ریلیف کا کام کیا۔ ریلیف کا کام فی الواقع ایک دشوار اور مشکل کام ہے۔ خاص طور پر فسادات کے دوران جب کرفیو لگا ہو اور مظلومین اور ان کے بچے مصیبت کا شکار ہوں۔ انھیں امداد پہنچانا اور ان کی ہر طرح خبر گیری رکھنا۔

لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں اور ان کے بعد ہونے والے فسادات میں یہ صبر آزما خدمت صرف جمعیۃ علماء ہند کے حصہ میں آئی۔ جبل پور کے فساد میں پہلی بار بہت بڑے پیمانے پر ریلیف کا انتظام کرنا پڑا (اور اس کے بعد) تمام بڑے فسادات میں اس طرح کے ریلیف کا انتظام کیا گیا۔ [3]

---

[1] محمد اسرار الحق قاسمی، ملی زندگی کا اہم موڑ ص ۴

[2] مولانا محمد اسرار الحق قاسمی، خونریزی کا سال ص ۷

[3] بہار برنی ، فسادات، ریلیف اور اس کی دشواریوں کا حل
شعبہ نشر و اشاعت تعلیمی ملی کانفرنس، نئی دہلی ، ص ۲۴

مسلم پرسنل لا :-

مسلم پرسنل لا یعنی مسلمانوں کا نجی یا شخصی قانون شروع ہی سے فرقہ پرستوں کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا ہے یہاں تک کہ اس سیکولر اور جمہوری ملک کے سیکولر معماروں نے ملک کے دستور کی دفعہ ۴۴ کی شکل میں مسلم پرسنل لا پر ہمیشہ کے لئے ننگی تلوار لٹکا رکھی ہے۔

مسلم پرسنل لا پر خطرات کا بادل اسی وقت افق پر نمودار ہو گیا تھا اور اب اتنی مدت میں وہ سیاہ بادل پورے افق کو گھیر چکا ہے۔ دستور میں ایک طرف تو اقلیتوں کو بہت سے بنیادی حقوق دئے گئے ہیں اور دوسری طرف رہنما اصولوں میں یکساں سول کوڈ پورے ملک میں نافذ کرنے کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ سرکاری پالیسی کے رہنما اصولوں میں دفعہ ۴۴ کے متن کا ترجمہ یہ ہے۔

"حکومت شہریوں کے لئے ایک ایسا مشترکہ سول کوڈ نافذ کرنے کے لئے جدوجہد کرے گی جس کا نفاذ ہندوستان کے طول و عرض میں ہو۔" [۱]

دستور کی اس دفعہ پر دستور ساز اسمبلی کے بہت سے مسلم و غیر مسلم ممبران نے اعتراض کیا اور کچھ مسلمان ممبروں نے ترمیم بھی پیش کی لیکن ڈاکٹر امبیڈکر نے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ حکومت کو محض اختیار دیا جا رہا ہے جس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی، شخصی قوانین ختم کر دینا اس کے لئے لازم ہوگا۔ [۲]

لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ یقین دہانی سیاسی طفل تسلی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ حکومت ہند نے دفعہ ۴۴ کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے اور وہ یکساں

---

[۱] ماہنامہ زندگی رام پور، مسلم پرسنل لا نمبر۔ دسمبر و جنوری ۷۳-۱۹۷۲ء ص ۳

[۲] " " " " " " " ۷۳-۱۹۷۲ء ص ۴

سول کوڈ کی طرف بتدریج قدم بڑھا رہی ہے [1]

اس صورت حال کے پیش نظر ہی ذی ہوش مسلمان اور دینی جماعتوں کے لئے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ پوری قوت سے مسلم پرسنل لا کا تحفظ کریں اور اس کے خلاف کی جانے والی ہر کوشش کو ناکام بنانے کی جدوجہد کریں۔

چنانچہ جمعیۃ علماء ہند نے نہ صرف بار بار اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ مسلم پرسنل لا میں کسی طرح کی ترمیم، تنسیخ اور مداخلت کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی بلکہ ——

جمعیۃ علماء ہند نے رائے عامہ کو منظم کرنے کے لئے ۲۴ دسمبر ۱۹۶۶ء کو جمعہ کے دن پورے ملک میں "مسلم پرسنل لا ڈے" منایا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۷۰ء کی مجلس عاملہ میں مشترکہ سول کوڈ کی مخالفت کی گئی اور واضح کیا گیا کہ مسلم پرسنل لا شریعت اسلامیہ کا اٹوٹ حصہ ہے اس میں تبدیلی کو کسی بھی حالت میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ دار العلوم دیوبند کے مسلم پرسنل لا سے متعلق اجتماع میں صدر جمعیۃ علماء نے شرکت کی اور جمعیۃ علماء ہند کے موقف کی وضاحت فرمائی —— جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی نے اس موقع پر اپنے اداریہ اور مقالات کے ذریعہ مسلم عوام کے غم و غصہ سے ارباب اقتدار کو مطلع کرایا —— دسمبر ۱۹۸۳ء میں شہناز شیخ نے سپریم کورٹ میں درخواست پیش کی کہ وہ حکومت ہند کو یکساں سول کوڈ مرتب کرنے کے لئے نوٹس جاری کرے۔ اطلاع ملتے ہی جمعیۃ علماء ہند نے سپریم کورٹ میں مداخلت کی درخواست پیش کی۔ ۱۹ جنوری کو سپریم کورٹ میں شہناز شیخ کی یہ درخواست زیر سماعت آئی۔ جسے سپریم کورٹ نے مسترد کر دیا [2]

اسی طرح شاہ بانو مقدمہ کے سلسلہ میں جمعیۃ علماء ہند نے ایک مؤثر کردار

---

[1] ماہنامہ زندگی رام پور۔ "مسلم پرسنل لا نمبر" دسمبر و جنوری ۷۳-۱۹۷۲ء ص ۴

[2] مولانا محمد اسرار الحق قاسمی، ملی کردار ص ۲۰، ۲۱

ادا کیا۔ اور مسلم مطلقہ خواتین کے حقوق سے متعلق بل کو پاس کرانے میں کافی جدوجہد کی۔

الغرض مسلم پرسنل لار کے تحفظ کو کسی مرحلہ پر بھی اکابر جمعیۃ علمار ہند نے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ جمعیۃ علمار ہند ہر سطح پر اس صورت حال کی نگرانی کرتی رہی اور جب بھی اس نے محسوس کیا ہے کہ مسلم پرسنل لار کو متاثر کرنے کی بلا واسطہ یا بلواسطہ کوئی کوشش کسی سطح پر کی جا رہی ہے تو اس نے اپنا موقف واضح کیا اور آج بھی پورے عزم کے ساتھ اپنی اس پالیسی پر گامزن ہے۔ [1]

دینی تعلیم کا فروغ :۔

مسلمانوں کے لئے دینی تعلیم یوں بھی ایک لازمی چیز ہے لیکن خاص حالات میں اس کی ضرورت اور افادیت بہت بڑھ جاتی ہے اور اگر اس کی ضرورت کو بروقت محسوس نہ کیا جائے تو یقیناً مسلم معاشرے سے اسلامی تہذیب ختم ہو کر رہ جائے۔

چنانچہ ایک خاص مسموم ذہنیت نے سرکاری نصاب تعلیم کو اکثریت کے مخصوص مذہبی رجحانات میں رنگنا شروع کر دیا اور اسلامی تہذیب کو فنا کے گھاٹ اتارنے کی ایک خفیہ کوشش شروع ہو گئی کہ نصاب تعلیم کے ذریعہ ابتدا ہی سے آنے والی نسل کے ذہن کو اس طرح ڈھالا جائے کہ اس کو اسلامی عقائد اور نظریات سے دور کر دیا جائے۔ [2]

خدا نہ کرے یہ خفیہ سازش کامیاب ہو جاتی تو جس مقصد کی تکمیل ملک کے خونی فسادات نہ کر سکے وہ مقصد بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ حاصل ہو جاتا۔ جمعیۃ علمار ہند

---

[1] مولانا محمد اسرار الحق قاسمی، ملی کردار ص ۲۳

[2] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علمار ہند ص ۲۸۱

نے بروقت اس خطرہ کو محسوس کیا ـــــ اور اپنے فریضہ خدمت کی ذمہ داریوں کو نامساعد اور ناساز گار حالات میں بھی پورا کیا ـــــ اس کے رہنماؤں نے ملک کے گوشے گوشے میں پھر کر دینی تعلیم کے فروغ اور اس کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک ملک گیر ذہنی انقلاب برپا کیا اور مسلمانانِ ہند کے تمام ہی حلقے اور مکاتب فکر کے لوگوں کو اس تحریک اور وقت کے اس اہم تقاضے سے آشنا کرایا یہاں تک کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے جدید ماحول سے استعداد و آمادگی کی صدائیں آنے لگیں ـــــ اس طرح دینی تعلیم کی مہم وقت کی ایک اہم پکار بن گئی۔ [1]

ملک کے مختلف حصوں میں دینی تعلیمی کانفرنسوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۱۹، ۲۰ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو احمد آباد میں ایک عظیم الشان دینی، تعلیمی کانفرنس ہوئی۔ پھر کل راجستھان' دینی تعلیمی کانفرنس جے پور میں ۱۳، ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو مولانا شاہد فاخری کی صدارت میں ہوئی۔ اس کے بعد الہ آباد میں ایک دینی کانفرنس ۱۲، ۱۳ر اپریل ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ ۲۸ر مئی ۱۹۵۵ء کو بہوروا ضلع بلیا میں شاہ معین الدین ندوی کی صدارت میں دینی تعلیمی کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس طرح ایک دینی تعلیمی کانفرنس خلیل آباد ضلع بستی میں ۳۱ر مارچ ۱۹۵۶ء کو پھر رائے پور' مدھیہ پردیش میں ۱۳، ۱۴ر مئی ۱۹۵۸ء کو مولانا احمد سعید کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس کے بعد بمبئی' اُجین اور پالن پور گجرات وغیرہ میں مسلسل دینی تعلیمی کانفرنسیں منعقد کی جاتی رہیں۔ [2]

اس ملک گیر تحریک سے مسلمانوں میں بیداری کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ نئے

---

[1] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علماء ہند ص ۲۸۲

[2] اسیر ادروی' تاریخ جمعیۃ علماء ہند۔ ص ۲۸۲۔۲۸۳ الہ آباد' بلیا اور بستی کی دینی تعلیمی کانفرنسیں' انجمن تعلیمات دین کی کوششوں کے نتیجہ میں جمعیۃ العلماء کے تعاون سے ہوئیں۔

حوصلے اور نئی امنگوں کے ساتھ آزاد ہندوستان میں اسلامی تعلیمات و روایات کے مستقبل کو تابناک بنانے کی مہم کا آغاز ہوگیا۔ پورے ملک میں اسلامی مدرسوں اور دینی مکتبوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوا کہ متحدہ ہندوستان میں بھی اتنی بڑی تعداد نہیں تھی۔ [۱]

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی بحالی :-

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ملت اسلامیہ ہند کے تعلیمی نظام کو ملت کے زیر نگرانی رکھنے کی غرض سے تین اہم عصری تعلیمی ادارے قائم کئے گئے تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ملک کی آزادی کے بعد بعض فرقہ پرست عناصر اور حکومت کی جانب سے ان مسلم اقلیتی اداروں کو ان کے ماضی سے کاٹ دینے اور ان کے اقلیتی کردار کو تباہ کرنے کی نہ صرف مسلسل کوششیں شروع کی گئیں بلکہ سازشیں بھی کی گئیں۔ ۱۹۴۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کو مکمل طور پر سیکولر یونیورسٹی بنا دیا گیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پر بھی دست درازی شروع کی گئی اور بار بار یہ یقین دہانی کرانے کے باوجود کہ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار محفوظ رکھا جائے گا۔ ایسا نہیں کیا گیا۔

لیکن جب ۱۹۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی کا ترمیمی ایکٹ بنا تو یہ ایکٹ بھی خلاف توقع اتنا ناکارہ اور معاندانہ تھا کہ مسلمان اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے اور اس ایکٹ کے خلاف پورے ملک میں آگ لگ گئی۔ ملک کے ہر حصہ میں احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کا تانتا لگ گیا اور حکومت سے اس ایکٹ کو ختم کرانے کا مطالبہ روز بروز زور پکڑتا گیا۔ [۲]

---

[۱] اسیر ادروی تاریخ جمعیۃ علماء ہند ص ۲۸۴

[۲] " " " " ص ۲۳۰

مسلمانوں کے اپنے حقوق کے اس سیدھے سادے مطالبہ کو چالاک سیاست دانوں اور فرقہ پرستوں نے فرقہ واریت کا رنگ دے کر ہندو، مسلمانوں کو آپس میں بھڑا دیا اور جگہ جگہ فسادشروع ہو گئے لیکن مسلمان اپنے مطالبہ سے دست بردار نہ ہوئے بلکہ ہر آزمائش کے باوجود وہ اس مطالبہ پر مضبوطی سے جمے رہے۔

جمعیۃ علمار ہند نے اس آگ اور خون کی بارش میں مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا۔ اس اجلاس نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کو ایک تعلیمی ادارے کی آزادی اور خود مختاری پر دست درازی، ایک کاری ضرب اور مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی قرار دیا اور کہا کہ یہ ایکٹ کانگریس مینی فیسٹو میں دی گئی ضمانتوں اور ان وعدوں اور یقین دہانیوں کے بھی خلاف ہے جو برابر کی جارہی تھیں [1]

جمعیۃ علمار ہند نے ایکٹ پر نظر ثانی اور اس کے نقائص پر زور دیتے ہوئے حسب ذیل اصلاحات کا مطالبہ کیا۔

۱۔ مسلم یونیورسٹی کورٹ با اختیار بنایا جائے اور یونیورسٹی کورٹ کے ممبران کی اکثریت منتخب ہو۔

۲۔ چانسلر، وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر کی نامزدگی کے طریقے کو بدلا جائے

۳۔ وائس چانسلر کے اختیارات کو ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کے مطابق کیا جائے۔

۴۔ ایگزیکیٹو اور فنانس کمیٹی کی تشکیل ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کے مطابق ہو۔

۵۔ اکیڈمک کونسل کے اختیارات کو بحال کیا جائے۔

۶۔ آنریری (Treasurer) ٹریزار کے عہدہ کو بحال کیا جائے۔

۷۔ ترقیات کے لئے سینیوریٹی (Seniority) اور صلاحیت کو معیار قرار دیا جائے۔

---

[1] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علمار ہند ص ۳۴۷

۸۔ اسٹوڈینٹس یونین کے ہوتے ہوئے اسٹوڈینٹس کونسل کے قیام کو ختم کیا جائے۔
۹۔ یونیورسٹی کی تعلیم اور اندرونی انتظام کے لئے قواعد وقوانین بنانے کا مکمل اختیار ہو۔ [۱]

اس کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند دوسرے ذرائعوں سے بھی حکومت وقت سے برابر مطالبہ کرتی رہی کہ مسلمانوں کے جائز مطالبہ کو منظور کرکے یونیورسٹی کو انتشار وخلفشار سے بچائے۔ لیکن صورت حال میں آئے دن ابتری پیدا ہوتی گئی۔۔۔۔ یونیورسٹی کو جبراً بند کر دیا گیا۔ طلباء کو انتہائی ظالمانہ طریقے سے ہوسٹلوں سے نکالا گیا اور اساتذہ کو بلاوجہ معطل کیا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند نے یونیورسٹی کی غیر معینہ تالابندی پر بھی سخت احتجاج کیا اور اس وقت کے ناظم عمومی مولانا سید اسعد مدنی نے پرزور الفاظ میں کہا کہ

"مسلم یونیورسٹی کی تالابندی غلط، غیر جمہوری اور یہ قدم قطعی غیر دانشمندانہ ہے۔ یہ ایک سازش ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے بند کیے جانے کے غیر جمہوری اقدام نے آج یہ حقیقت کھلے طور پر واضح کردی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی خودمختاری ختم ہوچکی ہے۔۔۔ یونیورسٹی کی تالابندی نے وزیر تعلیم کی اس (مسلم یونیورسٹی کو تباہ وبرباد کرنے والی) نیت کو بے نقاب کر دیا ہے۔" [۲]

پھر ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند نے ۲؍جون ۱۹۷۲ء کو پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے وزیر تعلیم اور حکومت کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

اس طرح کی باتوں سے ہی ملک میں تشویش، غیر یقینی حالت اور بدگمانیوں کی فضا پیدا ہوئی۔ یہ فضا تمام اقلیتوں اور مسلمانوں کے دلوں میں قائم ہے اگر ملک کی

---

[۱] اسیرادروی، تاریخ جمعیۃ علماء ہند ص ۴۳۸
[۲] " " " " ص ۴۳۹

ساڑھے سات کروڑ اقلیت اپنے معاملات میں تکلیف محسوس کرتی ہے تو ملک مطمئن نہیں ہو سکتا۔ [1]

اس کے بعد ناظم عمومی نے خاص طور سے وزیر تعلیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ــــ

"آپ خاص قسم کے ذہن کے لوگوں کو یونیورسٹی میں لانا چاہتے ہیں اور جو لوگ اب تک یونیورسٹی سے وابستہ رہے ہیں۔ آپ ان کو پیچھے ہٹانا چاہتے ہیں۔ مسلم ایجوکیشن کانفرنس جس نے اس کو جنم دیا ہے جو اس کا بانی ہے۔ اگر اس کے چند آدمی لئے جائیں تو کوئی غضب نہیں ہو جائے گا۔"

الغرض جمعیۃ علماء ہند نے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے لئے اس وقت کے حالات میں جو کچھ کیا جا سکتا تھا وہ سب کچھ کیا اور کسی موقع پر بھی پست ہمت ہو کر نہیں بیٹھی۔

تعلیم و تبلیغ کا کام:۔

یوں تو شدھی سنگٹھن تحریک سوامی شردھانند کے ذریعہ آزادی سے پہلے ۱۹۲۲ء سے شروع کی جا چکی تھی۔ اس تحریک کے ذریعہ دور دراز علاقوں کے ناخواندہ اور سیدھے سادے مسلمانوں کو یہ فریب دے کر کہ تمھارے باپ دادا کو مسلمان بادشاہوں نے ظلم و جبر کر کے مسلمان بنا لیا تھا۔ تم لوگوں کو اب پھر اپنے اصل ہندو مذہب پر لوٹ آنا چاہیئے۔

ملک کی آزادی کے بعد اس تحریک نے اور زیادہ بال و پر نکالے۔ ۱۹۴۷ء اور اس کے قریبی زمانے میں خونی ہنگاموں کا شکار اور لٹے پٹے مسلمان اس

---

[1] اسیرادروی، تاریخ جمعیۃ علماء ہند ص ۳۴۰

تحریک کا بھی شکار ہونے لگے یعنی ۱۹۴۷ء میں ملک بھر میں جو خون کی ہولی کھیلی گئی۔ اس میں جان اور آبرو تو لٹی ہی تھی قوم کا علمی اور دینی سرمایہ بھی رخصت ہونے لگا۔ ملک کے کئی علاقوں خاص کر مشرقی پنجاب اور راجستھان وغیرہ میں ہر طرف دینی بے راہ روی، ارتداد اور مذہب پر بے اعتمادی عام ہو چکی تھی۔

پنجاب، ہماچل، راجستھان، الور، بھرت پور، میوات اور دہلی، الغرض صوبے، شہر اور قصبات دینی بے حسی اور اتداد کا شکار تھے۔ ہزاروں مساجد اور مدرسے برباد کر دیے گئے تھے۔[1]

پھر یوپی کے علاقے ہاتھرس، آگرہ اور متھرا میں بھی پچاسوں گاؤں اس ارتداد کی لپیٹ میں آ گئے۔[2]

غرض یہ کہ ایک عجیب صورت حال تھی جو حساس مسلمانوں اور ان کی جماعتوں کے سامنے ایک چیلنج بن کر آئی تھی۔

جمعیۃ علماء ہند نے اس چیلنج کو بروقت قبول کیا اور ارتداد کے فتنے کو روکنے کی کوشش فوری طور پر شروع کر دی۔

صوبہ راجستھان کے علاقہ بیاور میں ـــــ تقریباً پچاس[5] ہزار مسلمان مرتد ہو گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ بڑی جدوجہد کے بعد ارتداد کا سلسلہ تقریباً رک گیا اور بیشتر مرتدین اپنے دین اسلام پر واپس لوٹ آئے۔[3]

اس طرح جمعیۃ علماء ہند نے ملک کے دوسرے علاقوں میں ارتداد کے خلاف مؤثر کارروائی کی اور مضمحل ملت کی مسیحائی کے لئے اپنے دن رات ایک کر دیے۔ لٹے پٹے علاقوں میں جا کر ہر جگہ مدارس اور مکاتب قائم کئے۔ مسجدوں میں

---

[1] مولانا محمد اسرار الحق، ملی کاوش ص ۲۴

[2] " " " ص ۲۴

[3] اسرار الحق، ملی زندگی کا اہم موڑ ص ۲۲

صباحی اور شبینہ درس گاہوں کا انتظام کیا اور ہر قسم کے خطرات کے باوجود ہر ایسے علاقے میں ایک ایک عالم نے قیام کیا تاکہ دین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہے اس طرح ان علاقوں میں اسلامی شعائر اور مآثر کو زندہ کیا۔ شریعت اسلامیہ کے تحفظ اور اسلامی مفادات کا سامان مہیا کیا۔[1]

جمعیۃ علماء ہند اور عالم اسلام :-

ہندوستان کے مسلمانوں کا عالم اسلام اور خاص طور پر عالم عرب سے انتہا درجہ کا جذباتی تعلق رہا ہے انھوں نے عالم اسلام اور عالم عرب میں آنے والی ہر تبدیلی پر نظر رکھی ہے۔ ان کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھا ہے اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی محسوس کیا ہے۔ یہی حال اسلامی تحریکوں اور جماعتوں کا بھی رہا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند نے عالم اسلام کو درپیش ہر مسئلہ پر مسلمانان ہند کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کو اپنا فرض سمجھا۔ لہذا مسائل (یعنی عالم اسلام، عالم عرب اور خاص طور پر فلسطین کے مسائل) کے سلسلہ میں اس کا دائرہ عمل صرف قرارداد وں تک محدود نہیں رہا بلکہ عرب کاز کو تقویت دینے کے لئے بار بار یوم احتجاج بھی منایا۔ کانفرنسیں بھی ہوئیں اور مظاہرہ بھی کیا۔[2]

اس کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند نے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر "مجلس تحفظ فلسطین" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ دوسری جماعتوں کے افراد کو بھی اس تنظیم میں شامل کیا جو عربوں کے کاز کے ہمنوا تھے۔[3]

جمعیۃ علماء ہند نے ۲/ اگست ۱۹۳۸ء کو اس تنظیم کا پہلا اجلاس بلایا اور

---

[1] اسرار الحق، ملی کاوش ص ۲۴

[2] مولانا اسرار الحق، ملی زندگی کا اہم موڑ ص ۲۰

[3] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علماء ہند ص ۴۰۵

اس میں طے کیا گیا کہ تمام ہندوستان میں فلسطینی عربوں کی حمایت میں جلسے کئے جائیں اور تجویزیں پاس کر کے حکومت کو بھیجی جائیں اور ہر مرکزی شہر میں تحفظ فلسطین کی شاخیں قائم کی جائیں۔ رضا کار بھرتی کئے جائیں اور ان کی مضبوط اور منظم جماعتیں بنائی جائیں۔ [۱]

فلسطین کے سلسلہ میں جمعیۃ علماء ہند کا طرز عمل اور طریقہ کار حمایت پر مبنی اور ہمدردانہ رہا ہے اور جمعیۃ علماء ہر ہر مرحلے پر فلسطینی عربوں کی حمایت میں پیش پیش رہی ہے۔

اس کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند نے افغانستان، عراق، شام، مصر، موصل، مراکش تیونس، الجیریا اور سری لنکا کے مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا ہے اور جس طرح بھی ممکن ہوا ان سے تعاون کیا ہے۔

نظام امارت کی تشکیل :-

احیاء دین، اعلائے کلمۃ اللہ اور خدا کی زمین پر خدا ہی کے احکام کے نفاذ کے لئے نظام امارت کو ہمیشہ ہمارے اسلاف نے سامنے رکھا بلکہ حسب استطاعت اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے جدوجہد بھی کی اور شروع سے ہی جب ہندوستان کی مسلم حکومت کا چراغ ٹمٹمانے لگا تو علمائے وقت نے امارت شرعیہ کی طرف دھیان دیا اور اس کے قیام کے لئے مخلصانہ جدوجہد کی۔ اور پھر بعد کے زمانے میں آنے والے علماء نے اس سمت میں برابر کوششیں جاری رکھیں۔

جمعیۃ العلماء کے اراکین کو بھی امارت شرعیہ کی ضرورت کا پورا احساس تھا لہذا اراکین جمعیۃ نے جمعیۃ کے علاوہ دوسرے علمائے کرام سے بھی اس مسئلہ میں مشورہ لیا چنانچہ ستمبر ۱۹۸۶ء کو دفتر جمعیۃ علمائے ہند میں علماءِ کرام کا ایک مخصوص

---

[۱] اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علماء ہند ص ۵۵۵

اجتماع ہوا جس میں غور و فکر کے بعد یہ طے پایا کہ موجودہ حالات میں نظام امارت کا قیام ضروری ہے۔ [1]

مزید اطمینان کے لئے ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند مولانا اسرار الحق قاسمی صاحب نے ملک کے سات صوبوں کا دورہ کیا اور وہاں کے عالموں سے اس سلسلہ میں گفتگو کی اور پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ عام مسلمانوں کا دین دار طبقہ اس ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔

اس کے بعد کل ہند امارت شرعیت کے انتخاب کے لئے اہم علماء اور ملک کے علوم اسلامیہ کے مراکز کو دعوت نامہ بھیجے گئے۔ چنانچہ ۲ر نومبر ۱۹۸۶ء کو بوقت ۹ بجے مدنی ہال بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی میں یہ اجتماع منعقد ہوا جس میں دلی یو، پی، بہار، مدھیہ پردیش، کیرالہ، گجرات، اڑیسہ، مہاراشٹر، راجستھان، ہریانہ، کرناٹک، آسام، مغربی بنگال، آندھرا وغیرہ سے تین ہزار سے زائد نمائندے شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں مولانا سید اسعد مدنی صاحب نے امارت شرعیہ کی اہمیت پر تقریر کی اور بہ اتفاق رائے سے محدث کبیر ابو المآثر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کو امیر الہند کے منصب کے لئے چنا گیا۔ اور مولانا شاہ عون احمد صاحب قادری کو نائب امیر الہند کے لئے چنا گیا۔ اس کے بعد نائب امیر الہند کے دست مبارک پر شرکاء اجتماع نے بیعت عام کی کیوں کہ امیر الہند مولانا اعظمی اپنی علالت کی وجہ سے اجتماع میں شریک نہیں تھے۔ [2]

امارت شرعیہ کے فرائض :-

امارت شرعیہ کا مقصد عام مسلمانوں کے اندر شرعی ذمہ داریوں کا احساس دلانا

---

[1] مولانا حبیب الرحمن قاسمی، اسلام میں امامت و امارت کا تصور ص ۸۹، ۹۰

[2] " " " " " " ص ۹۰ تا ۹۲

اوران کو احکامات ضروریہ پر عمل کرنے کے لئے آمادہ کرنا ہے نیز ان کے اندر شرعی اجتماعیت پیدا کرنا ہے۔ [۱]

امیر کے فرائض کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ [۲]

۱۔ احیائے دین و اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنا۔
۲۔ مسلمانان ہند کو متحد و متفق رکھنے کے لئے بقدر امکان کوشش کرنا۔
۳۔ مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی حالت کو درست کرنے کی جدوجہد کرنا اور اس کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنا۔
۴۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کو تقریر و تحریر اور قانونی و جمہوری ذرائع اختیار کر کے دفع کرنے کی سعی کرنا۔
۵۔ مخالفین اسلام کی طرف سے دین و شریعت کے خلاف پیش کردہ شبہات و اعتراضات کا تقریر و تحریر کے ذریعہ جواب دینا۔
۶۔ مسلمانوں کے عائلی و معاشرتی امور کی اصلاح و حفاظت کی جدوجہد کرنا اور محکمہ شرعیہ قائم کر کے پیش آمدہ عائلی مسائل کو حل کرنا۔
۷۔ مسلمانوں کے باہمی نزاعات کا قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں عادلانہ فیصلہ کرنا۔
۸۔ بیت المال کے ذریعہ زکوٰۃ کے جمع و صرف کا شرعی نظام قائم کرنا۔
۹۔ مساجد، مدارس اسلامیہ اور مسلم اوقاف کی حفاظت و دیانت اور اس سلسلہ کے ضروری امور کا انتظام و انصرام کرنا۔
۱۰۔ احکام شرعیہ کے نفاذ و اجراء کے لئے مناسب اقدام کرنا۔

---

[۱] مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، اسلام میں امامت اور امارت کا تصور ص

[۲] ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ص ۹۶-۹۷

دوسری بہت سی سرگرمیاں :۔

اس ملک میں آباد مسلمانوں کے سامنے ہمیشہ کچھ نہ کچھ مسائل ابھرتے رہے ہیں اور ان مسائل سے مسلمانوں اور ان کی جماعتوں نے ہمیشہ لوہا لیا ہے اور کبھی کسی چھوٹے بڑے مسئلہ سے منہ پھیر کر راہ فرار اختیار نہیں کی ہے۔

جمعیۃ علماء ہند نے مسلمان علماء کی جماعت ہونے کے باعث ہمیشہ مسلمانوں کے مسائل کو اہمیت دی اور انھیں اپنے مسائل تصور کیا اور ان کو فرو کرنے کے لئے بھرپور جدوجہد کی ہے۔ اب چاہے یہ مسئلہ قدرتی آفات کا ہو، آسام اور راجستھان میں آباد مسلمانوں کی شہریت کا، مسلمانوں کے اوقاف قبرستان اور مساجد کا، مسلم معاشرہ کی اصلاح کا، مسلمانوں کی معاش کا، عازمین حج کا یا اس وقت ملک کا بہت زیادہ حساس مسئلہ بابری مسجد کا ہو، جمعیۃ علماء ہند نے ان میں سے ہر مسئلہ سے تعرض کیا ہے اور اسے حل کرنے یا کرانے کی ہمیشہ سرگرم جدوجہد اور بھرپور کوشش کی ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کا تنقیدی جائزہ

جب کوئی تنظیم وجود میں آتی ہے اور وہ عمل کی دنیا میں قدم رکھتی ہے تو کچھ حلقے اگر اس کی حمایت کرتے ہیں تو کچھ دوسرے حلقوں کی جانب سے اس کی مخالفت بھی کی جاتی ہے۔

یہ حمایت اور مخالفت فکر و نظر کی بھی ہوتی ہے اور عمل کی بھی لیکن اس حمایت اور مخالفت میں اگر ذاتی مفاد شامل نہیں ہے اور دونوں طرح کا طرز عمل نیک نیتی پر مبنی ہے تو بلاشبہ یہ ایک تعمیری عمل ہوگا پھر کچھ باتیں اصولی اور بنیادی نوعیت کی ہوتی ہیں اس اعتبار سے ان کی بہت زیادہ اہمیت بھی ہوا کرتی ہے۔

جمعیۃ علمار ہند کے تنقیدی جائزہ میں سب سے اہم اور بنیادی چیز جمعیۃ علمار ہند اور اس کے اکابر کا نظریہ قومیت ہے۔

جمعیۃ علمائے ہند نے اپنے قیام کے بعد جب ہندوستان کی تحریک آزادی میں شامل ہونے کے لئے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو فوری طور پر ایک مسئلہ اس کے سامنے آیا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک قوم ہیں یا دونوں دو الگ الگ قومیں ہیں ، جمعیۃ علماء ہند نے ہندو اور مسلمان کو ایک قوم تسلیم کیا اور اس نظریہ کی پرزور داعی بن کر عوام کے سامنے آئی اور اپنے اس متحدہ قومیت کے نظریہ کے باعث ملک کی آزادی کی جنگ میں مسلم لیگ کی حریف اور کانگریس کی حلیف جماعت بن گئی۔

جمعیۃ علماءِ ہند کے اس متحدہ قومیت کے نظریہ سے سب سے پہلے خود علماءِ ہند دیوبند میں اختلاف پیدا ہوا اور یہ دو الگ الگ کیمپوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک نے ہندو اور مسلمان کو دو الگ الگ قومیں تسلیم کرتے ہوئے مسلم لیگ کی حمایت اختیار کی اور دوسرا مستقلاً کانگریس سے وابستہ رہا۔

پھر ایک موقع پر صدر جمعیۃ علماء ہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جب دہلی کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔

مسلم عوام و خواص جو متحدہ قومیت کے خطرہ سے واقف ہو چکے تھے۔ شیخ الاسلام کی اس رائے کو قبول نہ کر سکے۔ اخبارات نے اس پر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بڑے بڑے مضامین لکھے ـــــ شیخ الاسلام کے اس بیان کے اوپر علامہ اقبالؒ نے بھی اعتراض کیا اور دو قومی نظریے کی تائید کی۔

جمعیۃ علماء ہند اور اس کے اکابرین کے متحدہ قومیت کے نظریہ پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بھی سخت تنقید کی ہے۔ اس وقت تک جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنے نظریہ قومیت کے دفاع اور تائید میں ایک کتاب "متحدہ قومیت اور اسلام" بھی لکھ چکے تھے۔ اس کتاب میں مولانا مدنیؒ نے علامہ اقبالؒ کے اعتراض کو تسلیم نہ کرتے ہوئے لکھا تھا ـــــ

"جناب ڈاکٹر صاحب موصوف مسلمانانِ ہند کو قومیت متحدہ کا مشورہ دینا خلافِ دیانت سمجھتے ہیں اور یہ امر چونکہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے اس لئے مجھے کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔"[1]

شیخ اسلام نے اس کے بعد قرآن کے الفاظ اور حدیث کے کلمات کا حل عربی لغات سے نکال کر قوم اور امت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔[2]

---

[1] عمر حیات خاں غوری، اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ، مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی ص ۱۳۵

[2] مولانا سید حسین احمد مدنی۔ متحدہ قومیت اور اسلام ص ۱۰
بحوالہ عمر حیات خاں غوری، اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ ص ۱۴۰

اور پھر یہ نتیجہ پیش کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :

الف : قرآن کے نقطۂ نظر اور استعمال میں لفظ قوم اپنے معنی کی حیثیت سے مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ ہر اس جماعت پر بولا جائے گا، جن میں کوئی ربط ہو، خواہ نسب کا، یا وطن کا یا پیشہ کا یا زبان وغیرہ کا۔

ب : قومیت میں اشتراک مسلم اور کافر ہو سکتا ہے اور قرآن کے استعمال میں یہ موجود ہے۔

ج : پیغمبر بھی کافر اور مشرک اور فاسق کے ساتھ دنیاوی تعلقات رکھ سکتا ہے اور رکھتا ہے۔[1]

اس کتاب "متحدہ قومیت اور اسلام" کے آجانے سے بات صاف اور واضح ہو گئی تھی۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب "مسئلہ قومیت" کے تیسرے مضمون میں اس کتاب پر تبصرہ کیا ہے۔

اس لغوی "امت" کو آج کی اصطلاحی "متحدہ قومیت" سے کیا واسطہ؟ زیادہ سے زیادہ اس کو آج کل کی سیاسی زبان میں فوجی اتحاد کہہ سکتے ہیں۔ یہ محض ایک تخالف تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہود اپنے دین پر اور مسلمان اپنے دین پر رہیں گے۔ دونوں کی تمدنی و سیاسی ہیئتیں الگ الگ رہیں گی۔ البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے اور دونوں اس جنگ میں اپنا اپنا مال خرچ کریں گے۔ دو تین سال کے اندر ہی اس تخالف کا خاتمہ ہو گیا۔ کیا اس کا نام متحدہ قومیت ہے؟ کیا کس معنی میں بھی یہ چیز اس متحدہ قومیت سے مماثلت رکھتی ہے جو اس وقت معرض بحث میں ہے ۔۔۔؟ کیا وہاں کوئی مشترکہ اسٹیٹ بنائی گئی تھی؟ کیا وہاں کوئی مشترکہ مجلس قانون ساز بنائی گئی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ یہودی اور مسلمان ایک مجموعہ ہوں گے اور اس مجموعہ میں جس کی اکثریت ہوگی مدینہ پر حکومت کرے گا اور اس کے

---

[1] مولانا سید حسین احمد مدنی، متحدہ قومیت اور اسلام ص ۲۳، ۲۴

بحوالہ عمر حیات خاں غوری، اقبالؒ اور مودودیؒ کا تقابلی مطالعہ ص ۱۴۰

منظور کئے ہوئے قوانین مدینہ میں نافذ ہوں گے ؟ کیا وہاں مشترکہ عدالتیں قائم تھیں جن میں یہودی اور مسلمانوں کے قضایا کا یکجا اور ایک ہی ملکی قانون کے تحت فیصلہ ہوتا ہو ؟ ـــــ مولانا آخر فرمائیں تو کہ جس "متحدہ قومیت" کو وہ رسول خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس میں آج کل کی "متحدہ قومیت" کے عناصر ترکیبی میں سے کون سا عنصر پایا جاتا ہے ؟ اگر وہ کسی عنصر کا پتہ نہیں دے سکتے اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہرگز نہیں دے سکتے .... جب شفاخانہ سے ہی زہر تقسیم ہونے لگے تو امن کہاں تلاش کیا جائے ۔ ؎

جمعیۃ علماء ہند اور اس کے اکابرین کے معاشی و اقتصادی نظریات پر بھی تنقید کی گئی ہے ۔ جمعیۃ علماء کے ناظم عمومی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اسلام کے معاشی احکام و قوانین کو ایک نظام کی شکل میں پیش کرنے کے لئے ایک کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" تالیف کی ۔ اس کتاب میں قرآن، احادیث اور فقہی کتابوں سے بہت سا مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے اور اس طرح مولانا محترم نے اپنی اس کتاب کے ذریعہ دنیا کے موجودہ معاشی مسائل کا ایک صحیح و متوازن حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب نے اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" میں اس کتاب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے اقتصادی و معاشی نظریات کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ مولانا کی علم معیشت سے فنی واقفیت محض سرسری ہے ۔ اور انھوں نے قرآن، احادیث اور فقہی کتابوں سے جو بہت سا قابل قدر مواد فراہم کیا ہے اسے فنی طریقہ پر مرتب کرنے کے بجائے عجیب طریقہ پر بکھیر دیا ہے ۔

لیکن مولانا مودودیؒ نے اصل تنقید مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے نظریات

؎ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ۔ مسئلہ قومیت ۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ص ۹۲، ۹۳، ۹۴

پر کی ہے۔ کتاب کا سب سے زیادہ افسوسناک حصہ وہ ہے جہاں ہندوستان کے موجودہ حالات پر مصنف نے اپنے نظریات کو منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقام پر سب سے پہلے وہ حاضر الوقت معاشی نظام میں انقلاب کی ضرورت ظاہر کرتے ہیں پھر فرماتے ہیں کہ یہ انقلاب دو نظریوں میں سے کسی ایک نظریہ ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے ایک خالص اسلامی نظریہ، دوسرا وہ نظریہ جو اسلامی نظریہ کے اصولوں سے قریب رہا ہو۔ (یعنی اشتراکی نظریہ) اور آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ ——

"بلاخوف لومۃ لائم اسلامی بصیرت کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس ملک میں سردست پہلا نظریہ جامۂ عمل نہیں پہن سکتا بلکہ دوسرا نظریہ ہی ممکن الوقوع ہے۔"[1]

ساری بحث کے بعد یہ نتیجہ جس پر ہر لائم کی ملامت سے بے خوف ہو کر جناب مولانا پہنچے ہیں۔ ان کی اس تمام محنت پر پانی پھیر دیتا ہے جو انھوں نے اسلامی نظامِ معیشت کی خوبیاں بیان کرتے میں صرف فرمائی ہے جو چیز سردست جامۂ عمل پہن ہی نہیں سکتی بہتر تھا کہ "سردست" اس کی شرح و تفسیر میں بھی وقت ضائع نہ کیا جاتا پھر وہ اشتراکیت جس کو وہ اپنی عجیب و غریب "اسلامی بصیرت" کی بنا پر اسلامی نظریہ سے قریب تر سمجھ رہے ہیں چند ظاہری پہلوؤں میں اسلام سے کچھ قریب ہو تو ہو مگر اس کی فلسفیانہ بنیاد اس کی اخلاقی روح، اس کا نظریہ حیات اور اس کا تجویز کردہ نظام اجتماعی تو اسلام سے اتنا ہی دور ہے جتنا موجودہ سرمایہ داری نظام اس کو اسلام سے وہی قریب سمجھ سکتا ہے جو اس کو نہ جانتا ہو یا پھر اسلامی بصیرت ہی نہ رکھتا ہو۔[2]

---

[1] پروفیسر خورشید احمد، ادبیات مودودی مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ص ۲۱۱

[2] " " " " " " " ص ۲۱۱، ۲۱۲

جمعیۃ علماء ہند اور اس کے اکابرین کی فکری اور نظری لغزش کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے؟ مولانا مودودیؒ کہتے ہیں کہ یہ اسلام کی نہیں علماء کی اپنی کمزوری ہے۔

علماء کرام کے جس گروہ سے مولانا (حفظ الرحمٰن صاحب) کا تعلق ہے اس پر نااہلی کے ساتھ کم ہمتی اور شکست خوردگی کا تسلط ہو گیا ہے۔ ان لوگوں میں خود اپنے بل بوتے پر کوئی اسلامی تحریک اٹھانے کی ہمت نہیں ہے۔ اس لئے کبھی اشتراکیت کے دامن میں پناہ لیتے ہیں اور کبھی کسی دوسرے ہمسایہ کی پامردی سے بہشت میں پہنچنا چاہتے ہیں لیکن اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے لوگوں کو یقین یہ دلاتے ہیں کہ قصور ہمارا نہیں ہے یہ اسلامی نظریہ ہی کم بخت ایسا ہے کہ "سردست" اس کا جامہ عمل پہننا محال ہے ـــــ جس نظریہ کے پیرو محض نظری حیثیت سے اس پر ایمان رکھتے ہوں مگر نہ کارِ داں ہو نہ صاحب عزم، وہ نظریہ کبھی قیامت تک جامہ عمل نہیں پہن سکتا۔ [1]

جمعیۃ علماء ہند کے فکر و نظر پر تنقید کے علاوہ اس کے ارکان کی اکابر پرستی اور جماعت میں جمہوری روایات کو ختم کر کے زبان بندی اور عقیدت مندانہ نیاز مندی، جماعت کے منصب و مرتبہ میں گراوٹ، علماء کی آواز کی بے اثری اور مسلم عوام میں بے اعتباری پر بھی تنقید کی گئی ہے۔

مولانا سید احمد ہاشمی سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء نے اپنی جماعت کی بعض بنیادی کمزوریوں پر اظہار خیال کرنے اور ان کمزوریوں کو جماعت سے دور کرنے کے لئے ارکان جماعت کو ایک دعوت نامہ برائے احتجاج جاری کیا۔ مولانا ہاشمی نے اس دعوت نامہ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ـــــ

آزادی کا سورج طلوع ہوئے چالیس۴۰ برس ہو گئے مگر اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر اندھیرا چھاتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی ہمارے نزدیک ایک وجہ یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء

---

[1] پروفیسر خورشید احمد، ادبیات مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ص ۲۱۲، ۲۱۳

سے ۱۹۴۷ء تک ۴۲ برسوں میں، ملک میں، سیاست میں، اور ایوان حکومت میں علمار کی ایک آواز تھی۔ ان کی رائے اور ان کی جدوجہد کی قدر کی جاتی تھی لیکن ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۷ء تک کے چالیس برسوں میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ تدریجاً آواز ختم ہو گئی ہے آج علمار کا، ان کی آواز کا کوئی اثر نہیں رہ گیا ہے کیوں کہ انھوں نے مسائل پر کھل کر رائے دینے سے، صحیح موقف پیدا کرنے سے اور اپنے موقف پر جدوجہد اور قربانی دینے کی روایتوں سے انحراف کر کے اپنی آواز کو بے وزن کر دیا ہے۔ نوجوان طبقہ حتیٰ کہ ہمارے فضلار مدارس بھی عوام سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ [1]

جمعیۃ علمار ہند کی جانب سے مولانا ہاشمی صاحب کے ان اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے اور بعض دوسرے حلقوں سے جمعیۃ علمار کی قدردانی بھی کی گئی ہے۔

ناظم تنظیم جمعیۃ علمار ہند مولانا صدرالدین انصاری لکھتے ہیں کہ:

"۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک جن علمار نے نعرہ حق بلند کیا تھا ان میں سے چند آزادی کے بعد بقید حیات تھے۔ حق پرستی اور انصاف پسندی کے اس مسلک کے پابند تھے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۷ء تک چالیس برسوں کے عرصہ میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا فخرالدین مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا محمد میاں جیسی برگزیدہ شخصیتوں کی خدمات شامل ہیں۔

جمعیۃ علمار ہند نے ملی زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر مرحلے پر مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے عملی اقدام کئے ہیں۔ حکومت کے دروازے

---

[1] صدرالدین انصاری۔ ایک ناگزیر فیصلہ اور اس کا پس منظر، شعبہ نشر و اشاعت جمعیۃ علمار ہند ص ۴

کھٹکھٹائے ہیں۔ اسے باخبر بھی کیا ہے اور خبردار بھی۔" [1]

جمہوری روایات کو ختم کر دینے کے الزام کی تردید کرتے ہوئے مولانا صدرالدین انصاری نے تحریر کیا ہے کہ یہ الزام بھی بے بنیاد ہے، مجلس منتظمہ جو جمعیۃ علمائے ہند کی سب سے اہم اور بڑی باڈی ہے اور جس میں ملک کی تمام ریاستوں سے تقریباً سات سو ممبران ہیں سب دستور کے مطابق منتخب ہو کر آتے ہیں کسی نیازمند یا عقیدت مند کو اس میں نامزد نہیں کیا گیا ہے۔ نیز تمام ممبران مجلس منتظمہ اور مجلس عاملہ کے اجلاسوں میں کھل کر اظہار خیال کرتے ہیں۔ [2]

جمعیۃ علماء ہند نے ملک کی آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد ملک وملت کی جو اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف یروشلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی و اسلامیات کے استاد پروفیسر یوحنا فریڈمان ان الفاظ میں کرتے ہیں ــــــ

"صرف جمعیۃ علمائے ہند ہی مسلمانوں کی وہ واحد جماعت تھی جو مسلم لیگ کی مخالفت اور انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت میں بہت نمایاں تھی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں جو حالات پیدا ہوئے انھوں نے مسلمانوں کی اس تنظیم کو نہایت اہم مقام کا حامل بنا دیا۔

چنانچہ اس جماعت کو اپنے شاندار ماضی کی بنیاد پر حکومت کی حمایت حاصل کرنے میں کامیابی بھی ملی۔ اسے اپنی حیثیت کو ایک قومی تنظیم کی سطح پر لانے کے لئے ایک ایسا مضبوط موقف اختیار کرنا پڑا جو موجودہ مایوسانہ فرقہ واریت سے پاک وصاف تھا۔ یہ موقف اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ آزادی کی قومی

---

[1] صدرالدین انصاری، الزامات کی اصلیت، شعبۂ نشر واشاعت جمعیۃ العلماء ہند ص ۶، ۷

[2] " " " " " " " " " " " ص ۷

جدّ و جہد میں علمائے کرام نے ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے۔
اس مقصد کے لئے جمعیۃ العلمائے ہند کی ممبر سازی کی شرائط
میں توسیع بھی کی گئی اور ممکن حد تک دوسری مسلم جماعتوں کو
اپنے اندر مدغم اور منضم کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔" لہ

لہ مترجم: عبدالحی فاروقی، جمعیۃ علماء ہند ایک اسرائیلی محقق کی نظر میں۔ شعبہ نشر و اشاعت ص ۵
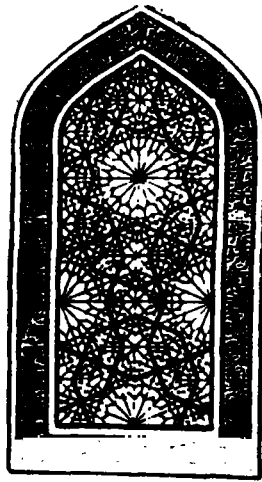
خلاصۂ کلام

جمعیۃ علمائے ہند اپنے وقت کی ایک انتہائی اہم اسلامی تحریک ہے۔ اس تحریک نے ایک عرصہ دراز تک برصغیر ہندوپاک کے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کو متاثر کیا ہے۔ اس کی اپنی ایک تاریخ ہے اس جماعت نے اپنے قیام کے اوّل دن سے ملک اور قوم کی خدمت کو اپنا نصب العین اور شعار بنایا ہے اپنے اعلیٰ مقاصد اور نصب العین کے حصول کے لئے ہمہ زمانہ اور ہمہ وقت بھرپور جدوجہد کی ہے اور بد سے بدتر حالات میں ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت کی ہے۔ انھیں ظلم وجبر کے مقابلے میں حوصلہ بخشا ہے اور نفرت وعداوت، بغض وکینہ اور قتل وغارت گری کے ماحول میں زندہ رہنے کا انداز سکھایا ہے۔

البتہ جمعیۃ علماء ہند اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں ہی کسی مرحلہ پر اسلامی تحریک سے ایک قومی تحریک میں تبدیل ہوگئی اور پھر جمعیۃ علماء ہند بعد کے زمانہ میں کبھی بھی قومی تحریک کے تنگ دائرے سے نہیں نکل پائی۔ اس معاملہ میں جمعیۃ علماء کے اکابرین کی فکری لغزش کے ساتھ ساتھ ملک کے غیر متوقع حالات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ پھر بھی جمعیۃ علماء ہند کی قیادت جب تک قدر آور شخصیتوں کے ہاتھ میں رہی۔ انھوں نے اسلامی اور قومی نقطۂ نظر میں ایک توازن برقرار رکھا اور وہ مکمل طور پر ایک قومی جماعت نہیں بن پائی۔

لیکن بعد کے ایام میں جمعیۃ علما ہند جب قدآور شخصیتوں کی قیادت سے محروم ہوگئی تو بقول مولانا سید احمد ہاشمی ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ۲۷ برسوں میں ملک میں، سیاست میں اور ایوان حکومت میں علما کی ایک آواز تھی۔ ان کی رائے اور جدوجہد کی قدر کی جاتی تھی لیکن ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۷ء تک کے چالیس[۴] برسوں میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ تدریجاً وہ آواز ختم ہوگئی۔ آج علما کا، ان کی آواز کا کوئی اثر نہیں رہ گیا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے مسائل پر کھل کر رائے دینے سے، صحیح موقف پیدا کرنے سے اور اپنے موقف پر جدوجہد اور قربانی دینے کی روایتوں سے انحراف کرکے اپنی آواز کو بے وزن کر دیا ہے اور نوجوان طبقہ حتیٰ کہ ہمارے فضلاء مدارس بھی ہم سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

باب چہارم
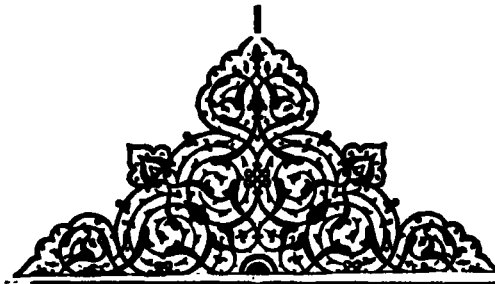
دارالعلوم دیوبند

دیوبند تحریک

اللہ تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ دین اسلام کو اس دنیا میں سربلند رہنے کے لئے برپا کیا ہے۔ قرآن پاک کی تعلیم اور حضور اکرمؐ کی پوری سیرت اس کی شاہد ہے اور صحابہ اکرامؓ کی زندگیاں اس کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔

پھر اس دین اسلام سے جس نے اپنے آپ کو وابستہ کیا، اس کی تعلیم پر عمل کیا اسے اس دنیا میں بھی عظمت اور سربلندی حاصل ہوئی اور انشاء اللہ اس دنیا کے بعد آخرت کی زندگی میں بھی کامیاب و کامران ہوگا۔

لیکن اس دین اسلام سے جس نے روگردانی کی، اپنی وابستگی کو کمزور کیا عمل سے پہلوتہی کی وہ زوال کا شکار ہوا اور ذلت خواری اس کا مقدر بن گئی۔

امت مسلمہ کی اس چودہ سو سالہ تاریخ میں بار بار ایسے مرحلے آئے کہ جب اس امت نے اپنے آپ کو اسلام سے وابستہ کیا۔ قرآن و سنت پر صدق دلی سے عمل کیا اس دنیا میں سربلند ہوئی اور جب جب اسلام سے اپنے تعلق کو کمزور کیا، اس سے دوری کا رویہ اختیار کیا۔ پستی و زوال سے دوچار ہوئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کا خاتمہ اور ۱۸۵۷ء کا المناک سانحہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا اور اس کے لئے کچھ وقتی محرکات بھی نہیں تھے۔ یہ سب کچھ ہندوستان کے مسلمانوں کی اسلام سے بتدریج دوری اور بے تعلقی

کا منطقی نتیجہ تھا۔ لیکن اللہ رب العزت کو سرزمین ہند میں اسلام اور مسلمانوں کی بقا منظور تھی اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کے اس زوال اور انحطاط کا احساس کچھ سعید طبیعتوں میں اس نے پیدا کیا اور آج یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ بدترین حالات و واقعات سے گزرنے کے باوجود مسلمان ہندوستان میں باقی ہیں۔

بانیانِ تحریک

۱۸۵۷ء کے بعد جن حضرات نے تباہ حال ہندوستانی مسلمانوں کو آگے بڑھ کر سہارا دیا، ان کے درد کا مداوا کیا، ایک اسلامی تحریک کا احیا کیا اور اس سب کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرنے کے لیے جن بزرگوں نے دارالعلوم کے قیام اور انتظام میں ابتداءً اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں، وہ حسب ذیل ہیں :-

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ولادت ۱۸۳۲ء میں سہارن پور کے ایک نواحی قصبہ نانوتہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے پیدائشی وطن میں حاصل کی بعدازاں انھوں نے کچھ عرصہ دیوبند کے ایک مکتب میں پڑھا۔ پھر اپنے نانا کے پاس سہارن پور چلے گئے۔ یہاں مولوی نواز سے عربی صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔
۱۸۴۳ء کے آخر میں انھیں حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی اپنے ہمراہ دہلی لے گئے۔ وہاں کافیہ شروع کیا اور دوسری کتابیں پڑھیں بعدازاں انھیں کالج میں داخل کر دیا گیا۔ [۱]

[۱] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۰۲

آخر میں اس حلقۂ درس میں شامل ہوئے جو علوم قرآن و حدیث میں سارے ہندوستان میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی (اس مسند علم پر اس وقت) حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رونق افروز تھے۔ ان سے علم حدیث کی تحصیل کی۔ اس زمانۂ طالب علمی میں ان کی ذہانت علم وفضل اور فہم و فراست کی شہرت عام ہوگئی تھی۔ [۱]

تعلیم سے فراغت کے بعد ذریعہ معاش کی تلاش ہوئی۔ چنانچہ ——

حضرت نانوتوی نے ذریعہ معاش کے لئے مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا کام اختیار فرمایا —— تصحیح کتب کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رہا۔ صحاح ستہ کے علاوہ مثنوی مولانا روم اور دوسری کتابیں بھی پڑھاتے تھے۔ مگر درس کسی مدرسے کے بجائے مطابع کی چہار دیواری، مسجد یا مکان پر ہوتا تھا۔ جہاں خاص خاص تلامذہ زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ [۲]

اس سب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا نانوتوی کو دینی حمیت سے بھی بہت نوازا تھا جس کا لازمی تقاضا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والے ہر فتنہ اور سازش کا مقابلہ کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی تحفظ اسلام اور اشاعت اسلام کی خدمت انجام دی جائے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد تو اس سلسلہ کو (مسلمانوں کو عیسائی بنانے اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کو) بڑی وسعت ہوئی۔ پادری لوگ بازاروں میلوں اور عام مجمعوں میں اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے لگے۔ حضرت نانوتوی نے اپنے دلی کے قیام کے زمانہ میں جب یہ صورت حال دیکھی تو اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ وہ بھی اسی طرح کھڑے ہوکر بازاروں میں

---

[۱] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۰۴

[۲] " " " " " ص ۱۱۵

وعظ کہا کریں اور پادریوں کا رد کریں۔ ایک روز خود بھی بغیر تعارف اور اظہار نام مجمع میں پہنچے اور پادری تارا چند سے مناظرہ کیا اور اس کو سر بازار شکست دی۔[1]

لیکن تحفظ اسلام کے سلسلہ میں دینی مدارس کا قیام اور تعلیمی تحریک کا احیاء مولانا محترم کا اصل کارنامہ ہے۔ جس کے باعث ہندوستان میں مسلمانوں کی زندگیاں ایک نئے انقلاب سے دوچار ہوئیں اور اپنے اور اسلام کے خلاف پیش آنے والے ہر نئے فتنے کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

مؤلف تاریخ دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں کہ ——

"حضرت نانوتویؒ کا سب سے بڑا اور عظیم کارنامہ ہندوستان میں علوم دینیہ کی نشاۃ ثانیہ کے تعلیمی تحریک کا احیاء اور مدارس دینیہ کے لئے وہ رہنما اصول وضع کرنا ہے جن پر مدارس دینیہ کی بقا کا انحصار ہے۔"[2]

اور یہ انہی کی توجہ اور ترغیب کا نتیجہ تھا کہ بہت جلد مغربی یوپی میں مختلف مقامات پر دینی مدارس قائم ہو گئے اور ان میں سے زیادہ تر اب بھی قائم ہیں۔

ان دینی مدارس میں سب سے اہم اور مرکزی حیثیت کا حامل دینی مدرسہ دارالعلوم دیوبند ہے۔ گو اس دارالعلوم کے قیام کا داعیہ کئی نیک نفس حضرات کے دلوں میں پیدا ہوا اور سب نے فرداً فرداً اس کا اظہار بھی کیا کہ اس ملک میں اب اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ وبقا کی واحد صورت ایک دینی مدرسہ کا قیام ہے لیکن ان سب حضرات میں پیش پیش مولانا محمدؐ قاسم نانوتویؒ ہی تھے۔

ان حالات سے اب یقین ہو چلا تھا کہ اسلام کا یہ چمن .... اجڑنے ہی والا ہے اور یہ کہ اب ہندوستان اسپین کی تاریخ دہرانے کے لئے کمربستہ ہو چکا ہے کہ

---

[1] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۱۷

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۱۱۶

اچانک چند نفوس قدسیہ نے بالہام خداوندی اپنے دل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی۔ یہ خلش علوم نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اور اس کے راستہ میں ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی ـــــ گو ابتدا میں اس کی شکل ایک چھوٹے سے تخم کی سی تھی مگر اس میں ایک تناور درخت پوشیدہ تھا۔ جس کی جڑیں سچے قلوب کی زمین میں پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس سلسلہ میں ان نفوس قدسیہ کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ تھے۔ جنھوں نے اس غیبی اشارہ کو سمجھا اور اسے ایک تجویز کی صورت دی۔[1]

دارالعلوم کے قیام کے وقت اس کی معنوی حیثیت کا تعین بھی اصول ہشتگانہ کے تحت مولانا نانوتویؒ ہی کا مرہون منت ہے۔ جو دارالعلوم کے تمام قوانین کے لئے بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

بہرحال اللہ تعالٰے کو محترم مولانا سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے جو خدمت لینی تھی وہ یقیناً پوری ہو چکی تھی۔ اس لئے اب ان کا مالک حقیقی کے پاس واپس جانا لازمی تھا۔

حضرت نانوتویؒ نے ۴۹ سال کی عمر میں ۴ جمادی الاوّل ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) کو پنجشنبہ کے دن وفات پائی۔ دارالعلوم کے شمال جانب آپ کا مزار پرُ انوار ہے قبر طریقہ سنت کے مطابق کچی ہے۔[2]

مولانا محمد احسن نانوتوی مولانا محترم قاسم نانوتویؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"جناب مولوی محمد قاسم صاحبؒ کو اکثر اصحاب جانتے ہوں گے مناقشہ، مجادلہ سے حذر کرتے ہیں اور عالم بے تعلقی میں آزادانہ

---

[1] مولانا محمد طیب، دیوبند کی صد سالہ زندگی مکتبہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند ص ۱۴، ۱۵

[2] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اوّل ص ۱۲۲

بسر کرتے ہیں۔ نفسیات کا نام نہیں ـــــ بندہ ان کی وضع آزادانہ کا عاشق اور ان کے کلام محققانہ کا شائق ہے۔ شرعی مسائل کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے اور فلاسفہ کے مسائل عقلی دلائل سے رد کرنے میں ان کو زبردست کمال حاصل تھا۔ [۱]

حاجی سید عابد حسین دیوبندیؒ

دارالعلوم دیوبند کے بانیان میں دوسرا خصوصی نام حاجی سید عابد حسین دیوبندیؒ کا آتا ہے۔

حاجی صاحب کا سال ولادت ۱۸۳۴ء ہے۔ قرآن شریف و فارسی پڑھ کر علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے دہلی گئے لیکن زمانہ تعلیم میں تصوف کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ علوم کی تکمیل نہ کر سکے البتہ متعدد بزرگوں سے خلعت و خلافت حاصل کیا۔ میاں جی کو کریم بخش رام پور منہیاران اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی شرف خلافت حاصل تھا۔ [۲]

حاجی عابد حسین صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے پہلے مہتمم ہیں۔ بعد ازاں دو مرتبہ اور مہتمم مقرر ہوئے۔ آپ اوّل محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء سے رجب ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء تک مہتمم رہے۔ ثانیاً ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء تا ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۲ء اور ربیع الاوّل ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۹ء تا شعبان ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۳ء مہتمم رہے۔ [۳]

---

[۱] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۲۲

[۲] ″ ″ ″ ″ ″ ″ ص ۲۲۱

[۳] مولانا قاری محمد طیب قاسمی، تاریخ دارالعلوم دیوبند طبع کراچی ۱۹۷۲ء ص ۹۴

حاجی صاحب دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے اور چونکہ آپ دیوبند کی ایک ذی وجاہت، صاحب اثر اور عابد و زاہد ہستی تھے۔ آپ کی دینداری اور بزرگی کا سکہ مرد عورت اور اپنے و پرائے سب کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔

سوانح قاسمی میں مخطوطہ کے حوالے سے لکھا ہوا ہے کہ ــــــ اہل دیوبند کو آپ سے کمال درجہ کی عقیدت ہے۔ آپ کی ذات فیض آیات سے خلائق کو بہت طرح کا نفع حاصل ہے۔ غیر مذہب والے بھی آپ کے تعویذوں کے معتقد ہیں۔ گھر بار، زمین، باغ جس قدر آپ کی ملکیت میں تھا سب کا سب راہ خدا میں دے کر محض خدا پر تکیہ کیا ہوا ہے۔ [۱]

حاجی عابد حسین صاحبؒ کے اس اثر و رسوخ سے دارالعلوم کو بہت سے فوائد حاصل ہوئے اور آپ کے بھرپور تعاون کے باعث دارالعلوم دم بہ دم ترقی اور کامیابی کی جانب گامزن رہا۔ [۲]

پنج شنبہ ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۲ء کو ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی اور دیوبند میں مدفون ہوئے

مولانا ذوالفقار علیؒ

مولانا ذوالفقار علیؒ کا دیوبند کے مشہور عثمانی شیوخ خاندان سے تعلق تھا آپ مولانا محمود الحسن شیخ الہند اسیر مالٹا کے والد تھے اور استاد علماء حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد رشید تھے۔ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے اس زمانہ

---

[۱] سوانح قاسمی جلد دوم۔ مطبوعہ غشیل پریس دیوبند ص ۳۳۹، ۳۴۱

[۲] حافظ قاری فیوض الرحمن، مشاہیر علماء دیوبند حصہ اول، مکتبہ عزیزیہ اردو بازار لاہور ص ۲۴۰

کے دیوبند کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔

مولانا حکیم عبدالحی الحسنی لکھتے ہیں کہ ـــــ

"الشیخ فاضل ذوالفقار علی بن فتح علی حنفی دیوبندی فنونِ ادب کے مشہور علماء میں سے تھے۔ ولادت ونشوونما دیوبند میں ہوئی۔ تحصیل علم کے لئے دہلی چلے گئے۔ درس کتب مولانا مملوک علی نانوتوی اور مفتی صدرالدین دہلوی سے پڑھیں اور ان کی خدمت میں کافی عرصہ رہے۔ یہاں تک معانی، بیان نحو اور ذوق شعری میں اپنے ساتھیوں سے سبقت لے گئے۔"[1]

مولانا محترم تعلیم سے فراغت کے بعد بریلی کالج میں استاد مقرر ہوئے اور بہت جلد اپنی علمی صلاحیتوں کے باعث ترقی کر کے محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر پہنچے اور اس منصب پر ایک عرصہ تک فائز رہے۔

مولانا محترم کے بارے میں فرانس کا مشہور مصنف گارسان دتاس لکھتا ہے کہ:

"وہ دہلی کالج کے طالب علم تھے چند سال کے لئے بریلی کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۰ء میں میرٹھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ مسٹر ٹیلر ان سے واقف تھے ان کا بیان ہے کہ ذوالفقار علی ذہین ہونے کے علاوہ فارسی اور مغربی علوم سے بھی واقف تھے انھوں نے اردو میں تسہیل الحساب کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو بریلی سے ۱۸۵۲ء میں چھپی ہے۔"[2]

مولانا نے کئی مشہور عربی کتابوں کی آسان اردو زبان میں شرحیں بھی تحریر کی ہیں۔ جس کے باعث عربی ادبیات کی سنگلاخ کتابیں طلباء کے لئے نہایت

---

[1] حافظ قاری فیوض الرحمٰن، مشاہیر علماء دیوبند جلد اول ص ۱۸۱، ۱۸۲

[2] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول ص ۱۲۴

آسان اور سہل ہو گئی ہیں۔ آپ کا ۸۵ سال کی عمر میں ۱۹۰۴ء کو انتقال ہوا۔

مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کے بارے میں مولانا سید حامد میاں صاحب لکھتے ہیں کہ ــــــ

"مولانا ذوالفقار علیؒ پنشن پانے کے بعد دیوبند میں آنزی مجسٹریٹ رہے وہ دارالعلوم دیوبند کے اولین بانیوں میں سے تھے۔ چالیسؔ سال تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ ۱۹۰۴ء میں بعمر ۸۵ سال وفات پائی۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پہلو میں جانب مشرق ان کی قبر مبارک ہے۔"[۱]

مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ

مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے۔ آپ نے دہلی میں مولانا مملوک علی نانوتوی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ فارسی اور اُردو کے ایک بلند پایا اور اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ مادّہ تاریخ نکالنے میں آپ کو بڑا کمال حاصل تھا۔ یوں تو مولانا نے نظمیں، قصیدے اور مرثیے، وغیرہ سب پر استادانہ طبع آزمائی کی ہے لیکن آپ کی ایک فارسی کی نظم جو دیوبند میں پھیلنے والے پلیگ کی تباہ کاریوں کی عکاسی کرتی ہے۔ تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ تعلیم کے محکمہ میں ڈپٹی انسپکٹر تھے۔ آپ اپنی ملازمت کے دوران مغربی یو پی کے متعدد اضلاع میں تعینات رہے۔ ۱۸۵۷ء میں آپ بریلی میں تعینات تھے۔

---

[۱] حافظ قاری فیوض الرحمٰن، مشاہیر علماء دیوبند جلد اول ص ۱۸۲

اللہ تعالیٰ نے مولانا فضل الرحمٰن کو صالح اور اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل اولاد سے نوازہ تھا۔ آپ کے لائق اور صالح بیٹوں میں مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا شبیر احمد عثمانی مشہور مفسر قرآن پاک اور صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند شامل ہیں۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ناظم ندوۃ المصنّفین دہلی آپ کے پوتے تھے۔

مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ اور آپ کی صالح اولادوں نے دارالعلوم دیوبند کی عظیم خدمات انجام دی ہیں اور دینی ملی خدمات کا سلسلہ اب بھی آپ کے اخلاف میں جاری ہے۔

الغرض مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ نے ۱۹۰۷ء میں وفات پائی۔

مولانا محمدؐ یعقوب نانوتویؒ

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کا نام دارالعلوم کے بانیوں اور اولین معماروں میں بہت نمایاں ہے۔

آپ استاد العلماء مولانا مملوک علی صاحب کے فرزند رشید اور مایہ ناز شاگرد تھے۔ ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء آپ کی تاریخ پیدائش ہے۔ منظور احمد آپ کا تاریخی نام ہے۔ [۱]

مولانا محمد یعقوبؒ نے ابتداءً وطن مالوف میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد اپنے والد بزرگوار سے دہلی جاکر علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ آپ انتہائی ذہین اور

---

[۱] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۲۶

عظیم الشان جامعیت کے حامل تھے۔ علم منقول و معقول میں اپنے والد محترم کا اعلیٰ نمونہ تھے۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں کہ ــــــ

"معقولات و منقولات غرضیکہ فنون میں آپ اپنے دونوں ساتھیوں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے کم نہ تھے ذکاوت اور ذہانت اللہ تعالیٰ نے بدرجہ اتم عطا فرمائی تھی اس پر طرہ یہ کہ طلب علم کا بے انتہا شوق تھا۔"[1]

مولانا نے تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔ اپنی علمی صلاحیت اور ذاتی لیاقت کے باعث کچھ ہی عرصہ بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔

دارالعلوم کے قیام کے زمانے میں مولانا اسی عہدے پر فائز تھے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے طلب کرنے پر فوراً سرکاری ملازمت چھوڑ کر دیوبند چلے آئے اور ایک قلیل سی رقم پر دارالعلوم میں صدر مدرس مقرر ہو گئے اور تدریس کے لئے درس حدیث کا انتخاب کیا۔

آپ دارالعلوم کے سب سے پہلے شیخ الحدیث ہیں۔ ۱۹ سال کی مدت میں ۱۵ اطلبا نے آپ سے علوم نبویہ کی تحصیل کی۔ جن میں مولانا عبدالحق، مولانا عبداللہ مولانا فتح محمد تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا خلیل احمد، مولانا احمد حسین مولانا فخر الحسن، مولانا حکیم منصور علی خاں، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا اشرف علی تھانوی اور حبیب الرحمٰن عثمانی جیسے مشاہیر اور یگانہ عصر علماء شامل ہیں[2]

مولانا عربی، فارسی اور اردو کے ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ نثر بھی بہت

---

[1] مفتی عزیز الرحمٰن، سا تذکرہ مشائخ دیوبند مطبوعہ کراچی ص ۱۰۰

[2] حافظ قاری فیض الرحمٰن، مشاہیر علماء دیوبند حصہ اول ص ۶۲۷

اچھی لکھتے تھے۔ آپ کے مکاتیب اور سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحبؒ یادگار ہیں۔ [1]

مولانا اپنے انتقال سے چند روز پہلے اپنے آبائی وطن نانوتہ چلے گئے تھے ۔ وہیں پر ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۶ء کو ۵۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مولانا محمد طیب صاحب قاسمی لکھتے ہیں کہ ــــ

"دارالعلوم کی صدارت تدریس پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ فائز ہوئے جو اپنی جامعیت علوم ظاہرہ و باطنہ کے سبب شاہ عبدالعزیز ثانی تسلیم کئے جاتے تھے۔ آپ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء سے ربیع الاول ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۶ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ [2]

مولانا رفیع الدین دیوبندیؒ

مولانا رفیع الدین عثمانی دیوبندیؒ دارالعلوم دیوبند کے بانیاں اور معماروں میں شامل ہیں اگرچہ آپ کی علمی حیثیت معمولی تھی لیکن اللہ تعالےٰ نے آپ کو انتظامی صلاحیت سے بہت نوازہ تھا۔

مولانا موصوف ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کے مشہور خلفاء میں تھے اور ان کا شمار اپنے زمانے کے اولیاء کاملین میں تھا۔ دو مرتبہ دارالعلوم کے مہتمم کے فرائض انجام دئے۔ دارالعلوم کی بہت سی ابتدائی عمارتیں آپ کے زیر اہتمام ہی تعمیر ہوئی ہیں جو استواری اور حسن تعمیر کا ایک اچھا نمونہ ہیں۔

---

[1] حافظ قاری فیض الرحمٰن ، مشاہیر علماء دیوبند حصہ اول ص ۶۲۷

[2] مولانا قاری محمد طیب دارالعلوم مطبوعہ دہلی ص ۹۸

آپ سے متعلق یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ــــــ

۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں جب نودرے کی عمارت کی (موجودہ عمارتوں میں سب سے پہلی عمارت ہے) بنیاد کھودنا شروع کی گئی تو آپ نے خواب دیکھا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجوزہ مقام پر تشریف رکھتے ہیں اور ان سے خطاب فرما رہے ہیں کہ یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے۔" یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے احاطہ و عمارت کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کر ان نشانات پر تعمیر کی جائے۔" مولانا نے صبح اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے۔ چنانچہ انھیں نشانات پر بنیاد کھدوا کر (نودرے کی) تعمیر شروع کی گئی۔ [1]

مولانا رفیع الدین ۱۸۸۸ء میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے دو سال تک وہاں حیات رہے۔ ۱۸۹۰ء میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ لکھتے ہیں کہ ــــــ

حضرت حاجی عابد حسین صاحب کے بعد حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی عہدہ اہتمام پر فائز ہوئے۔ آپ طریقت و حقیقت کے ایک بلند پایہ شیخ اور حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کے ارشد خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ صاحب ان پر فخر کیا کرتے تھے۔ دارالعلوم کی معنوی ترقیات میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کی تربیت اور صرف ہمت کا اسی طرح حصہ ہے۔ جس طرح مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا تھا۔ [2]

---

[1] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۲۲۶

[2] مولانا قاری محمد طیب قاسمی تاریخ دارالعلوم دیوبند، مطبوعہ کراچی ص ۹۴

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی دارالعلوم دیوبند کے بانیان اور اولین معماروں میں شامل ہیں۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی لکھتے ہیں کہ ــــــ

"آپ (یعنی مولانا رشید احمد گنگوہی) دارالعلوم کے بانیوں میں سے ہیں اور سربراہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔" [۱]

مولانا محمد میاں صاحب لکھتے ہیں کہ ــــــ

"جب دارالعلوم کی تحریک شروع ہوئی تو آپ (حضرت گنگوہی) اس کے سربرآوردہ رکن تھے۔ حضرت حجۃ الاسلام (مولانا محمد قاسم) کے مشیر خاص تھے۔ ان کی وفات کے بعد دارالعلوم کے سرپرست مقرر کئے گئے۔" [۲]

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اپنے وقت کے جیّد عالم دین مولانا ہدایت احمد صاحب کے یہاں دوشنبہ ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ کو پیدا ہوئے۔

ابتداً گنگوہ کے ایک مدرسہ میں قرآن پاک پڑھا پھر اپنے ماموں کے پاس کرنال چلے گئے اور ان سے فارسی کی تعلیم حاصل کی بعد ازاں مولوی محمد بخش سے صرف و نحو، مفتی صدر الدین آزردہ سے معقولات کی کتابیں پڑھیں اور تکمیل علوم دینیہ کے لئے مولانا مملوک علی نانوتوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

---

[۱] حافظ قاری فیض الرحمٰن مشاہیر علماء دیوبند ص ۱۸۸

[۲] سید محمد میاں، علماء حق حصہ اوّل مطبوعہ مراد آباد آزاد ص ۸۴

تعلیم سے فارغ ہوکر شیخ المشائخ حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے شرف بیعت حاصل کیا اور پھر ــــــ

بڑی تیز رفتاری کے ساتھ سلوک کی منزلیں طے کرلیں۔ چنانچہ صرف چالیس۴۰ دن کی قلیل مدت میں خلافت سے سرفراز ہوگئے اور گنگوہ واپس آکر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے حجرے کو اپنی قیام گاہ بنایا۔ (یہ حجرہ بہت عرصہ سے غیر آباد تھا) اس دوران مطب ذریعہ معاش رہا۔ [۱]

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ درس و تدریس کا فریضہ بھی انجام دیا۔ کئی مرتبہ زیارت بیت اللہ کے لئے بھی تشریف لے گئے۔ معرکۂ شاملی میں شریک ہوکر چھ۶ ماہ قید کی سزا بھی کاٹی یعنی ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں مولانا محمد قاسم صاحب کے دوش بدوش قائدانہ حصہ لیا۔

پروفیسر عبدالقیوم صاحب لکھتے ہیں کہ ــــــ

"مولانا رشید احمد گنگوہی جو مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا مملوک علی نانوتوی اور شاہ عبدالغنی دہلوی کے تلامذہ اور دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور سرپرستوں میں سے تھے۔ ایک عالم باعمل اور صوفی بزرگ تھے"۔ [۲]

مولانا رشید احمد گنگوہی یوں تو ہر میدان کے مجاہد اور شہ سوار تھے مگر ان کا اصل کام درس و تدریس ہی تھا۔ حکومت وقت کی قید سے رہا ہوکر گنگوہ میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ درس حدیث پر آپ کی خاص توجہ تھی۔ معمول یہ تھا کہ صبح سے ۱۲ بجے تک طلباء کو پڑھاتے تھے۔ آپ کے درس کی شہرت سن کے طالبان حدیث دُور دُور سے آکے شرکت کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی تعداد ستر اسی ۷۰-۸۰ تک پہنچ جاتی تھی۔ ان میں ہند اور بیرونِ ہند

---

[۱] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۲۷

[۲] پروفیسر عبدالقیوم تاریخ دارالعلوم دیوبند " ص ۱۸۱

سب ہی جگہ کے طلبا رشامل ہوتے تھے ۔ درس کی تقریر ایسی ہوتی تھی کہ ایک عامی بھی سمجھ لیتا تھا ۔ اس کے علاوہ آپ کے درس کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ حدیث کا مضمون سن کر اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا ۔ تین سو ۳۰۰ سے زائد حضرات نے آپ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی ہے ۔ آپ ایک سال کے اندر اندر پوری صحاح ستہ کو ختم کر دیتے تھے ۔ [1]

مولانا رشید احمد گنگوہی چند روز بیمار رہ کر ۸ رجمادی الاخر ۱۳۲۳ھ بروز جمعہ ۷۸ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے ۔ دارالعلوم کے لیے یہ ایک بڑا حادثہ تھا ۔ دارالعلوم کی روداد میں اس حادثہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ۔

حضرت مرحوم نے اپنے وجود با وجود کی بدولت مدرسہ دیوبند کو اس اعلیٰ ترقی پر پہنچایا تھا جس کی نظیر آج بمشکل کسی دوسری جگہ مل سکے گی ۔ آج صرف حضرت مرحوم ہی کی وفات نہیں ہوئی بلکہ آج گویا تمام حضرات اکابر مدرسہ دیوبند مثل حضرت مولانا محمد قاسم وغیرہ کی وفات ہوئی ہے ۔ جن کی وفات کو حضرت مولانا کی نعمت وجود سے مسلمان فراموش کئے ہوئے تھے ۔ اس لئے جس قدر فکر اہل اسلام کو مدرسہ دیوبند کی طرف سے پیدا ہو وہ تھوڑی ہے ۔ [2]

---

[1] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند ۔ حصہ اول ص ۱۲۸ ، ۱۲۹

[2] روداد ۱۳۲۳ھ ص ، آخر

دارالعلوم دیوبند کا قیام

ہندوستانی مسلمانوں کی بہ تدریج اپنے دین سے بڑھتی ہوئی بے تعلقی کم کوشی اور بے عملی اور آپس میں انتشار و افتراق، جس کا لازمی نتیجہ ۱۸۵۷ء میں اس صورت میں سامنے آیا کہ آٹھ سو سالہ حکومت کا خاتمہ ہوا۔ ذلت و رسوائی مقدر بنی اور اللہ کی زمین اللہ کے بندوں پر تنگ ہو کر رہ گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اب کہیں سر چھپانے کے لئے جگہ نہیں تھی۔ موت کا بازار گرم تھا۔ سیکڑوں پھانسی پر چڑھائے گئے۔ ہزاروں تہ تیغ کئے گئے۔ جو بچ گئے، گرفتار کر کے وطن سے دور جزیروں میں قید کر دئے گئے۔

اس دور ابتلا میں مسلمانوں کا جان و مال، عزت و آبرو اور اقتدار کا خاتمہ تو ہوا ہی، لیکن ساتھ ساتھ ہندوستان سے دین اسلام کو بھی رخصت کرنے کے حالات نئی حکومت نے پیدا کرنے شروع کر دئے۔ گویا کہ ایک طرح سے ہندوستان کو بھی اسپین بنانے کی کوششیں کی جانے لگیں۔

مسٹر ہنٹر نے لکھا ہے کہ ــــــ

ہم نے ان کے طریقۂ تعلیم کو بھی اس سرمایہ سے محروم کر دیا۔ جس پر اس کی بقا کا دارومدار تھا۔ اس لئے مسلمانوں کا تعلیمی نظام اور ان کے تعلیمی ادارے یک قلم مٹ گئے۔ [1]

---

[1] مولانا محمد اسلام قاسمی۔ دارالعلوم دیوبند کی ایک صدی کا علمی سفرنامہ ص ۹

مولف تاریخ دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں کہ ——

جنگ آزادی کی جدوجہد کے جرم میں انگریزوں نے مسلمانوں پر جہاں بے پناہ مظالم توڑتے تھے وہیں اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کو بھی تباہ وبرباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اوقاف ضبط کر لئے گئے تھے۔ جن کی وجہ سے قدیم مدارس تریب قریب ختم ہو گئے تھے۔ [1]

اس پر مزید یہ کہ عیسائی مبلغین کی ایک کثیر تعداد پورے ملک میں پھیلادی گئی جنھوں نے حکومت وقت کی سرپرستی میں عیسائیت کی بھرپور طریقہ پر تبلیغ واشاعت کا کام کیا اور اس کے ساتھ اسلام اور پیغمبر اسلام کو اپنی جارحانہ تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

حالات وواقعات کا یہ ایک ایسا زبردست چیلنج تھا جس کو غیرت مند اور باہمت مسلمانوں کے لئے قبول کرنا لازمی تھا چنانچہ مسلمان علماء کی جانب سے اس چیلنج کو قبول کیا گیا۔

اس وقت کے اہل اللہ اور خصوصیت سے ان بزرگوں میں جو اس خونی انقلاب سے خود بھی گزر چکے تھے اور مسلمانوں کی لاشوں کو خاک وخون میں تڑپتا ہوا دیکھ چکے تھے۔ یہ فکر واضطراب لاحق ہوا کہ علم ومعرفت کے اس کارواں کو کہاں ٹھکانا دیا جائے؟ ہندوستان میں بے سہارا مسلمانوں کے دین وایمان کو سنبھالنے کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے؟ اسے بخت واتفاق کہیئے یا تقدیر الٰہی کہ اس وقت اس راہ عمل کے لئے مذاکروں کا مرکزی مقام دیوبند کی چھتہ مسجد بن گئی۔ [2]

---

[1] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۵۰

[2] ایضاً ص ۱۴۸

اس مسجد میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، حاجی عابد حسین صاحب، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا رفیع الدین صاحب جو اکثر جمع ہوتے تھے اس سلسلہ میں باہمی طور پر غور و فکر کیا اور ان حضرات کے درمیان طے پایا کہ —

"مسلمانوں میں دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کی ملّی شیرازہ بندی کے لئے ایک دینی و علمی درس گاہ کا قیام ناگزیر ہے اس مرکزی فکر کی روشنی میں حضرت نانوتوی اور ان کے رفقاء خاص حضرت مولانا ذوالفقار علی، حضرت مولانا فضل الرحمٰن اور حضرت حاجی محمد عابد (عابد حسین) رحم اللہ نے طے کیا کہ اب دہلی کے بجائے دیوبند میں یہ دینی درس گاہ قائم ہونا چاہیئے۔" [1]

اس دینی درس گاہ کے پورے منصوبے کو ایک عوامی تحریک کے طور پر روبہ عمل لانا تھا اور اسے حکومت کی امداد اور جاگیرداروں کی اعانت سے محفوظ رکھنا تھا اس لیۓ درس گاہ کے قیام اور اسے چلانے کے لئے عوامی چندے کی تحریک شروع کی گئی اور ابتدائی مرحلے میں پہلے ہی دن تین سو روپے جمع ہو گئے اور آئندہ کے لئے بہت سی توقعات پیدا ہو گئیں۔

اس طرح مالی مسئلہ حل ہو جانے کے بعد اب صرف درس گاہ کے قیام کی بات رہ گئی تھی۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے وہ خوش کن اور مبارک دن بھی آیا کہ جب دیوبند کی بستی میں ان کی دینی و علمی اور ملّی و تہذیبی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔

۱۵ر محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء بروز پنجشنبہ چھتّے کی قدیم مسجد کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں نہایت سادگی کے ساتھ کسی رسمی تقریب یا نمائش کے بغیر دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس

---

[1] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصّہ اول ص ۱۴۹

وقت رب السموات والارض کے التفات اور چشم کرم پر بھروسہ کرنے کے سوا اور کوئی ظاہری ساز و سامان نہ تھا۔ اخلاص و خدمت دین اور توکل علی اللہ کے جذبات کے سوا ہر سرمائے سے ان حضرات کا دامن خالی تھا۔ صرف ایک طالب علم اور ایک استاد۔ یہ تھی کل کائنات اس ادارہ کی جو آج کل "ازہر ہند دارالعلوم دیوبند" کے نام سے پوری دنیا میں مشہور و معروف ہے۔ [1]

اس کے پہلے طالب علم تھے محمود الحسن صاحب جو بعد میں شیخ الہند کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اور پہلے استاد تھے مولانا محمد محمود صاحب۔ [2]

دارالعلوم کے لئے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے جو اس تعلیمی تحریک کے قافلہ سالار اور روح رواں تھے، دستور العمل تجویز کیا جو اساسی اصول ہشتگانہ کے نام سے معروف تھے۔

یہ اساسی اصول ہشتگانہ حسب ذیل ہیں:

۱. اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲۔ ابقائے طعام طلباء بلکہ افزائش طلباء میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۳۔ مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس طرح کی نوعیت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا، القصہ تہ دل سے

---

[1] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۵۵

[2] ڈاکٹر اقبال حسن خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسن ص ۱۱۹

بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے سخن پروری نہ ہو۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ اصل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو، بہ دل وجان قبول کریں گے اور نیز اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کریں۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز اس وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

۴۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق مشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خودبین اور دوسروں کے لئے درپئے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

۵۔ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورے سے تجویز ہو تو پوری ہو جایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

۶۔ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا۔ اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہمی نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

۷۔ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸۔ تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔ ؎

اسی طرح انتظامی اصول ہشتگانہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب نے وضع کئے اور ان کی بنیاد پر دارالعلوم دیوبند کو حسن انتظام کا اعلیٰ نمونہ بنایا۔

دارالعلوم کے بہتر نظم ونسق کے لئے ایک انتظامی ڈھانچہ ترتیب دیا گیا۔ اس انتظامی ڈھانچہ میں اعلیٰ انتظامی عہدے چار رکھے تھے۔

۱۔ سرپرستی

۲۔ اہتمام

۳۔ صدارت تدریس

۴۔ افتاء

ان چاروں عہدوں کے لئے ہمیشہ ایسی ممتاز شخصیتوں کا انتخاب عمل میں آیا ہے جو اہل اللہ، اہل دین، اہل تقویٰ اور جامع شریعت و طریقت ہوا کرتے تھے۔

چنانچہ دارالعلوم کے اوّل سرپرست بانی دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ اوّل مہتمم حاجی عابد حسین دیوبندی تھے، اوّل صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتوی تھے، اور اوّل مفتی بھی یہی آخر الذکر بزرگ تھے۔

ان انفرادی عہدوں کے علاوہ دارالعلوم میں تین ذمہ دار مجالس بھی بنائی گئیں۔

؎ حضرت مولانا محمد طیب صاحب، دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی ص ۱۷، ۱۸

۱۔ مجلس شوریٰ :

یہ دارالعلوم کی سب سے بڑی با اختیار مجلس قرار دی گئی اور دارالعلوم کا سارا نظم ونسق اس کے سپرد کیا گیا۔

۲۔ مجلس عامہ :

یہ مجلس شوریٰ کے ماتحت ایک مستقل مجلس رکھی گئی۔ اس کا کام مجلس شوریٰ کے فیصلوں اور منظور کردہ تجاویز کے عمل درآمد پر نظر رکھنا اور اس کی نگرانی کرنا تھا۔

۳۔ مجلس علمیہ :-

اس مجلس کا کام اور ذمہ داری تمام درجات کے تعلیمی کاموں میں صدر مدرس کو مشورہ دینا تھا۔

بہرحال یہ دینی درس گاہ جو آج دنیا کے ہر گوشے اور خطے میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور و معروف ہے اس کا قیام مسجد میں کھڑے ہوئے ایک انار کے درخت کے سائے میں ایک شاگرد اور ایک استاد کی صورت میں عمل میں آیا تھا لیکن پھر جلد ہی یہ ننھا سا پودا تیز رفتاری کے ساتھ ایک تناور درخت کی حیثیت اختیار کرتا گیا اور پہلے ہی سالانہ امتحان کے وقت طلبار کی تعداد ۷۸ ہوگئی۔ ان میں ۳۰ طلبار نے سالانہ امتحان میں شرکت کی اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے معیار پر پورے اترے۔

دارالعلوم کی روداد میں مولانا محترم اور دوسرے حضرات کے یہ تاثرات درج ہیں۔

> "ہم نے کئی روز تک امتحان مفصل ہر دفعہ کا لیا اور حتی الوسع سوالات مشکل پوچھے اور نمبر ہر طالب علم کے ہر ایک کتاب کے بابت لگائے جال مدرسہ بالعموم قابل تعریف پایا۔ مدرسان کی سعی اور طلبار کی محنت اس امتحان سے بخوبی ثابت ہے۔" [۱]

---

[۱] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۶۱

دارالعلوم کا نصابِ تعلیم

کسی بھی تعلیمی ادارے کے سمت سفر کے تعین اور نصب العین کا انحصار اس ادارے کے نصاب تعلیم پر ہوا کرتا ہے اور نصاب تعلیم کی حیثیت یقینی طور پر ایک مستحکم بنیاد اور اساس کی ہوا کرتی ہے۔

اب جبکہ پورے ملک میں نئے حالات اور نئے واقعات کا دور دورہ تھا۔ اسلامی تعلیم اور تہذیب کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تیزی کے ساتھ ختم کیا جارہا تھا تو لازمی طور پر دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم اس طرح کا ہونا چاہیئے تھا کہ جس سے فراغت پاکر مسلمانوں میں کفر والحاد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے سینہ سپر ہونے اور بالآخر بند باندھنے کی صلاحیت اور ہمت پیدا ہو۔

یہی زندہ اور دور اندیشانہ احساس بانیان دارالعلوم کے ذہنوں میں بھی موجود تھا۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب لکھتے ہیں کہ ـــــ

"دارالعلوم کے اصل موضوع اور مقصد کے سلسلہ میں سب سے زیادہ بنیادی اور اساسی چیز دارالعلوم کا نصاب تعلیم ہے جس سے یہاں کے علماء کا دینی رخ متعین ہوتا ہے۔ (اس نصاب میں)

کچھ تو علوم عالیہ ہیں جو مقاصد کا درجہ رکھتے ہیں اور کچھ علم آلیہ ہیں جو علوم عالیہ کے لئے ممد و معاون یا وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ [۱]

اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے:

علوم عالیہ:-

قرآن عظیم، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم عقائد و کلام، علم الاحسان (تصوف) اور علم الفرائض المواریث۔

علوم آلیہ:-

صرف، نحو، معانی، بیان، ادب عربی، منطق، فلسفہ، عروض و قوافی مناظرہ، ہیئت ہندسہ، حساب، طب، تجوید و قرأت [۲]

دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں بعد کو بقدر ضرورت جدید علوم کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ مثلاً جغرافیہ، تاریخ، مبادی سائنس اور معلومات عامہ وغیرہ لیکن زیادہ تر توجہ اور محنت دینی علوم پر ہی کی گئی جو دارالعلوم کے قیام کا اصل اور بنیادی مقصد تھا۔

دارالعلوم میں ابتداءً نصاب کی تکمیل کے لئے درجہ بندی بھی نہیں کی گئی بلکہ عربی درجات کے سارے نصاب کو گیارہ ۱۱ سالوں میں تقسیم کر دیا۔ لیکن بعد میں درجہ بندی کر دی گئی۔

"نصاب تعلیم میں درجہ بندی کو لازمی قرار دیا گیا۔ اس سے قبل جماعت بندی کے بجائے کتاب وار طریق تعلیم جاری تھا" [۳]

---

[۱] مولانا محمد طیب صاحب، دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی ص ۳۵

[۲] " " " " " " ص ۳۵

[۳] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۴۰۰

۱۳۵۰ھ میں دارالعلوم کے نصاب میں ... تبدیلی کی گئی اور تبدیلی کے تحت نصاب تعلیم میں کچھ کتابوں کا اضافہ کیا گیا۔ درجات کی تکمیل کے سلسلہ میں تکمیل تفسیر اور تکمیل دینیات، تکمیل معقولات اور تکمیل ادب کا اضافہ کیا گیا۔
موجودہ نصاب تعلیم چار مرحلوں پر مشتمل ہے، ابتدائی، متوسط، اعلیٰ اور تکمیل غرض دارالعلوم دیوبند میں مروج نصاب تعلیم کے ذریعہ ایک طرف دین و علم کی اس روشنی کو زندہ رکھنا تھا جو تیرھویں صدی کے نصف آخر میں پہلے دہلی اور خیرآباد میں اور بعد میں لکھنؤ میں ختم کر دی گئی تھی اور دوسری جانب علماء اسلام کو نئے حالات میں ایک موثر قوت بنا کر زمانے کے سامنے لانا تھا۔
مؤلف تاریخ دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں کہ ـــــ

"دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ اس ذریعہ سے طالب علم کی روحانی اور اخلاقی قدروں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم وفنون میں بھی پورے طور پر دسترس اور مہارت حاصل کر سکے تاکہ یہاں سے نکلنے کے بعد ملت کی مخلصانہ قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل ہو جائے اور اسلامی دعوت و تبلیغ کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کر سکے ـــــ خدا کا شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند اپنے اس تعلیمی مقصد میں کامیاب ہے۔ اس درس گاہ سے ہزاروں کی تعداد میں ایسے علماء، مبلغین، مصنفین اور قائدین نکلے ہیں جنھوں نے دارالعلوم کے اس مقصد سے کبھی گریز نہیں کیا ہے۔"[1]

---

[1] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد دوم ص ۲۹۰

تحریک دیوبند کے مقاصد

دنیا کی کوئی بھی اور کسی بھی نظریہ کی حامل تحریک ہو، اس کے کچھ نہ کچھ اغراض و مقاصد لازمی ہوتے ہیں اور وہ تحریک اپنے ان مقاصد کے اصول کے لئے سرگرم عمل رہتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔

دیوبند تحریک جو بظاہر کچھ وقتی حالات و واقعات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں یہ تحریک اس دینی اور علمی سفر کا ایک ابھرا ہوا اور نمایاں ترین مرحلہ ہے۔ جس سفر کا آغاز بارہویں[۱۲] صدی ہجری کے نصف میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے کیا تھا اور جس کو ان کے اہل خاندان نے جاری رکھا اور جیسے تیرھویں[۱۳] صدی ہجری کے نصف آخر میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء کار نے اختیار کیا۔

سید محبوب رضوی صاحب لکھتے ہیں کہ ــــــ

"حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے بعد آپ کے صاحبزادوں اور حضرت سید احمد شہیدؒ حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اسلامی روح کی حفاظت کی اور تحریک کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش فرمائی"[۱]

---

[۱] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۴۱

تحریک دیوبند کے اولین بانی و معمار مولانا محمد قاسم نانوتوی کی فکر و نظر کے بارے میں مولانا طیب صاحب قاسمی لکھتے ہیں کہ ــــــ

"ہم اس شخص کو حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں جو شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ محمد اسحٰق، اور شاہ عبدالغنی کے علم کا نچوڑ اور ان کے دینی تفقہ کا خلاصہ تھا، اور اس نے وہی امانت جو ولی اللہ کے دور سے لی تھی، اس دور کے مناسب حال حکیمانہ انداز سے دنیا کے سامنے رکھ دی۔[1]

ایک ایسی دینی تحریک جو ایک صدی سے زیادہ اور کئی نسلوں کی فکر کا نتیجہ ہو، لازماً اس کے مقاصد بھی ارفع و اعلیٰ ہونے چاہئیں۔

چنانچہ دیوبند تحریک اور اس کی عملی صورت دارالعلوم دیوبند جن مقاصد کے حصول کے لئے وجود میں لائے گئے وہ دستور اساسی کے تحت حسب ذیل ہیں:

۱۔ قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد و کلام اور ان علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم دینا ــــ اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا، رشد و ہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا۔

۲۔ اعمال و اخلاق اسلامیہ کی تربیت اور طلبار کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

۳۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دین کا تحفظ و دفاع اور اشاعت اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر و تقریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم و تبلیغ کے ذریعے سے خیر القرون اور سلف صالحین جیسے اخلاق و اعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

---

[1] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ حصہ اول ص ۲۱

۴۔ حکومت کے اثرات سے اجتناب واحتراز اور علم وفکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

۵۔ علوم دینیہ کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق کرنا۔ [1]

تحریک دارالعلوم دیوبند نے ان مقاصد کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا اور حصول مقاصد کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ رب العالمین نے دارالعلوم اور اس کی دینی خدمات کو ملک اور بیرون ملک بہت زیادہ مقبولیت عطا فرمائی۔

[1] سید محبوب رضوی۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند، حصہ اوّل، ص ۱۴۲
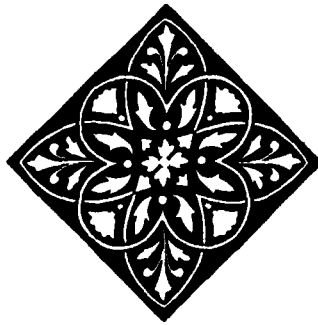
دارالعلوم دیوبند کے مختلف شعبہ جات

یوں تو دارالعلوم دیوبند کا قیام ہندوستان کی آزادی سے بہت پہلے عمل میں آچکا تھا اور اس نے اپنے ابتدائی ایام میں کافی وسعت اور ترقی بھی کی تھی۔ پھر بھی ہندوستان کی آزادی کے بعد دارالعلوم دیوبند کے مختلف شعبہ جات میں مزید ترقی اور وسعت پیدا ہوئی ہے۔ دارالعلوم کے مختلف شعبہ جات حسب ذیل ہیں:

۱۔ شعبہ تعلیم :-

اس شعبہ کا آغاز اگرچہ دارالعلوم کے قیام کے ساتھ ہی عمل میں آچکا تھا اور اس کی ابتداً ایک استاد اور ایک شاگرد سے ہوئی تھی لیکن اس کی ترقی میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور اب صورت حال یہ ہے کہ شعبۂ تعلیمات اپنی وسعت کے اعتبار سے کئی شعبوں میں منقسم ہے۔

۱۔ شعبہ عربی ۲۔ شعبہ فارسی ۳۔ تجوید قرآن ۴۔ شعبہ قرآن شریف ۵۔ شعبہ اردو دینیات ۶۔ شعبہ طب ۷۔ تعلیم افتاء ۸۔ شعبہ خوشنویسی ۹۔ شعبہ صنعت و حرفت[1]

ان تمام شعبہ جات میں اساتذہ کی ایک بڑی تعداد مامور ہے اور طلباء کی

---

[1] سید محبوب رضوی: تاریخ دارالعلوم دیوبند، حصہ دوم، ص ۳۱۶

تعداد ہر سال کم و بیش ڈیڑھ پونے دو ہزار کے لگ بھگ رہتی ہے۔

درسیات کے علاوہ طلبار میں تقریر و تحریر کا ملکہ، خطابت، طرزادا کی مشق اور مباحث علمی کی ترقی اسلامی تبلیغ اور پیغام حق و صداقت کی اشاعت جیسے اہم امور بھی شعبہ تعلیم کے تحت پورے کرائے جاتے ہیں۔

۲۔ دارالافتاء :-

دارالعلوم کے قیام کے وقت اسلامی مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کرنے والوں کی تعداد بہت خال خال رہ گئی تھی اگر عوام میں سے کسی کو کوئی مسئلہ معلوم کرنا ہوتا تو وہ ایک پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اسے کوئی رہنمائی کرنے والا نہیں ملتا۔ دارالعلوم نے اس پریشانی کے پیش نظر ۱۸۹۲ء میں دارالافتاء کے عنوان سے ایک شعبہ قائم کیا اور سب سے پہلے مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب کا نام اس اہم خدمت کے لئے عمل میں آیا۔ رفتہ رفتہ اس شعبہ میں بھی بہت ترقی ہوئی۔ یہاں تک کہ اس دہائی میں دارالافتاء سے جاری ہونے والے فتاوی کی تعداد ۴۳۹۳۳۶ ہو چکی تھی۔ ان فتاوی پر کوئی فیس نہیں لی جاتی ہے۔ دارالافتاء کی عمارت تین وسیع کمروں پر مشتمل ہے۔ اس عمارت کی تعمیر ۱۹۴۹ء میں ہوئی ہے۔ [۱]

۳۔ شعبہ طب :-

اس شعبہ سے متعلق دو کام ہیں، طلبار کو علم طب کی تعلیم دینا اور مریض طلبار کا علاج و معالجہ کرانا۔ اس کا چار سال کا نصاب ہے اور اب چھ لائق طبیب اس کی تعلیم پر معمور ہیں اور اس میں کافی اضافہ ہو چکا ہے۔

---

[۱] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، حصہ دوم، ص ۳۱۸

۴۔ شعبہ تبلیغ :-

ہندوستان میں شدھی تحریک کے مضر اثرات اور مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کے لئے دارالعلوم نے ۱۹۲۴ء میں تبلیغ کا شعبہ قائم کیا اور اس زمانہ میں اس شعبہ کے تحت مسلمانوں کی ارتداد سے بچانے کی انتہائی اہم کوشش کی۔ ہندو تحریکوں نے آزادی کے بعد جیسے جیسے اپنے کام اور دائرہ کار میں وسعت پیدا کی' دارالعلوم کے شعبہ تبلیغ کے کام میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ آج ہندوستان' پاکستان اور بنگلہ دیش کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں دارالعلوم کے مبلغین نے تبلیغ کی خدمات انجام نہ دی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک تحفظ دین' تردید اور مخالفین اور اصلاح مسلمین کا تعلق ہے آزاد ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کے مدرسین اور مبلغین نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

۵۔ شعبہ کتابت :-

اس شعبہ کے تحت دارالعلوم میں فن خوش نویسی کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے خط کی درستگی کی قدیم تعلیمی نظام میں بہت اہمیت تھی اس لئے اس کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ اس فن نے بھی دارالعلوم میں کافی ترقی کی اور اس کی ضرورت کی اہمیت کے پیش نظر طلبار کو مشق خط کا سالانہ امتحان بھی دینا ہوتا ہے۔

۶۔ شعبہ صنعت و حرفت :-

جدید و قدیم درس گاہوں کے طلبار کی معاشی و اقتصادی حالت کا لحاظ کرنا اس دور میں بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند نے حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے یہاں ہلکی پھلکی صنعتی تعلیم کا بھی انتظام کیا ہے جیسے کتابت اور جلد سازی وغیرہ۔ یوں تو جلد سازی کے کام سے صنعت و

حرفت کی تعلیم کا آغاز ۱۹۴۶ء میں کر دیا گیا تھا لیکن اس صنعت کے تحت کام میں وسعت کے ساتھ ساتھ مختلف کاموں میں اضافہ آزادی کے بعد بہت زیادہ ہوا۔ اب اس شعبہ میں جلد سازی کے ساتھ ساتھ خیاطی، ہولڈال اور سوٹ کیس وغیرہ بنانے کے ہلکے پھلکے کام بھی سکھائے جاتے ہیں۔

۷۔ شعبہ نشریات :۔

اس شعبہ کے تحت دارالعلوم کا ماہنامہ اردو ترجمان "دارالعلوم" اور پندرہ روزہ اخبار "الداعی" عربی میں شائع ہوتا ہے۔ یہ دونوں ہی رسالہ اور اخبار ملک و بیرونِ ملک اپنے علمی و دینی مضامین کے سبب بہت مقبول ہیں۔ ان میں اہل قلم علماء کے مضامین اور مقالات شائع ہوتے ہیں اور یہ دونوں دارالعلوم کی جانب سے شائع ہونے والی کتابوں کی اشاعت کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی ہیں اور جس طرح ان کی افادیت اور اہمیت اپنے قیام کے وقت تھی، اب اس میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

۸۔ شعبہ تنظیم و ترقی :۔

یہ شعبہ یوں تو ۱۹۴۶ء میں قائم ہوا ہے لیکن عطیات کی وصولی میں آئے دن اضافہ کے سبب اس میں اس قدر وسعت پیدا ہو چکی ہے کہ ملک کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے دارالعلوم اپنے سفرار روانہ کرتا ہے اور صاحبِ خیر حضرات دل کھول کر مالی و اخلاقی امداد کرتے ہیں۔ یہ شعبہ غلّہ کی فراہمی کا کام بھی انجام دیتا ہے۔

۹۔ شعبہ اوقاف :۔

دارالعلوم دیوبند کے لئے اہل خیر حضرات نے ابتدا ہی سے اپنی چھوٹی چھوٹی

جائیدادیں وقف کرنا شروع کردیں تھیں اور جیسے جیسے دارالعلوم میں ترقی و وسعت پیدا ہوتی گئی۔ اہل خیر حضرات نے بھی اپنی توجہ میں اضافہ کیا اور آج ہندوستان کے مختلف مقامات پر دارالعلوم کے بہت سے اوقاف موجود ہیں۔ جن سے دارالعلوم اپنے بہت سے مصارف پورے کرتا ہے۔

۱۰۔ کتب خانہ :۔

دارالعلوم کے اکابرین کے ذہن میں تعلیم کا جو بلند معیار تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ طلباء میں مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تعلیم کا ذوق پیدا کیا جائے اور اس ذوق کو پروان چڑھانے کے لئے ضروری تھا کہ دارالعلوم میں ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ موجود ہو۔

چنانچہ دارالعلوم کے اکابرین نے دارالعلوم کے قیام کے ساتھ ساتھ معیاری کتابوں کی فراہمی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اہل علم حضرات نے بھی اس سلسلہ میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور الحمدللہ یہ سلسلہ اب تک اسی طرح جاری و ساری ہے۔ دارالعلوم کے کتب خانہ میں اس وقت کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اس ذخیرہ میں ایک عظیم تعداد ان کتابوں کی بھی ہے جو ترکی کے سلطان رشاد خاں، نظام دکن، سلطان ابن سعود، جمال عبدالناصر اور حکومت افغانستان نے کتب خانہ کو عطا کی ہیں۔

اسی وقت اس کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے کہیں زیادہ ہے اس ذخیرہ سے ہند اور بیرون ہند کے اہل علم اور مصنفین حضرات فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔

کتب خانہ دارالعلوم دو شعبوں پر مشتمل ہے ایک شعبہ درسی کتابوں کا ہے اور دوسرے میں غیر درسی کتابیں رکھی گئی ہیں اور کتب خانہ میں سب سے زیادہ عربی زبان کی کتابیں ہیں۔ اس کے بعد اردو زبان اور پھر فارسی کی کتابیں ہیں۔

ان کتابوں کی ترتیب میں زبان کے ساتھ ساتھ فن کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتابیں ترتیب و تقسیم کے لحاظ سے ۹۹ عنوانات پر تقسیم ہیں۔ [1]

کتب خانہ دارالعلوم سے گذشتہ سالوں میں ہندوستان کے علاوہ انگلستان، جرمنی امریکہ اور جاپان کے متعدد ریسرچ اسکالر اپنی تحقیقی کام میں استفادہ کرتے رہے ہیں۔ کتب خانہ کی موجودہ عمارت کا آغاز ۱۹۰۳ء میں ہوا اور اس وقت صرف ایک ہال اور ایک کمرہ تھا لیکن اب یہ عمارت کافی بڑے رقبہ پر پھیلی ہوئی ہے۔

۱۱۔ شعبہ تعمیرات:۔

جیسا کہ ہمارے علم میں ہے دارالعلوم دیوبند کا آغاز چھتہ والی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے ہوا تھا لیکن اہل خیر حضرات نے اس طرف توجہ فرمائی اور بقدر ضرورت عمارتیں تعمیر ہونے لگیں۔ عام طور پر ہر سال کوئی نہ کوئی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اللہ کے مخلص بندے اس کی تیاری میں معاونت کرتے ہیں اور اس وقت دارالعلوم کی مختلف عمارات ایک بڑے رقبہ پر پھیلی ہوئی ہیں اور ایک اندازے کے مطابق ان عمارات پر اب تک لاکھوں روپیہ صرف ہو چکا ہے اور صرف دارالاقامہ کی عمارت آٹھ وسیع احاطوں اور دو سو دس ۲۱۰ کمروں پر مشتمل ہے جن میں تقریباً ایک ہزار سے زیادہ طلبار کا قیام رہتا ہے۔

۱۲۔ دارالعلوم دیوبند کی عمارات:۔

ہندوستان کی آزادی کے وقت دارالعلوم دیوبند کے قیام کو اگرچہ آٹھ ۸ دہائیاں گزر چکی تھیں اور دارالعلوم نے مختلف پہلوؤں سے اس عرصہ میں کافی ترقی کی تھی پھر بھی آزادی کے بعد دارالعلوم کے سارے امور میں بہت زیادہ اضافہ و

---

[1] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ دوم ص ۳۲۹

ترقی ہوئی ہے۔ خاص طور پر دارالعلوم کی عمارتوں نے بہت وسعت اختیار کی ہے۔ اس وقت ان تمام عمارتوں کا مجموعی رقبہ ۹۲۰۰۰ مربع میٹر ہے۔ [1]

ہندوستان کی آزادی کے بعد دارالعلوم کی عمارات میں جو وسعت اور اضافہ ہوا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء میں دارالقرآن کے پانچ کمرے تعمیر کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مطبخ کی عمارات تعمیر ہوئی ہے جو کئی حصوں پر مشتمل ہے جیسے دفتر، اجناس کا گودام، لکڑی کا گودام پکانے کا ہال، کھانا تقسیم کرنے کا ہال وغیرہ وغیرہ۔

دارالعلوم دیوبند کے مشرقی دروازے سے داخل ہوں تو احاطۂ دارالعلوم سے باہر مسجد دارالعلوم کے بالمقابل شارع عام کی مشرقی جانب ایک پرشکوہ دو منزلہ عمارت نظر آتی ہے۔ یہ دارالعلوم کا مہمان خانہ ہے۔ جو ۱۹۵۸ء میں تعمیر ہوا ہے۔ اس عمارت کی نیچے کی منزل میں مدرسین کے لئے رہائش گاہیں ہیں اور اوپر کے حصہ میں مہمان خانہ کی وسیع عمارت ہے جو متعدد کمروں اور کئی دالانوں پر مشتمل ہے۔ ایک اور عمارت جو افریقی منزل کے نام سے موسوم ہے اسی کی دہائی میں تعمیر ہوئی ہے اور اس کا شمارہ دارالعلوم کی اچھی عمارتوں میں ہوتا ہے۔ [2]

۱۹۷۸ء میں کتب خانہ کے لئے تیسرا ہال تعمیر ہوا ہے جس کی بہت ضرورت تھی۔ اس جدید تعمیر شدہ عمارت کا اوپر کا حصہ کتب خانہ سے متعلق ہے اور نیچے کی منزل میں دفتر تنظیم و ترقی ہے یہ شعبہ دارالعلوم کے لئے مالیات فراہم کرتا ہے ـــــــ اور اس عمارت کے صحن میں ایک پرفضا نشست گاہ بھی موجود ہے۔

---

[1] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ دوم ۳۳۵

[2] " " " " " " "

بہرحال مندرجہ بالا جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگرچہ دارالعلوم کا قیام ہندوستان کی آزادی سے پہلے عمل میں آیا تھا لیکن دارالعلوم کے مختلف شعبہ جات میں خاطر خواہ ترقی ۱۹۴۷ء کے بعد ہی ہوئی ہے، اور اس کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔
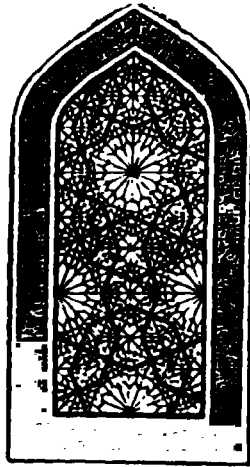
دارالعلوم کا منصب و مقام

دارالعلوم کا منصب و مقام جاننے کے لئے کسی زیادہ تگ و دو اور تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں ہے۔

دارالعلوم کی ابتدا کا یہ انداز ہے کہ بالکل بے سروسامانی کے عالم میں صرف ایک شاگرد نے ایک استاد کے سامنے کتاب کھول کر درس گاہ کا آغاز کیا تھا۔ اور آج اس کی حیثیت یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند ایشیا کے مسلمانوں کی ایک عظیم مرکزی اور دینی درس گاہ ہے جو ایک سو پچیس ۱۲۵ سال سے زیادہ کی مدت سے تفسیر و حدیث، فقہ و کلام اور تہذیب و اخلاق وغیرہ علوم دینیہ کے احیاء اور ترقی کی زبردست خدمت انجام دے رہی ہے۔ [1]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے ——

دارالعلوم دیوبند ایک سو پچیس ۱۲۵ سال سے زیادہ گزر جانے کے باوجود اب تک قائم ہے جبکہ بعض زمانوں میں اس پر کئی جان لیوا ابتلا کے دور بھی گزرے ہیں۔ لیکن اس دینی درس گاہ نے ہر آزمائش سے گزر کر نہ صرف اپنے آپ کو باقی رکھا ہے بلکہ آج ملک میں اس سے وابستہ ذیلی درس گاہوں کی تعداد

---

[1] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۳۳۹

سیکڑوں تک پہنچ چکی ہے۔

ملک اور بیرون ملک کے طلبا جنھوں نے دارالعلوم سے استفادہ کیا ہے ایک سو سال کی مدت میں ان کی تعداد ستر ہزار سے اوپر ہے اور فضلار کی مجموعی تعداد ساڑھے گیارہ ہزار سے زیادہ ہے۔

آغاز دارالعلوم ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک صرف گزشتہ سو سال میں مختلف فنون سے تعلق رکھنے والے فضلا حضرات کی تعداد حسب ذیل ہے:

مدرسین ۵۸۸۸ خطیب و مبلغ ۴۲۸۸ مفتی ۱۷۸۴ مناظر ۱۵۴۰
مصنفین ۱۱۶۴ صحافی ۶۸۴ مشائخ طریقت ۵۳۶ طبیب ۲۸۸ [1]

بہرحال دارالعلوم کا فیض باران رحمت کی طرح عام رہا۔ علم کے پیاسے دور دور سے آئے اور اس نے ہر ایک کے ظرف اور ہر ایک کی طلب کے موافق اس کی پیاس بجھائی۔ ہندو پاک کا اب کوئی شہر کوئی قصبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہ ملے گا جہاں اس چشمہ علم دین سے نکلی ہوئی کوئی نہر موجود نہ ہو۔ جس سے سب سیراب ہوتے ہیں۔ [2]

دارالعلوم دیوبند کا ملک بیرون ملک خاص طور پر عرب ممالک کی بہت سی نمایاں شخصیتوں نے دورہ بھی کیا ہے ان میں علمی، دینی، سیاسی شخصیتیں بھی ہیں۔ حکومتوں کے سربراہ دینی اداروں اور ثقافتی انجمنوں کے ذمہ دار بھی ہیں۔

۱۳۹۵ھ کے اہم واقعات میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، وکیل الازہر شیخ عبدالرحمٰن بیطار، مفتی اعظم مصر محمد خاطر اور سابق شیخ الازہر محمد الفحام تشریف لائے۔ ان حضرات کے چند روز بعد علماء عرب کی ایک دوسری جماعت آئی۔ جس میں جناب یوسف السید ہاشم رفاعی وزیر حکومت کویت، استاد عبدالرحمٰن

---

[1] مولانا محمد طیب صاحب دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی ص ۸۶
[2] " " " " " " " " ص ۹۱

مدیر ماہنامہ "البلاغ" کویت اور قطر کے شیخ عبد المعز استاد کے ساتھ تاشقند کے نمائندہ شرف الدین محمد روف وغیرہ بھی شامل تھے۔ [1]

ان حضرات نے دار العلوم آنے پر اپنے اپنے تاثرات کا بھی اظہار کیا۔ چند تاثرات یہ ہیں ــــ

سابق شیخ الازہر شیخ الفحام نے کہا ــــ

میں ایک زمانہ سے دار العلوم دیوبند کی زیارت کا مشتاق تھا۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ میری موت اس وقت نہ آئے جب تک میں دار العلوم کی زیارت نہ کر لوں۔ الحمد للہ کہ میری یہ آرزو پوری ہوئی۔ میں نے اپنے آنکھوں سے یہاں جو کچھ دیکھا وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو میں نے سنا تھا۔ یہ ادارہ اسلام کے قلعوں میں سے ایک محفوظ قلعہ ہے۔ [2]

وزیر حکومت کویت جناب یوسف السید ہاشم الرفاعی کا دار العلوم کے بارے میں یہ احساس تھا کہ انھوں نے کہا ــــ

عالم اسلام کو اس وقت ایک زبردست چیلنج کا سامنا ہے ــــ اس فکری چیلنج کے لئے ہمیں علمار راسخین کی ضرورت ہے اور علمار راسخین پیدا کرنے کے لئے دار العلوم دیوبند جیسے ادارے کی ضرورت ہے۔ اسلام پر اعتراضات کے دفعیہ کے لئے ہم جلیل القدر علمار کے محتاج ہیں۔ ہمیں حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر کے معیار کے علمار کی ضرورت ہے اور ہمیں فخر ہے کہ الحمد للہ اس درجہ کے علمار اس دار العلوم میں موجود ہیں۔ [3]

شیخ عبد المعز الستار نے اظہار خیال کیا کہ ــــ

---

[1] سید محبوب رضوی تاریخ دار العلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۵ ۱۴

[2] " " " " " " ۱۵ ۴

[3] " " " " " " ۱۶ ۴

اللہ تعالےٰ ہمیں اس اسلامی قلعہ کی زیارت کی توفیق بخشی جسے ہم ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے نام سے یاد کرتے ہیں ـــــ ہم اپنے وطن میں برابر دارالعلوم کے بارے میں سنتے اور پڑھتے رہتے تھے اور جانتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں دین کی روشنی کا مینار ہے جو اپنی ضیا پاشیوں سے سارے عالم اسلام کو منور کر رہا ہے۔[1]

دارالعلوم دیوبند کے صحیح منصب و مقام کو جاننے کے لئے چند تاثرات مزید پیش خدمت ہیں۔ کناڈا کی میک گل یونیورسٹی کا ڈائریکٹر کینٹول اسمتھ اپنی کتاب "ماڈرن اسلام ان انڈیا" میں لکھتا ہے کہ ــــ

ازہر ثانی دارالعلوم دیوبند اسلامی دنیا میں اہم ترین اور معزز ترین مذہبی ادارہ ہے۔ قدرتی طور سے اس کا اثر و اعزاز ہندوستان میں بہت زیادہ ہے۔ خصوصًا اس وجہ سے کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشرتی ترقی میں اپنی قدیم روایات کے مطابق کافی دلچسپی لی ہے۔ اس کی قدیم روایات کا مبدا شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریک ہے ــــ اس کا نقطۂ نظر حقیقی اسلام کا احیا رہے (مکتبہ) دیوبند اسلام کی حدود کی نگہداشت میں بہت سخت ہے۔ لیکن ان حدود میں رہتے ہوئے وہ پکا عقلیت پسند ہے۔ وہ گمراہی، نفاق اور ذہنی کاہلی کو شکست دینے کے لئے برابر کوشاں ہے۔[2]

ہندوستان میں ارتداد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں دارالعلوم دیوبند نے جو نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس سلسلہ میں روزنامہ "سیاست" لاہور نے لکھا تھا کہ ــــ

دارالعلوم دیوبند کے مبلغین کو انسداد فتنۂ ارتداد میں جو نمایاں کامیابی حاصل

---

[1] سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند، حصہ اول ص ۴۱۶

[2] " " " " " " ص ۴۶۲

ہوئی ہے وہ اظہر من الشمس ہے، جہاں تحفظ دین، تردید مخالفین اور اصلاح المسلمین کا تعلق ہے۔ دارالعلوم کے مدرسین و مبلغین اور منتظمین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ مثال کے طور پر اگر ان غیر محدود کوششوں کو ملاحظہ کیا جائے جو آریہ سماج نے اسلام کے خلاف کیں تو آپ کو روز روشن کی طرح نظر آئے گا کہ ان مساعی کے مقابلہ میں سب سے زیادہ نمایاں طریقہ پر جو سینہ سپر ہوا وہ مدرسہ عالیہ عربی دیوبند ہی ہے۔ [1]

دارالعلوم دیوبند کو ملت اسلامیہ ہند کی ایک عظیم الشان تحریک کا نام دیتے ہوئے گورنمنٹ نیشنل کالج کے مجلہ "علم و آگہی" نے تحریر کیا ہے:

"دارالعلوم دیوبند علوم اسلامی کی ایک قدیم درس گاہ ہی نہیں بلکہ احیاء اسلام و قیام ملت کی ایک عظیم الشان تحریک کا نام ہے۔ دارالعلوم دیوبند انقلاب کا مرکز اور سیاسی تربیت گاہ بھی۔ اس نے اسلام کے جانثاروں اور ملت کے غم گساروں کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو ملت کے غم میں خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ جو اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کے وقار کی بحالی کے لئے خود بھی تڑپے اور دوسروں کو بھی تڑپایا۔ انھوں نے آبرومندانہ زندگی کے حصول کے لئے خود بھی اپنی جانیں قربان کیں اور دوسروں کو بھی جانثاری اور ایثار پیشگی کا سبق دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کے ذہنی جمود کو توڑا۔ برٹش استعمار کے سحر کو توڑا، اور جو انقلابی حریت پسند اٹھے وہ دیوبند کے سرچشمۂ فکر کا فیضان تھا۔ [2]

---

[1] اداریہ روزنامہ سیاست لاہور، شمارہ ۲۷/ جون ۱۹۲۳ء

[2] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اوّل ص ۵۱۴، ۵۱۵

ان سارے تاثرات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح ابھر کر سامنے آئی ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے اپنے قیام کے اوّل دن سے اسلام اور ملت اسلامیہ کی ہر پہلو سے جو زبردست خدمت کی ہے وہ یقیناً دارالعلوم دیوبند کو ایک ارفع واعلیٰ منصب اور مقام بلند کا حامل بناتی ہے۔

البتہ گزشتہ دہائی میں اور اس کے بعد ہندوستان کی سیکولر حکومت کی ایک سازش کے تحت دارالعلوم دیوبند میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس سب نے دارالعلوم دیوبند اور علماء دیوبند کے عظمت و وقار کو خاصا نقصان پہنچایا ہے لیکن پھر بھی اس کی سابقہ خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں جو واقعتاً دارالعلوم دیوبند کا عظیم الشان کارنامہ رہی ہیں اور جس کے احسان سے ملت اسلامیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

باب پنجم

دارالعلوم ندوۃ العلماء

تحریک ندوۃ العلماء

اس نشیب و فراز کی دنیا میں عالم اسلام کبھی کبھی ایسے نشیب سے گزرا ہے کہ اس بات کا قطعی امکان نظر آتا تھا کہ اب اسے دوبارہ فراز نصیب نہیں ہوگا۔ اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم ہر جگہ موت و زلیست کی کشمکش سے دوچار، نت نئے دینی فتنے اور گمراہ کن تحریکیں، گویا کہ اب صبح کے کوئی آثار نہیں ہیں۔

انیسویں صدی پورے عالم اسلام کے لئے سیاسی زوال اور فکری اضمحلال کی صدی کہی جاتی ہے۔ خاص طور سے ہندوستان اس سیاسی زوال اور فکری اضمحلال میں کچھ زیادہ ہی مبتلا تھا۔ اس ملک میں مسلمانوں کے صدیوں پرانے سیاسی اقتدار کا خاتمہ ہوچکا تھا اور مغرب سے آئی ہوئی ایک نئے حوصلہ مند قوم نے تسلط حاصل کرلیا تھا۔

غرض اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان انتہائی نامساعد حالات میں گرفتار تھے۔ انتشار و اضطراب، بیکسی و لاچاری، تردد اور تذبذب کا ایسا خوفناک اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ ہر شے اپنی اصل سے بدلی ہوئی نظر آتی تھی اور دور دور تک روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہ آتی تھی۔

لیکن قدرت الٰہی کی عجیب کرشمہ سازی ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی کئی بار ہوا ہے اس صدی میں ایسی متعدد شخصیتیں پیدا ہوئیں کہ جن کی فکری

سطح اور جن کے عزائم اس زمانے سے کچھ بھی میل نہیں کھاتے اور جو اپنے افکار و خیالات، اپنی خداداد صلاحیتیں اپنے جوہر و استعداد اور اپنی علمی و ذہنی کمالات کے لحاظ سے کس طرح اس دور انحطاط کی پیداوار نہیں معلوم ہوتے ہیں۔[1] اللہ تعالےٰ نے پیدا کئے اور ان عظیم اور عبقری شخصیتوں نے اپنے عزم و حوصلہ اور اپنی دینی اور علمی صلاحیتوں سے حالات کا رُخ یکسر بدل کر رکھ دیا۔

تحریک ندوۃ العلماء جو دراصل مسلمانوں کے باہمی اتحاد و یک جہتی اور نئے نصاب تعلیم کی تحریک ہے، چند حوصلہ مند اور جرأت مند شخصیتوں کی کوششوں کے نتیجے میں برپا ہوئی ہے اور جو بعد میں اپنے بہتر نتائج کے اعتبار سے اپنے زمانے کی ایک مثالی اسلامی تحریک بن کر ابھری ہے۔

---

[1] سید محمد الحسنی، سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری۔ بانی ندوۃ العلماء، مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو۔ ص ۱۸
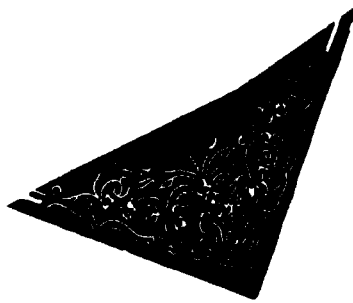
بانیانِ تحریک

تحریک ندوۃ العلماء کے بانیان اور اس کے بالکل ابتدائی معماروں میں چار نام خاص طور پر سرفہرست ہیں۔

۱۔ مولانا سید محمد علی مونگیری۔
۲۔ علامہ شبلی نعمانی۔
۳۔ مولانا حکیم سید عبدالحی۔
۴۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ

ان حضرات میں بھی تحریک ندوۃ العلماء کے بانی اور ابتدائی معمار کی حیثیت سے سب سے نمایاں اور اولین نام مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کا ہے جو اپنے دور کے ایک ہوش مند صاحب دل اور یگانہ شخصیت تھے۔

اس نازک بحرانی دور میں (۱۳۱۰ھ، ۱۸۹۲ء) وقت کے ایک روشن ضمیر، صاحب دل اور ذی ہوش عالم مولانا سید محمد علی مونگیری کی تحریک پر مدرسہ فیض عام

کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر انجمن ندوۃ العلماء کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ [۱]

مولانا سید محمد علی مونگیری خاندان اور نسب کے اعتبار سے حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی پچیسویں پشت میں تھے۔ [۲]

آپ ۲۸ جولائی ۱۸۴۶ء کو سید عبدالعلی صاحب کے یہاں کانپور میں پیدا ہوئے ابھی آپ کی عمر دو سال کی تھی کہ والد محترم کا انتقال ہوگیا۔ لہٰذا ابتدائی زمانہ اپنے دادا بزرگوار سید غوث علی کے زیر تربیت گزارہ۔ قرآن پاک اپنے چچا سید ظہور علی سے پڑھا اور فارسی کی ابتدائی تعلیم مولانا عبدالواحد بلگرامی سے حاصل کی۔

درسیات کی تکمیل استاد الاساتذہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور مفتی عنایت احمد کاکوری سے کی۔ بیشتر کتابیں مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے پڑھیں۔ [۳]

آغاز جوانی ہی میں ان کی ملاقات ایک صاحب حال بزرگ حافظ محمد صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے مولانا کو اسم ذات کی تعلیم دی۔ اس شغل سے مولانا میں استغراقی کیفیت اور قلب میں گرمی پیدا ہوگئی۔ نمازوں میں بے حد لطف آنے لگا اور دنیا سے طبیعت بالکل سرد اور بیزار ہوگئی۔ بعد ازاں چند دوستوں کے مشورہ سے انھوں نے یہ شغل جلد ترک کر دیا۔ [۴]

لیکن مولانا ہمیشہ اہل حق کی تلاش میں رہا کرتے تھے اور آپ کا اللہ والوں اور مشائخ سے خاص تعلق تھا۔ چنانچہ اپنے وقت کے مشہور عارف مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت کی اور زیادہ وقت آپ کی صحبت میں گزارنے لگے۔ فلسفہ

---

[۱] مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ص ۱۰

[۲] سید محمد الحسنی، سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری ص ۷

[۳] " " " " " ص ۸

[۴] " " " " " ص ۱۹

سے بیزاری اور حدیث سے آپ کو ایک فطری مناسبت تھی۔ عارف باللہ کی اس پاکیزہ صحبت نے حدیث کے شغف میں مزید اضافہ کر دیا۔ جس کے باعث مولانا نے وقت کے مشہور و نامور محدّث مولانا احمد علی سہارن پوری سے صحاح ستہ، موطا امام محمد اور موطا امام مالک پڑھی اور صحاح ستہ و موطا امام محمد کی سند بھی حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد تدریسی خدمات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابتدا میں ایک سال دلاری کی مسجد کان پور میں درس دیا۔ بعد ازاں مدرسہ فیض عام میں ڈھائی تین سال تک درس حدیث دیا۔ مولانا نے ایک انجمن "انجمن تہذیب" کے نام سے کانپور میں قائم کی۔ اس انجمن کا مقصد علمار اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں صحیح اسلامی فکر کی اشاعت و ترجمانی اور ان کے درمیان باہمی اتحاد و اخوت پیدا کرنا تھا۔[1]

مولانا محترم کی اس فکر اور طبعی رجحان نے آگے بڑھ کر تحریک ندوۃ العلمار کی صورت اختیار کی۔ آپ نے فیض عام مدرسے کے جلسہ دستار بندی کے موقع پر انجمن ندوۃ العلمار کے قیام کی تحریک پیش کی جس پر شرکار جلسہ نے لبیک کہا اور اس مدرسہ کی ۱۸۹۴ء کی دستار بندی کے موقع پر "ندوۃ العلمار" کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا اتفاق رائے سے اس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔ آپ نے اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے ندوۃ العلمار کے تعارف کے لئے بڑے پیمانے پر جد وجہد کا سلسلہ شروع کیا۔ ملک اور بیرون ملک جدید و قدیم دونوں حلقوں کی جانب سے اس تحریک کے حق میں رائے ہموار ہوئی اور اس کے اغراض و مقاصد سے اتفاق کا اظہار کیا گیا۔

تحریک ندوۃ العلمار کے اغراض و مقاصد کو عملی شکل دینے کے لئے تحریک کی جانب سے دارالعلوم کے قیام اور اس میں پڑھائے جانے کے

---

[1] سید محمد الحسنی سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری ص ۳۱

واسطے نئے نصاب تعلیم کا خاکہ مرتب ہوا۔ یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ ۸ رجب ۱۳۱۳ھ کے جلسہ انتظامیہ کے موقع پر مولانا نے کام کی زیادتی اور اپنی علالت اور ضعف کے سبب اپنی نظامت سے استعفیٰ پیش کیا جو اس وقت تو منظور نہ ہوا لیکن بعد میں مولانا کے مسلسل اصرار اور اپنے نئے مستقر مونگیر میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے باعث ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۲۱ھ کے جلسہ انتظامیہ میں مولانا کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔

مولانا محترم کو درد گردہ کی پرانی شکایت تھی اس وجہ سے مسلسل کمزوری میں اضافہ ہو رہا تھا اور اب اس کمزوری نے بہت زیادہ شدّت اختیار کر لی تھی چنانچہ ۹ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۳ ستمبر ۱۹۲۷ء کو زوال آفتاب کے قریب ایسا محسوس ہوا کہ یہ آفتاب رشد و ہدایت بھی عنقریب غروب ہونے والا ہے اب وقت پورا ہو چکا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد ۲ بجے دن میں اللہ اللہ کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ [1]

مولانا محترم کی عظمت و بلندی کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"اس دور کی یگانہ شخصیتوں میں ایک مولانا سیّد محمد علی مونگیریؒ کی ذات بھی ہے جو جامعیت و توازن کا ایک نادر موقع ہے جس کی مثال اس دور میں مشکل سے ملے گی۔ الٰہیت و ربّانیت عشق و خدامستی، کمال اتباعِ سنّت و فنائیت فی الرّسول اسلام کے لئے دلسوزی اور امت کی فکر، علوہمت و بلند نظری تازگی فکر و جرأت اندیشہ، نور بصیرت و فراست ایمانی حقیقت پسندی و عملیت، زمانے کی نبض شناسی اور آنے والے خطرات

---

[1] سید محمد الحسن سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری ص ۱۷ ۴

سے آگاہی وسعت قلب و درست نظر، اجتماعی کام کی صلاحیت مختلف الذوق رفقار کے ساتھ اشتراک عمل وتعاون کے لئے ہمہ وقت آمادگی، یہ مختلف و بظاہر متضاد صفات وکمالات ان کی ذات میں اس طرح جمع اور پہلو بہ پہلو ضوفگن ہیں کہ دیکھنے والے کے لئے اور ان کی سوانح کی مطالعہ کرنے والے کی نگاہ کی ہمہ گیری کے لئے یہ ایک مستقل امتحان بن جاتا ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے کہ ع

"گلچیں بہار توز داماں گلہ دارد" [۱]

علامہ شبلی نعمانی

بانیان ندوۃ العلماء اور اولین معماروں میں دوسرا اہم ترین نام شمس العلمار علامہ شبلی نعمانی کا آتا ہے۔

"اپنے معاصرین میں ان (علامہ شبلی نعمانی) جیسی متنوع شخصیت کا دوسرا آدمی نہیں تھا۔ ان کا علم و مطالعہ وسیع و دقیق اور ان کی نظر دوربین اور حقیقت شناس تھی۔ خوب سے خوب تر کی جستجو ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔" [۲]

وہ ایک اعلیٰ ترین مقصد حیات کے حامل اور دین وملت کے سچے بہی خواہ تھے۔

---

[۱] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۱۴۷

[۲] ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات ص ۱۰

علامہ شبلی نعمانی، ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے ایک نواحی گاؤں بندول میں شیخ حبیب اللہ کے یہاں پیدا ہوئے۔ مولانا نے کلام مجید اور فارسی کی کتابیں اپنے گاؤں بندول میں ہی پڑھیں۔ پھر اعظم گڑھ کے عربی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ چند روز جون پور میں بھی پڑھا۔ بعد ازاں مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے غازی پور گئے۔ کچھ عرصہ رام پور رہے، اور مولانا ارشاد حسین صاحب سے فقہ اور اصول کی تعلیم حاصل کی۔ [1]

الغرض علامہ شبلی نعمانی نے طلب علوم میں اپنا دامن دور دور تک پھیلایا اور مختلف علوم مثلاً ادب، منطق، حدیث میں جو جو استاد اپنے فن میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے ان تک رسائی حاصل کی اور ایک ذہین، محنتی طالب علم کی حیثیت سے ہر جگہ سے فیض حاصل کیا۔ [2]

۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور اعظم گڑھ میں وکالت شروع کی، کچھ دنوں سرکاری ملازمت کی۔ پھر اپنے والد کے ساتھ ایک عرصہ تجارت کا کام کیا۔ [3]

لیکن وہ اپنی طبیعت کے اعتبار سے ان سب کاموں کے لئے موزوں نہ تھے۔ یکم فروری ۱۸۸۳ء میں ایم۔ او کالج علی گڑھ میں بہ حیثیت استاد شمولیت اختیار کی اور سر سید احمد خاں کی رفاقت میں کارہائے نمایاں انجام دئے مگر سر سید احمد خاں کے سیاسی نظریات سے اختلاف کے باعث وہ علی گڑھ کالج سے بھی الگ ہو گئے۔ [4]

---

[1] محمد اکرام، شبلی نامہ ص ۱۷ - ۳۰

[2] ″ ″ ″ ص ۲۰

[3] ″ ″ ″ ص ۳۰

[4] ″ ″ ″ ″ ص ۴۲

ان ہی دنوں تحریک ندوۃ العلمار کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی اس تحریک کے اغراض و مقاصد سے اتفاق کے سبب علی گڑھ سے علیحدگی کے کچھ ہی عرصہ بعد اس تحریک سے وابستہ ہوگئے اور ۱۹۰۵ء سے باضابطے طور پر ندوۃ العلمار کی تمام سرگرمیوں میں پوری طرح حصہ دار بن گئے۔ محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں لکھتے ہیں کہ :

"عرصہ سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ایک ایسا شخص جو ندوۃ العلماء کے مقاصد سے ذہنی طور پر ہم آہنگ ہو اور تعلیم و تدریس کا عملی تجربہ رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ طلبار کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے، ان کو مناسب طریقوں پر نشو و نما دینے اور ان میں صحیح علمی ذوق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ دارالعلوم میں مستقل قیام کرکے اساتذہ وطلبار سے اس کا براہ راست ربط ہو اور وہ ان کے اور مجلس انتظامی کے درمیان رابطہ کا کام دے ـــــــ اس لحاظ سے اور اپنی یگانہ صلاحیتوں اور علمی امتیار کی بنا پر بھی وہ (علامہ شبلی) اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں شخصیت تھے۔

اس لئے انھیں سے یہ خواہش کی گئی کہ وہ اس (معتمد دارالعلوم) کی ذمہ داری کو قبول کریں وہ جب سے علی گڑھ سے یکسو اور حیدرآباد کے تعلق سے بددل ہوئے تھے اور ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کو انھوں نے اپنی تمناؤں کی تکمیل کا سب سے موزوں میدان سمجھا تھا۔ خود ان کی بھی خواہش تھی کہ وہ یہیں آکر بیٹھ جائیں اور اپنی ساری صلاحیتوں کو اسی مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کردیں جو ان کی فکر و نظر کے بھی مطابق تھا اور ان

کی تعلیم و تربیت اور ذوق و رجحان کے بھی۔" لہ

علامہ شبلی نعمانی کا مستقلاً ندوۃ آنا اور معتمد دارالعلوم منتخب دارالعلوم کے لئے بہت زیادہ سودمند ثابت ہوا۔

مولانا شمس تبریز خاں لکھتے ہیں کہ ــــــ

" مولانا شبلی کا دارالعلوم ندوہ کا معتمد ہونا دارالعلوم کی تاریخ اور ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس عہد میں انھوں نے دارالعلوم میں اپنے اصلاح شدہ نصاب کا اجرا کیا (جو قیام ندوۃ العلمار کے مقاصد میں سے تھا) انگریزی تعلیم رائج کی۔ ندوہ کے لائق فرزندوں کے جوہر کو چمکایا۔ فاضل اساتذہ کی خدمات حاصل کیں اور وقف علی الاولاد اور اشاعت اسلام کی کارروائیوں اور رسالہ "الندوہ" کے ذریعہ تحریک ندوۃ العلمار کی شہرت و تقویت کا سامان کیا اور اس طرح دارالعلوم اور تحریک ندوۃ العلمار دونوں کو استحکام نصیب ہوا۔" ؎۲

اس سب کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی ایک اچھے نقاد، بہترین سیرت اور سوانح نگار اور اعلیٰ درجہ کے ادیب و شاعر بھی۔ سیرۃ النبی، الفاروق شعرالعجم، موازنہ انیس و دبیر اور مقالات شبلی وغیرہ ان کی نمایاں اور معروف ترین تصنیفات و تالیفات ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اپنی زندگی کے آخری ایام میں بہت سی ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کے علاوہ اپنے قدیمی مرض اسہال اور پیچش میں مبتلا ہو گئے تھے مختلف قسم کے علاج معالجہ کیا لیکن مرض میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بلکہ مرض کی

لہ مولوی شمس تبریز خان تاریخ ندوۃ العلمار حصہ دوم ص ۵۱

۲ ؎ " " " " " " ص ۵۰

شدّت اور جسمانی کمزوری میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور شمس العلمار مولانا شبلی نعمانی کے لئے بھی وہ وقت آہی گیا جو ہر نفس کے لئے مقدر ہے۔

۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو چہار شنبہ کے دن صبح کے وقت مولانا شبلی نعمانی نے دنیا کو الوداع کہا۔ [1]

"موج کوثر" کے مؤلف شیخ محمد اکرام، علامہ شبلی کی ہمہ پہلو خوبیوں کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔

"حالی اور آزاد، محسن الملک اور وقار الملک کتنے ہی کمالوں کے تارے تھے؟ ایک یا دو یا تین کے ـــــ ان میں شبلی کی سی بوقلمونی کہاں سے آئے گی؟ جو رندوں میں رند تھے، زہاد میں زاہد، نثاروں میں نثار، شعرا میں شاعر، معلموں میں معلم، مورخوں میں مورخ، سیاست دانوں میں سیاست داں اردو میں عشقیہ خطوط کے بانی، تعلیم میں نئے روش کے آموزگار اور علمی تصنیف و تالیف کے میدان میں ہماری زبان کے سب سے بانکے شہسوار......... قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا، کیا وہ ایک معجزہ سے کم ہے۔" [2]

مولانا حکیم سیّد عبدالحیؒ

تحریک ندوۃ العلمار کے بانیوں میں تیسرے بانی مولانا حکیم سیّد عبدالحی ہیں۔

---

[1] محمد اکرام ، شبلی نامہ ص ۲۵۸

[2] " " ص ۱۳

مولانا عبدالحیؒ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی علم وادب، تقویٰ و طہارت اور خدمت دین وملت پر مبنی ہیں۔ ان کی پوری زندگی انہی دلکش مناظر ومظاہر کی تصویر ہے کسی مثالی شخصیت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ انسانی مقاصد کی تکمیل نظر آئے۔ اس میں دین و دنیا کا توازن برقرار ہو اور اس کی ذات انفرادی و اجتماعی زندگی کا سنگم ہو۔ اس معیار پر مولانا کی شخصیت ایک مثال و معیاری شخصیت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے اور ایک درس وپیغام بن جاتی ہے۔[۱]

مولانا سید عبدالحی کی ولادت ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۹ء کو دائرہ حضرت شاہ علیم اللہ بیرون شہر رائے بریلی میں ہوئی۔ آپ کے والد مولوی حکیم سید فخرالدین خیالی مرحوم، حاذق حکیم، پرفکر شاعر، بڑے مصنف اور فارسی کے ادیب و نثار تھے۔ آپ کا خاندان ہندوستان کا مشہور حسنی سادات کا خاندان ہے۔[۲]

مولانا نے ابتدائی تعلیم فارسی وعربی ہنسوہ اور رائے بریلی میں حاصل کی۔ اس کے بعد الٰہ آباد، لکھنؤ، بھوپال کے لائق اساتذہ سے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۳۱۴ھ میں آپ ندوۃ العلماء کے معاون ناظم ہوئے۔ پھر معتمد دفتر بنائے گئے اور سالانہ جلسہ منعقدہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ میں آپ اتفاق رائے سے ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب کئے گئے۔ آپ کے دور نظامت میں بہت سی مشکلات بھی سامنے آئیں لیکن اس کے باوجود آپ نے بہت سے خوش آئند کام کئے۔ اصلاح نصاب کے لئے ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ دارالاقامت کا سنگ بنیاد رکھا۔ چند جدید تقرریاں کیں اور طلباء قدیم میں سے ارکان ندوۃ العلماء کا انتخاب

۱؎ شمس تبریز خاں تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم ص ۱۴۳

۲؎ " " " " " ص ۱۲۴، ۱۲۵

کرلیا۔ غرض مولانا اپنی وفات تک اس تحریک سے والبستہ رہے۔ [1]

مولانا عبدالحی اردو، فارسی اور عربی ادب میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ ہندوستان میں ایسی سلیس عربی لکھنے والے مشکل سے گزرے ہوں گے۔ عرب ممالک کے ادیب و نقاد آپ کی عربیت کے بڑے قائل تھے۔ [2]

۱۵ رجمادی الاول ۱۳۴۱ھ کو جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب میں چند گھنٹوں کی علالت کے بعد مولانا کا انتقال ہوا۔ اور اپنے آبائی قبرستان میں اپنے اجداد کرام کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

مولانا سید عبدالحی مرحوم نے اپنی اولاد میں دو نامور اور لائق بیٹے ڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلمار اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ۲ دو بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ [3]

مولانا مرحوم کو مولانا سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

"ندوۃ پر کیا کیا انقلابات آئے، کتنے ارکان بدلے، کتنے منتظمین آئے اور کتنے گئے، کتنے معتمد و ناظم عزل و نصب ہوئے کتنے فتنے اور حوادث پیدا ہوئے مگر ان تمام حالات و حوادث کے طوفان میں ثبات و استقلال کی صرف ایک چٹان تھی۔ جو اپنی جگہ پر تھی اور وہ مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم کی ذات تھی۔" [4]

---

[1] شمس تبریز خاں تاریخ ندوۃ العلمار حصہ دوم ص ۱۲۶، ۱۲۹، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۳

[2] " " " " " ص ۱۳۴

[3] " " " " " ص ۱۴۱

[4] " " " " " ص ۱۳۰، ۱۳۱

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی

تحریک ندوۃ العلمار کے بانیوں اور ابتدائی معماروں میں چوتھا نام نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا آتا ہے۔

مولانا شیروانی کی ولادت ۲۸ر شعبان ۱۲۸۳ھ مطابق ۵ار جنوری ۱۸۶۷ء کو صبح کے وقت ان کے آبائی قلعہ بھیکن پور میں ہوئی۔ دستور کے مطابق پانچویں سال بسم اللہ ہوئی۔ بسم اللہ مولوی سید حسن شاہ صاحب رام پوری نے پڑھائی۔[۱] اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اپنے دور کے متعدد نامور علمار سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۰ء میں آگرہ کالج میں داخلہ لیا اور خصوصیت سے انگریزی میں لیاقت پیدا کی۔ گھر کا ماحول بھی علمی، دینی، ادبی تھا۔ جس کے باعث دینی اور عصری تعلیم میں پوری طرح اہلیت پیدا ہوگئی۔

نواب صدر یار جنگ کو فطری طور پر ہر اصلاحی اور تعمیری پروگرام سے شغف تھا۔ انھوں نے ابتداءً سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک سے اپنے آپ کو وابستہ کیا۔ وہ سرسید کی تعلیمی پالیسی سے پوری طرح متفق تھے مگر ان کے مذہبی خیالات سے مطلق سروکار نہ رکھتے تھے۔[۲]

عباس خاں شیروانی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی علی گڑھ تحریک سے تعلق کی بابت لکھتے ہیں:-

"۱۸۹۰ء سے مرحوم کا تعلق کانفرنس سے شروع ہوا۔ اوّل

۱۔ شمس تبریز خاں صدر یار جنگ ص ۴۳

۲۔ " " " ص ۱۱۲

اس کے لائف ممبر ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں جوائنٹ سکریٹری اور ۱۹۲۱ء میں سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس وقت سے آخری دم تک مرحوم نے اس ادارہ کو چلایا۔" [۱]

مولانا شیروانی کو یوں تو دارالعلوم دیوبند، انجمن حمایت اسلام، انجمن تبلیغ اسلام اور انجمن ترقی اُردو اور ان جیسی دوسری تحریکوں سے کافی دلچسپی تھی لیکن انھیں اصلاً ندوۃ العلمار اور مسلم ایجوکیشن کانفرنس علی گڑھ سے خاص لگاؤ تھا۔ بلکہ عملاً وہ ان اداروں کے شریک کار تھے اور شروع ہی سے ندوۃ العلمار کے ارکان اساسی میں سے تھے اور مدت العمر مجلس انتظامی کے رکن رکین بھی رہے۔ [۲]

مولانا شمس تبریز خاں لکھتے ہیں کہ ــــــ

"علمار کی اس تحریک (ندوۃ العلمار) میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو کسی وجہ سے اس میں شریک ہوگئے تھے لیکن انھیں شرح صدر نہیں تھا۔ مولانا شیروانی کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ انھیں اس تحریک کے مقصد سے پورا اتفاق تھا اور یہ ان کی دل کی آرزو تھی۔ وہ دین و دنیا کے جامع علمار کی جماعت تیار کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ ان کی معتدل جامعیت جدید و قدیم کے کس سنگم کی تلاش میں تھی جو تحریک ندوہ کی شکل میں انھیں ملا تھا۔" [۳]

مولانا شیروانی کی عمر کا ایک گرانمایہ حصہ حیدر آباد میں بہ حیثیت صدرالصدور

---

[۱] شمس تبریز خاں   صدر یار جنگ   ص ۱۱۳

[۲] "   "   "   ص ۱۴۲

[۳] "   "   "   ص ۱۴۳

بسر ہوا جس میں آپ نے دین وملت کی خدمت کے سلسلہ میں کارہائے نمایاں انجام دئیے۔ [1]

حیدرآباد سے واپسی کے بعد وہ مکمل طور پر علمی مشاغل اور ملّی مسائل کی جانب متوجہ ہوگئے تھے۔ خاص طور سے ندوۃ العلماء اور دوسرے دینی اداروں کے لئے وقت نکالتے اور سفر کرتے تھے۔

صحت اخیر تک اچھی رہی۔ لیکن وفات سے ایک دو سال پہلے سے حافظہ میں کچھ فرق آگیا تھا اور آخر میں یہ معذوری بڑھ گئی تھی۔ عزیزوں کے نام بھول جاتے اور ان کو کبھی پہچان بھی نہیں پاتے تھے ــــــ مرض الموت ایک ہفتہ رہا اور ۲۶ شوال ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء کو جمعہ کے دن چھ۶ بج کر چالیس۴۰ منٹ پر طلوع آفتاب کے بعد علم ودین، تقویٰ وتہذیب وشرافت کا یہ آفتاب چشم عالم سے نہاں ہوگیا اور اس طرح ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ ایک روایت مٹ گئی، ایک تہذیب لٹ گئی۔ ملت اسلامیہ کا ایک بلند ستون گر گیا ــــ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ [2]

مولانا شیروانی مرحوم کے بارے میں مولانا علی میاں صاحب لکھتے ہیں کہ:

> (مولانا شیروانی مرحوم کو) ایسی مجلسوں میں بار بار شرکت کرنے کا موقع ملا اور ان میں سے بعض اداروں اور جماعتوں کی مستقل رکنیت کا شرف حاصل ہوا۔ جن میں عالم اسلام اور ممالک عربیہ کے چیدہ وبرگزیدہ اشخاص اور ممتاز اہل علم جمع ہوئے تھے۔ پھر بہت سے ایسے ملکوں میں قیام کا موقع ملا جو اسلامی علوم اور تہذیب وثقافت کا عرصہ دراز سے مرکز چلے آرہے ہیں،

---

[1] شمس تبریز خاں، صدر یار جنگ ص ۱۰۴

[2] 〃 〃 〃 ص ۲۲۱

اور ان کی مردم خیزی مسلم ہے۔ اس کے بعد امیر خسرو کے پراز اعتماد لہجہ ہی میں جس میں انھوں نے آفاق و انفس کی وسیع واقفیت کے بعد اپنے محبوب و ممدوح کی انفرادیت کی شہادت دی ہے۔ یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ نواب صاحب کی جامعیت اور وسیع و متنوع ثقافت کا آدمی نظر نہیں پڑا۔

امیر خسرو کا شعر ہے ــــ

آفاق ہا گر دیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری [1]

---

[1] تبریز خاں ، صدر یار جنگ ، ص ،

تحریک کا قیام

ہندوستان کی ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد برطانوی حکمرانوں کے غیظ و غضب کا نشانہ پوری طرح مسلمان بنے اور انھوں نے ایسی سفاکی کا مظاہرہ کیا کہ چنگیز و ہلاکو کی یاد تازہ کر دی۔

عروج سلطنت انگلشیہ کا مؤلف لکھتا ہے ——

"ہر ایک انگریز کا یہ شیوہ ہو گیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا۔ ہر ایک سے پوچھتا تو ہندو ہے یا مسلمان، جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا۔"

قیصر التواریخ کا مؤلف لکھتا ہے :

"ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی اور سات دن برابر قتل عام رہا۔ اس کا کوئی حساب نہیں۔ بچوں تک کو مار ڈالا گیا۔ عورتوں سے جو سلوک کیا گیا، بیان سے باہر ہے جس کے تصور سے ہی دل دہل جاتا ہے۔" [۱]

اس کے بعد برطانوی حکمرانوں نے مسلمانوں کو اعلیٰ ملازمتوں سے علیحدہ کیا

---

[۱] مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اوّل، ص ۳۴

تجارت وصنعت کو تباہ کیا، مقدمات چلائے، سزائیں دیں اور ان کی جائدادوں اور اوقاف کو ضبط کر لیا۔ جن سے دینی مدارس چلتے تھے اور اس کے خلاف ایسے تعلیمی ادارے کھولے گئے اور ایسا تعلیمی نظام بنایا گیا جس سے مسلمان فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ [۱]

ان بدترین اور پرمصائب حالات میں دو قسم کی قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں، پہلی قیادت خالص دینی قیادت تھی۔ جس کے علمبردار علماء دین تھے۔ دوسری قیادت سرسید احمد خاں مرحوم اور جدید مکتب خیال کے افراد پر مشتمل تھی۔ [۲]

علماء حضرات کے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ ان میں پیش پیش مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔

سرسید احمد خاں اور ان کے ہم فکر رفقاء نے جدید تعلیم کے حصول کے لئے ایم۔ اے۔ او کالج کی بنیاد ڈالی اور اس کا افتتاح سر ولیم میور سے کرایا۔

لیکن ان دونوں قدیم اور جدید درسگاہوں کے قیام سے جہاں مسلمانوں کو خاطر خواہ فائدہ حاصل ہوا، وہیں مسلمان آپس میں قدیم اور جدید دو واضح طبقوں میں تقسیم ہو گئے۔

اس کے ساتھ ساتھ قدم قدم پر قدیم وجدید کی کشمکش تھی۔ ایک سرے پر وہ طبقہ تھا جو ہر جائز کو ناجائز سمجھتا تھا اور دوسرے سرے پر وہ طبقہ تھا جس نے ہر ناجائز کو جائز کر رکھا تھا۔ بقول اکبر الٰہ آبادی ـــــ

اِدھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
اُدھر یہ ہٹ ہے کہ ساقی صراحی مے لا [۳]

---

[۱] مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول ص ۳۵، ۳۶، ۳۹

[۲] " " " " " " ص ۴۲

[۳] سید محمد الحسنی، سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری ص ۱۰۴

اسی زمانے میں فتنۂ تکفیر اور نزاع باہمی کا سلسلہ علمار کے درمیان شروع ہوا اور اس کے نتیجے میں بکثرت ایسے مناظرا ور واقعات پیش آئے جنھوں نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کو داغدار بنا دیا۔ ایک کش مکش مقلدین کی بھی شروع ہوئی اور امت اہل حدیث، اہل فقہ کے دو الگ الگ گروہ میں بٹ گئی۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ کچھ ایسی نئی اور جامع شخصیات سامنے آئیں جو قدیم وجدید کی مصنوعی تقسیم سے بالاتر ہوں اور جن کے نزدیک ــــ "نیک وبد اور خوب وناخوب کا معیار تاریخ اور زمانہ نہ ہو بلکہ تاریخ اور زمانہ خود اس کے پابند ہوں۔ اسلام اس لئے برتر اور بہتر نہیں ہے کہ وہ آج سے چودہ سو برس پہلے کا مذہب ہے بلکہ اس لئے کہ وہ خدا کا آخری دین اور انسانیت کی نجات کا واحد راستہ ہے۔ اسی طرح جدید علوم اور جدید ذرائع اس لئے قابل قدر اور قابل تعریف نہیں ہیں کہ وہ بیسویں صدی کے صنعتی اور ترقی یافتہ عہد میں ظہور پذیر ہوئے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ انسانوں کے لئے مفید ہیں اور ان کو نیک مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ [1]

چنانچہ اپنے زمانے کی ایک ایسی ہی شخصیت جو اپنی ذات میں جامعیت اور توازن کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ مولانا سید محمد علی مونگیری نے ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر ندوۃ العلماء کا تخیل علمار کے سامنے پیش کیا۔

علمار کی مجلس مشاورت نے اتفاق رائے سے یہ بات طے کی کہ اس نام سے علمار کی ایک مستقل انجمن قائم کی جائے اور آئندہ سال دستار بندی کے موقع پر اس کا پہلا جلسہ عام منعقد کیا جائے اور ہندوستان کے تمام

---

[1] سید محمد الحسنی، سید مولانا سید محمد علی مونگیری، ص ۱۰۵، ۱۰۶

ممتاز علمار کو اس میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ ؎۱

۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء میں اس مدرسہ فیض عام کی دستار بندی کے موقع پر کانپور میں ندوۃ العلمار کا پہلا اجلاس بڑی شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ منتخب اہل نظر اور اہل درد جن کو فراست ایمانی اور دردِ اسلامی کا حصہ وافر ملا تھا۔ سر جوڑ کر ایک جگہ بیٹھے ـــــ یہ پہلا موقع تھا کہ جب اہل نظر، اہل دل کے ساتھ، علمار دین جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ، مذہب حنفی کے علمبردار علمار اہل حدیث کے ساتھ، زاہد وگوشہ نشین بزرگ امرار ورؤسار، اور ماہرین تعلیم کے ساتھ شانہ بشانہ اور صف بہ صف نظر آئے۔ ؎۲

انجمن کا قیام عمل میں آیا اور اس انجمن کا نام "ندوۃ العلمار" رکھا گیا۔

؎۱ سید محمد الحسنی، سید مولانا سید محمد علی مونگیری ص ۱۱۵

؎۲ مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلمار حصہ اوّل ص ۱۰، ۱۱

اغراض ومقاصد

اس تحریک کے ابتدائی اغراض ومقاصد صرف دو تھے:۔

۱۔ علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

۲۔ رفع نزاع باہمی یعنی اتحاد ملیؔ اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔[۱]

تحریک ندوۃ العلماء جوں جوں آگے بڑھی۔ اس نے اپنے دائرہ کار اور بنیادی مقاصد میں اضافہ کیا۔ اب مندرجہ ذیل چار مقاصد تحریک ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد قرار پائے ـــــ

۱۔ علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

۲۔ ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب وسنت کے وسیع وعمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔

۳۔ اتحاد ملیؔ اور اخوت اسلامی کو فروغ دینا۔

۴۔ اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔[۲]

---

[۱] مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ اول ص ۵۶

[۲] ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ص ۵۶، ۵۷

تحریک کے پہلے مقصد اصلاح نصاب کی وضاحت کے ذیل میں مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی مرحوم لکھتے ہیں :۔

"انسانی ذہن و فکر کی تعمیر، قول و فعل میں توازن اور کردار سازی میں نصاب تعلیم اور نظام تربیت سب سے موثر کردار ادا کرتا ہے۔ قوموں کے عقیدے اور عمل اور معاشرہ کا مزاج و رجحان، حکومت کی ساخت اور تنظیم، یہ سب کچھ نظام تعلیم و تربیت کے تابع اور زیر اثر ہوتے ہیں۔

نظام تعلیم وہ سانچہ ہوتا ہے۔ جس پر ڈھلنے والا دماغ خالق و مخلوق، معاشرت و معیشت کے سلسلہ میں مخصوص تصوّر رکھتا ہے۔ (انگریزوں کے دئے ہوئے) نظام تعلیم نے قدیم و جدید، دین و دنیا کا جو فتنہ کھڑا کیا۔ اس سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا اور اس نقصان کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔"[1]

نصاب درس اور نصاب تعلیم کی اس اہمیت اور ضرورت کے احساس کے پیش نظر تحریک ندوۃ العلماء کے بانیان نے اپنے سامنے اس مقصد کو واضح طریقہ پر رکھا اور پہلے مقصد کے طور پر اس کو تحریک کا مقصد بنایا۔

تحریک کا دوسرا مقصد زمانہ کے نبض شناس علماء کا پیدا کرنا کے سلسلہ میں مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی مرحوم لکھتے ہیں ؎

"اس نے (یعنی تحریک ندوۃ العلماء نے) اپنے اہم مقاصد میں ایسے علماء کی تیاری شامل کی تھی جو روشن خیال ہوں، زمانے کی نبض پر جن کا ہاتھ ہو، جن کی نگاہ قدیم و جدید کی مصنوعی اور سطحی تقسیم سے بالاتر ہو اور یہ وہ ضرورت تھی کہ جس کی کمی ہر دور کے حساس لوگوں کو محسوس ہوتی رہی ہے

---

[1] مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اوّل ص ۵۶، ۵۷

جن علمار کی تیاری کا اعلان دارادہ ندوہ نے کیا تھا، اس کی وضاحت علامہ شبلی نعمانی اِن الفاظ میں کرتے ہیں۔

۱۔ علمار میں ایثار نفس پیدا کرنا۔
۲۔ انگریزی داں علمار پیدا کرنا۔
۳۔ مذاق حال کے موافق علمار کے گروہ میں مقررین اور ارباب قلم پیدا کرنا۔
۴۔ ایسے علمار پیدا کرنا جو غیر ممالک میں اسلام کی اشاعت کرسکیں۔[1]

یہ اس وجہ سے کہ جذبۂ تبلیغ پیدا ہو سکے، اس لئے کہ اسلام ایک دعوتی اور تبلیغی مذہب ہے اور مسلمانوں نے تبلیغ دین کے کام سے کنارہ کشی اختیار کرکے اب تک بہت نقصان اٹھایا تھا۔

تیسرا مقصد اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کو فروغ دینا۔ اس دور میں انتہائی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت مسلمانوں اوران کے علمار کی باہمی نزاع کی یہ حالت تھی کہ ـــــــ وہ صلاحیتیں جو زیادہ بہتر خدمت اور اعلیٰ قیادت کا مظاہرہ کرتیں، باہمی اختلافات، تکفیر و تفسیق فروعی بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کی نذر ہونے لگی تھیں اور تحریک ندوۃ العلمار کے وجود میں آنے سے پہلے ہندوستان ہی نہیں پورا عالم اسلام ایک دنگل کا روپ اختیار کرچکا تھا۔[2]

ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے افتراق و انتشار کے یہ تکلیف دہ حالات امتِ مسلمہ کا درد رکھنے والوں کو کیسے گوارہ ہوتے، اس لئے تحریک ندوۃ العلمار کے ذی ہوش اور ذی شعور قائدین نے اتحاد ملت کو تحریک کے مقاصد میں شامل کیا۔

---

[1] مولوی محمد اسحٰق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلمار حصہ اوّل ص ۹۰
[2] " " " " " " ص ۸۶

ندوۃ العلمار کے قیام کا چوتھا اور آخری مقصد اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا، اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے بہت ضروری ہے یوں تو اس مقصد کے حصول کی اس ملک میں ہمیشہ ضرورت رہی ہے لیکن قیام ندوۃ العلمار کے وقت میں حالات انتہائی تشویش ناک ہو گئے تھے۔

ایک طرف عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں جاری تھیں تو دوسری طرف شُدھی سنگٹھن کے نام سے وہ ہندو تحریکیں سرگرم عمل تھیں جو غیر تربیت یافتہ بھولے بھالے جاہل مسلمانوں کو ورغلا کر کہ تم اصلاً ہندو ہو۔ مسلمانوں کو پھر ہندو مذہب میں داخل کرنے کے لئے زور شور سے جدوجہد کر رہی تھیں۔

شُدھی تحریک کا مثبت اور مناسب جواب یہی تھا کہ مسلمانوں کو دین سے آشنا کرایا جائے اور برادرانِ وطن تک اسلام کا حقیقی پیغام پہنچایا جائے[1] چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک عملی منصوبہ بنایا گیا۔

۱۔ ندوۃ العلمار نے ابتدا ہی سے اشاعت اسلام کو اپنے مقصد میں داخل کیا تھا اور یہ طے کیا تھا کہ ایسے علمار و مبلغین پیدا کئے جائیں جن میں سادگی جفاکشی اور جانثاری کے اوصاف ہوں۔

۲۔ اشاعت اسلام کا مستقل شعبہ قائم کیا جائے، تمام اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں۔ مستقل واعظ مقرر کئے جائیں جو دیہات میں جا کر ایک ایک ڈو ڈو ماہ رہ کر اسلامی احکام اور عقائد کی تعلیم دیں۔

۳۔ عربی خوانوں کو سنسکرت اور انگریزی کی اعلیٰ درجہ تک تعلیم دی جائے[2]

ﻫ

---

[1] مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلمار حصہ اوّل، ص ۹۴

[2] ایضاً ص ۹۴، ۹۵

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام

تحریک ندوۃ العلماء کا اولین اور بنیادی مقصد دینی مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح اور ایک نیا نصاب تعلیم تیار کرنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں تھا، اس لئے کہ تحریک کو اپنے وقت کی جو لائق ترین ہستیاں میسر آگئی تھیں وہ یقیناً اس کی پوری طرح اہل تھیں۔ لیکن اصل مسئلہ تھا اس نئے نصاب تعلیم کو رائج کرنا جو موجودہ دینی درس گاہوں میں ناممکن تھا۔ تحریک کے کارکنوں نے بہت دوڑ دھوپ کی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

ندوۃ العلماء نے نصاب تعلیم کی اصلاح کی بھرپور کوشش کی۔ اس ضرورت کا احساس پیدا کرنے میں ندوۃ العلماء کے کارکنوں نے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ لیکن اس تمام تگ و دو کے بعد اندازہ ہوا کہ جب تک ندوۃ العلماء کے زیر انتظام کوئی نمونہ کا دارالعلوم قائم نہ ہوگا۔ اس وقت تک نصاب تعلیم میں تبدیلی و اصلاح کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ [1]

چنانچہ تحریک کے حقیقت پسند اور صاحب بصیرت بانی مولانا محمد علی مونگیری

---

[1] مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اوّل ص ۱۳۹

کے ذہن نے اسے سوچا اور یہ خیال ایک واضح خاکہ کی شکل میں ۱۲ محرم الحرام ۱۳۱۳ھ
کے جلسہ انتظامیہ میں پیش ہوا۔ ندوۃ العلماء کے ماتحت اعلیٰ پیمانہ پر ایک
دارالعلوم کے قیام کی تجویز ہر رکن کے دل کی آواز تھی۔ لہٰذا یہ تجویز منظور
ہوئی۔ [1]

بعد ازاں دارالعلوم کے خاکہ کا مسودہ شائع کر کے ملک کے ممتاز
علماء، مشاہیر اور ماہرین تعلیم کو بھیجا گیا کہ ان کی قیمتی آراء سے استفادہ کیا جا سکے۔
طبقہ علماء کی خاص تعداد نے اس تحریک و تجویز کی تائید کی اور اسے ایک
انقلابی قدم سے تعبیر کیا۔ [2]

دارالعلوم ندوۃ العلماء موجودہ دینی درس گاہوں میں مزید ایک
درس گاہ کا اضافہ نہیں تھا بلکہ اس کی اپنی ایک امتیازی خصوصیت تھی
کہ اس درس گاہ سے فارغ ہو کر نکلنے والے علماء اعلیٰ صفات اور خصوصیات
کے حامل ہوں۔

۱۔ سب سے مقدم یہ ہے کہ قوم میں ایسے علماء کی ایک جماعت موجود
ہو جو علوم مذہبی میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتی ہو۔ خصوصاً علم کلام اور علم فقہ
میں اس کو ملکۂ تام حاصل ہو تاکہ عبادات اور معاملات کے متعلق احکام و
فتاویٰ اس کے مستند اور واجب العمل سمجھے جائیں۔

۲۔ دوسری چیز جس کا مولانا علی مونگیری نے بڑے اہتمام سے ذکر کیا
ہے۔ وہ دنیا کے حالات و واقعات سے علماء کی واقفیت ہے۔ مولانا
لکھتے ہیں ـــــ

بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے

---

[1] مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول ص ۱۳۹

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۱۳۹، ۱۴۰

حالات و واقعات سے بھی باخبر ہو۔ اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ زندگی بسر کرتی ہے اس کے اصول سلطنت کیا ہیں۔ مسلمانوں کی دنیاوی حالت کیا ہے، اس کو کیا ضرورتیں درپیش ہیں۔ سلطنت کے انتظامات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جارہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جاتا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں اور ان کو دنیا کی خبر نہیں ہے اس لئے دنیاوی معاملات میں ان کی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل ناقابل التفات ہے۔ بے شک جو علماء دنیا سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، اور کثرت عبادت اور ذکر کی وجہ سے انھیں اپنے زن و فرزند کے ضروریات کی طرف بھی توجہ نہیں، اصحاب صفّہ سے انھیں تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کل صحابہ کرامؓ اصحاب صفّہ نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ بلاشبہ اصحاب صفّہ کے مشابہ ایک گروہ ہمیشہ قوم میں موجود رہنا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ نہایت ضروری ہے کہ جماعت کثیر ایسی بھی موجود ہو جو واقفیت و اطلاع، انتظام و تدبیر، حزم و مصلحت اندیشی میں حضرت عمرؓ، عمرو بن العاص خالد بن الولید اور ابو عبیدہ کے نقش قدم پر ہو۔ [1]

ان مقاصد کے حصول کے لئے دارالعلوم کے بنیادی اصول متعین کئے گئے جس کے تحت دارالعلوم کے قیام کی جگہ، عمارت کی تفصیل، طلباء کا نظام تربیت شرائط داخلہ، نظام تعلیم و تدریس، نصاب، بحث و مباحثہ اور تقریر کی مشق، وظائف امتحانات اور بحث وغیرہ کو لیا گیا۔

ندوۃ العلماء کے چوتھے اجلاس شوال ۱۳۱۴ھ منعقدہ میرٹھ میں دارالعلوم کے لئے مقام کے تعین پر اظہار خیال ہوا۔ دہلی اور لکھنؤ ان دونوں مقامات

---

[1] محمد الحسنی، پیام ندوۃ العلماء، مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ص ۶۵، ۶۶

کی بات چلی لیکن کچھ مخصوص وجوہات کے باعث دارالعلوم کا قیام لکھنؤ میں عمل میں آیا۔ ۱۹ر جمادی الآخر ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۶ر ستمبر ۱۸۹۸ء کو محلہ گولہ گنج میں واقع خاتون منزل نامی عمارت میں افتتاح ہوا۔ اور ابتدائی درجات کھول دئے گئے۔ ۴ر اکتوبر ۱۸۹۸ء کو ایک عظیم الشان جلسہ کی شکل میں افتتاح کی تقریب منعقد ہوئی اور اس تقریب میں ممتاز اہلِ علم اور سربرآوردہ حضرات کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، جو قابلِ لحاظ ہے۔ ؎۱

ایک طے شدہ منصوبے کے تحت دارالعلوم کی ابتدا تو ہو چکی تھی لیکن تحریک ندوۃ العلماء کے پیشِ نظر جو ایک عظیم تعلیمی منصوبہ تھا اس پر عمل آوری کے لیے ضروری تھا کہ دارالعلوم کی اپنی ساری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کئی عمارات ہوں۔ چنانچہ سرمایہ جمع کیا گیا اور گورنمنٹ سے زمین حاصل کی جو لکھنؤ یونیورسٹی سے ملحق دریائے گومتی کے کنارے پر واقع ہے۔ ۱۹۰۸ء میں گورنر یو، پی نے ندوۃ العلماء کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ؎۲

مولانا محمد الحسنی اپنی تالیف "روداد چمن" میں لکھتے ہیں ——

اس تحریک کے بلند و عظیم مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک تجربہ گاہ کے طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام اس (تحریک) کے چھ سال بعد (۱۸۹۸ء میں) عمل میں آیا۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب اور بابرکت ثابت ہوا کہ بعد میں اس دارالعلوم نے تحریک ندوۃ العلماء سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل کرلی، ولولہ انگیز سرگزشت پس منظر میں چلی گئی۔ ؎۳

؎۱ مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول ص ۲۱۲

؎۲ ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں ص ۱۵۰

؎۳ مولانا محمد الحسنی روداد چمن ص ۱

دارالعلوم ندوۃ العلمائی سرگرمیاں

دارالعلوم ندوۃ العلمار اپنے قیام کے بعد یقیناً منظر پر آگیا۔ لیکن تحریک ندوۃ العلمار کی روح پس منظر میں ضرور باقی رہی۔ اس لئے کہ دارالعلوم کی تمام سرگرمیوں میں اس روح کا اثر پوری طرح محسوس ہوتا ہے۔ ندوۃ العلمار نے جس اولین مقصد اصلاح نصاب تعلیم کو اپنی فکر کا مرکز و محور بنایا تھا۔ وہی مرکز و محور "اصلاح نصاب" دارالعلوم کا بھی تھا۔

تحریک ندوۃ العلمار نے اپنے قیام کے چھ[۶] سال بعد دارالعلوم اس مقصد اور ضرورت کے پورا کرنے کے لئے قائم کیا تھا۔ اصلاح شدہ نصاب جب کوئی دینی درس گاہ اپنے یہاں رائج کرنے کے لئے آمادہ وتیار نہ ہوئی تو یہ طے ہوا کہ خود یہ تحریک ایک نئی تجربہ گاہ کے طور پر دارالعلوم قائم کرے۔ چنانچہ جلد ہی اس کا قیام عمل میں آگیا۔

نصاب تعلیم

دارالعلوم کے قیام کے وقت جو نصاب تعلیم بہت سے دینی مدارس

میں رائج تھا اس کے ایک سرسری جائزے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ طلباء کا قیمتی وقت کس طرح معقولات پر بلا ضرورت صرف ہوتا ہوگا۔

مولانا رشید احمد گنگوہی اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :

"فلسفہ محض بے کار امر ہے اس سے کوئی نفع معتدبہ حاصل نہیں سوائے اس کے کہ دو چار سال ضائع ہوں اور آدمی خر دماغ، غبی دینیات سے ہو جائے۔ فہم کج اور کور فہم شرعیات سے ہو جائے اور کلمات کفریہ زبان سے نکال کر فلاسفہ میں قلب کو کدورت ہو جائے اور کوئی فائدہ نہیں۔" [1]

دینی مدارس کے موجودہ نصاب کے ان نقائص پر ہمیشہ کھل کر گفتگو ہوتی اور ان نقائص کا اعلانیہ اظہار بھی کیا جاتا۔ انہی کمزوریوں کے پیش نظر دارالعلوم میں جدید نصاب اور اصول تعلیم رائج کئے گئے۔

نئے نصاب کی تکمیل کی مدت دس ۱۰ سال رکھی گئی۔

درجہ ادنیٰ :-

اس کی مدت خواندگی تین ۳ سال ہے۔ اس کے نصاب میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ علوم عربیہ اور دینیات میں بقدر ضرورت طلباء کو مہارت حاصل ہو جائے۔ قرآن شریف، حدیث، فقہ اور عقائد سے واقف ہو جائے۔

درجہ متوسط :-

اس کی مدت خواندگی پانچ ۵ سال ہے۔ اس درجہ سے فارغ ہونے والے طلباء کو ہر علم میں کافی استعداد اور قوت عربیہ پیدا ہو جائے گی اور وہ جس علم میں چاہے گا تبحر اور کمال پیدا کر سکے گا۔ اس دوران قرآن اور

---

[1] محمد الحسنی، پیام ندوۃ العلماء، ص ۴۲ (بحوالہ سوانح قاسمی، جلد دوم ص ۲۹۲)

حدیث سے بہت زیادہ ربط قائم کر لیا جائے گا۔

درجہ اعلیٰ:

اس کی مدت خواندگی دو سال ہے، اس مدت میں قوت مطالعہ کے ساتھ استیعاب مسائل اور تبحر علمی پیدا کرنا پیش نظر ہے اس درجہ میں شوق میلان طبیعت کے لحاظ سے کس علم خاص میں تکمیل کرائی جائے گی اس درجہ کے فارغ طالب علم کو خاص لقب دیا جائے گا۔ مثلاً مفسر۔ محدث، فقیہ اور ادیب وغیرہ۔[1]

ان تینوں درجات کے نصاب کی تفصیل کو مؤلف تاریخ ندوۃ العلماء نے نصاب کے تحت لکھا ہے۔ تینوں قسم کے طلباء کے لئے نصاب درس جدا جدا ہوگا۔

۱۔ ادنیٰ درجہ ــــــــ فن ادب پر نہایت توجہ ہوگی۔ شعراء دور جاہلیہ کے متعدد دیوان درس میں داخل ہوں گے تاکہ قرآن مجید کے طرز و بیان پر عمدہ طور پر واقفیت ہو۔

۲۔ تاریخ اسلام کے حصہ پر ضرور عبور کرایا جائے گا جس سے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کے اخلاق، علو ہمت جذبہ اسلامی اور مخلوق کے لئے خیر خواہی ثابت ہوتی ہو۔ جس سے قرآن مجید اور احادیث کے بعض مقامات کی توضیح ہوتی ہے۔ اس طرح علمائے اکرام اور شاہان اسلام کے وہ حالات جن سے ان کی اولوالعزمیاں غیروں کے ساتھ ان کے اخلاق اور عمدہ برتاؤ کا علم ہوتا ہے۔

۳۔ ممالک اسلامیہ کا جغرافیہ بھی اس قدر معلوم کرایا جائے جس سے وہ قرآن مجید اور احادیث کے مقامات کو بخوبی سمجھ سکیں اور اس وقت کی اسلامی دنیا سے بھی واقف ہوں۔ بہ نسبت منطق و فلسفہ، یہ دونوں علوم (یعنی تاریخ و جغرافیہ) زیادہ ضروری ہیں۔

---

[1] مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول ص ۲۲۹، ۲۳۰

۴۔ منطق وفلسفہ میں کثرت سے کتابیں داخل ہوگئی ہیں۔ وہ گھٹا کر ادب و دینیات کی کتابیں پڑھائی جائیں گی۔

۵۔ علم کلام پر زیادہ توجہ دی جائے گی۔ تہافیۃ الفلاسفہ، ابن رشد کی بعض تصانیف اور شرح مقاصد، شرح مواقف اور شرح تجرید، درسایا عالعتہ داخل نصاب ہوں گی۔

۶۔ تہذیب نفس کے لئے علم الاخلاق اور تصوف کی تعلیم دی جائے گی۔ مثلاً عوارف المعارف اور احیا رالعلوم کا کچھ حصہ داخل درس ہوگا۔

اعلیٰ درجہ (غالباً اس میں متوسط درجہ بھی شامل ہے)

۱۔ اس درجہ میں تین قسم کی کتابیں ہر علم کی ہوں گی۔
ایک وہ جن میں صاف صاف نفس مسائل مذکور ہوں۔
دوسری وہ جن میں مسائل کے ساتھ ان کے دلائل بھی نہایت واضح طور سے بیان ہوئے ہوں۔
تیسری وہ کتابیں جن کی عبارت مغلق اور پیچیدہ ہو تاکہ طلب علم کو وہ فن بھی آجائے اور دقت نظر اور مشکل عبادت سمجھنے کی لیاقت پیدا ہو۔

۲۔ تفسیروں کے علاوہ وہ کتابیں بھی درس نصاب ہوں گی۔ جن میں عام طور پر علوم قرآن مجید سے بحث ہے اور بالخصوص وہ جن سے قرآن مجید کا اعجاز ثابت ہوتا ہے جیسے اعجاز القرآن باقلانی وغیرہ [1]

مروجہ درس نظامی اور شروح و حواشی کے کتب خانہ کے مقابلہ میں یہ نصاب ایک انقلاب انگیز نصاب کہلانے کا (یقیناً) مستحق ہے اور اس کے حامیوں کی نظر میں بغاوت سے کس طرح کم نہیں ہے۔ اس کے (یعنی گذشتہ نصاب کے) سارے نظام کو پہلی بار درہم برہم کردیا گیا ہے۔ اور ان بہت سے

---

[1] مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول ص ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸

اصولوں اور روایتوں کو توڑ دیا گیا ہے جن پر اس کی بنیاد تھی۔ [1]

پھر بھی اس تغیر پذیر دنیا میں جبکہ ہر آن تبدیلی واقع ہو رہی ہے اور نئی نئی ضرورتیں سامنے آرہی ہیں، حالات کے تحت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں ترمیم ضروری تھی۔

ارکان ندوۃ العلماء بھی ہمیشہ اس ضرورت سے آگاہ رہے اور انھوں نے حسب ضرورت متعدد بار نصاب پر نظر ثانی کی اور اپنی ذمہ داری کو پورا کیا۔

مولانا شبلی نعمانی نے نصاب پر از سر نو نظر ڈالی اور اہم تبدیلیاں کیں۔ قرآن مجید کی جانب خاص توجہ دی گئی۔ عربی ادب اور بلاغت کی اہم کتابیں داخل کی گئیں۔ فلسفہ اور علم القرآن کا معیار بلند کیا گیا۔

انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کی کتابیں نصاب میں شامل کی گئیں اور ان علوم و مضامین کو پڑھانے کے لئے مولانا شیر علی، مفتی عبداللہ ٹونکی شیخ محمد طیب مکی، شیخ محمد عرب اور قاضی تلمذ حسین جیسے بلند پایہ اساتذہ فراہم کئے گئے۔ [2]

لیکن زمانہ کبھی کسی ایک حال پر باقی نہیں رہتا۔ ہر آن تغیر۔ اس تبدیلی اور تغیر کو محسوس کرنا اور خاص طور سے نصاب تعلیم کے پس منظر میں بہت ضروری ہے۔

کچھ ہی عرصہ بعد دارالعلوم کے نصاب پر پھر نظر ثانی کی گئی۔ تحریک کے ذمہ دار حضرات نصاب کو ہمیشہ تا تاریخ (Up to Date) رکھنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر سید عبدالعلی) کے زمانے میں نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی گئی، عربی زبان کی تعلیم و تدریس کے لئے ڈاکٹر تقی الدین ہلالی المراکشی کی خدمات

---

[1] سید محمد الحسنی، سیرت مولانا محمد علی مونگیری، ص ۱۵۹

[2] سید محمد الحسنی، روداد چمن، ص ۱۵۱

حاصل کی گئیں جو عربی زبان و ادب کے مسلم الثبوت اساتذہ اور ماہرین فن میں سے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ) نے جو اس زمانہ میں شیخ الجامعہ تھے۔ ندوہ میں ٹھہر کر سیاسیات و معاشیات اور انگریزی لٹریچر کی تعلیم کے لئے بڑا اچھا نصاب بنایا۔ سائنس کا بھی ایک درجہ کھولا گیا جس سے طلبار نے فائدہ اٹھایا۔ ڈاکٹر صاحب دراصل یہ چاہتے تھے کہ ندوۃ میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم اس حد تک ہو جائے کہ یہاں کے طالب علم کالجوں اور یونیورسٹیوں کے محتاج نہ رہیں۔[1]

اس مرتبہ اصلاح نصاب کے سلسلہ میں ایک بہت ہی اہم بات یہ ہوئی کہ نیا نصاب خود فرزندان ندوۃ العلمار نے اپنے طور پر تیار کیا جو ایک اچھا نصاب تھا۔

اس نصاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہر سبق فن اور عربی زبان کی صحیح اور ضروری رہنمائی کے ساتھ حشو و زوائد اور فلسفہ و منطق کی آمیزش سے پاک ہے اور عربی کو تحریر و تقریر کی زندہ زبان کی طرح برتنے کی اچھی استعداد پیدا کرتا ہے اس کی ایک اور قابل قدر و لائق تقلید خصوصیت یہ ہے کہ اس نصاب کی کتابیں اس نفسیاتی طریقے پر مرتب ہوئی ہیں جس کے ذریعہ بچوں اور نوجوانوں میں اسلامی حمیت، دینی عزت اور اخلاق حاسنہ پروان چڑھتا ہے اور دل و دماغ میں ایمان و عمل کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔

اس نصاب کی خوبی و کامیابی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے مدارس کے علاوہ عالم عربی و اسلامی کی متعدد تعلیم گاہوں کے نصاب میں شامل ہو چکا ہے۔

اور اس طرح بانیان وارکان ندوۃ العلمار کے ایک دیرینہ خواب اور ندوۃ العلمار کے اولین نصب العین "اصلاح نصاب" کی تکمیل ہوئی ہے۔[2]

---

[1] سید محمد الحسنی، روداد چمن، ص ۱۵۷
[2] مولوی شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلمار حصہ دوم ص ۴۴۵

نئے نصاب کے مطابق تیاری کتب

اب ہم ان چند کتب پر روشنی ڈالیں گے جن کو اس نئے نصاب کے تحت تیار کیا گیا ہے۔

۱۔ مختارات من ادب العرب:

اس کتاب کے مرتب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب ہیں اور وہ اس کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" مجھے سب سے پہلے عربی نثر وادب کے ایسے مجموعہ کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا جو قرون اولیٰ سے لے کر عصر حاضر تک اعلیٰ ادبی نمونوں پر مشتمل ہو، اور جو سجع و قافیہ، تصنع و تکلف سے آزاد، دلی جذبات، صحت مند خیالات اور صالح و آہنگ میں (جس کا مثالی نمونہ " مقامات حریری" ہے) پس وپیش نہ کرے۔ اس بنیادی خیال کی وضاحت کے لئے جو ابتداً میں " مختارات" کی تالیف کا محرک ہوا۔ اور پھر اس کی بنیاد پر " منشورات" (تالیف: مولوی محمد رابع ندوی) اور بعض دوسری کتابیں لکھی گئیں۔[1]

۲۔ القراۃ الراشدۃ:

نئے نصاب کے تحت اس کتاب کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے تین حصوں میں لکھا ہے اس میں زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق اسلامی

---

[1] مولوی شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ دوم، ص ۴۴۵

تعلیمات اور تقریباً وہ تمام باتیں آگئی ہیں جس سے نوجوانوں کی صحیح ذہن سازی اور تعمیر سیرت میں مدد ملتی ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب مصر کی عربی ریڈر "القراۃ الرشیدہ" کے نعم البدل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ قصص النبیین للاطفال:

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے جس طرح "مختارات" نوجوانوں کے لئے اور "القراۃ الراشدہ" چھوٹے لڑکوں کی نفسیات اور ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر تیار کی تھی ٹھیک اس طرح وقت کے تقاضہ کے تحت بچوں اور نوعمروں کے لئے "قصص النبیین" چار حصوں میں تیار کی تاکہ نونہالوں کے ذہن میں اسلامی تعلیمات و حکایات کو آسانی سے بٹھایا جاسکے۔ مندرجہ بالا دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی بہت سے مدارس اسلامیہ کے نصاب میں شامل ہے۔

۴۔ مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی:۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کی یہ کتاب چند سال پہلے منظر عام پر آئی ہے۔ اس میں عصری ذہن کو سامنے رکھ کر قرآن کا بہترین تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے یہ کتاب قرآن کے مطالعہ میں بہترین رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔

الغرض نئے نصاب کو مزید مفید بنانے کے لئے بعض دوسری اہم اور ضروری کتابیں لکھیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

جغرافیہ جزیرۃ العرب:۔

یہ کتاب سید محمد رابع صاحب ندوی نے مرتب کی ہے اور ممالک اسلامیہ

کے جغرافیہ کے ساتھ ساتھ تاریخی و ثقافتی پہلو سے بھی اس میں بحث کی گئی ہے۔

"الفقہ المیسر":۔

اس کے مرتب مولوی شفیق الرحمٰن صاحب ندوی ہیں۔ جنھوں نے نو عمروں کی نفسیات و ذہن کو سامنے رکھ کر عبادت سے متعلق سہل اور مفید انداز میں اس کتاب کو تیار کیا ہے۔

العقیدۃ السنیۃ:۔

مولانا محمد اویس صاحب ندوی نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب "العقیدۃ الحسنۃ" کو اپنے مفید و ضروری تشریحی حواشی کے ساتھ مندرجہ بالا نام سے مرتب کیا ہے۔ [1]

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی صحافتی سرگرمیاں

دوسری تمام تحریکوں کی طرح ندوۃ العلماء نے بھی اپنا ترجمان اردو میں ماہنامہ "الندوہ" نام کا رسالہ علامہ شبلیؒ اور نواب صدر یار جنگ کی ادارت میں نکالنا شروع کیا اس ماہنامہ سے صحافتی دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام پیدا کیا اور تحریک ندوۃ العلماء نے عربی ادب و انتشار پر اپنی توجہ مبذول کی تھی۔ اس کا تقاضا تھا کہ اردو کی طرح عربی میں بھی کوئی رسالہ ان کی ترجمانی کرے تاکہ عالم اسلام میں بھی وسیع پیمانے پر اسلامی فکر و دعوت

---

[1] مولوی شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم ص ۴۵۲

کی اشاعت ہو۔ اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب کے عہد نظامت میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کی ادارت میں مئی ۱۹۳۲ء میں عربی ماہنامہ "الضیاء" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ جو ندوہ کا ترجمان کہلانے کا پورا مستحق تھا۔[۱]

لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر یہ رسالہ بند ہوگیا اور پھر اس کا نعم البدل ماہنامہ "البعث الاسلامی" اکتوبر ۱۹۵۵ء میں مولانا محمد میاں حسنی مرحوم کی ادارت میں سامنے آیا ــــ اور بہت جلد ہی اس نے عربی صحافت میں اپنا اعلیٰ مقام بنالیا۔ عرب قومیت، الحاد و دہریت، تجدد و مغربیت، سرمایہ داری و اشتراکیت اور دوسری خدا فراموش تحریکات کے تعاقب واحتساب اور صحیح اسلامی فکر کی نمائندگی میں اس رسالہ نے جو حصہ لیا، اس کا اعتراف عالم اسلامی اور عالم عربی میں ہر جگہ کیا گیا[۲]

دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعمیرات

دار العلوم میں شعبہ تعمیرات پہلے سے تھا۔ ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب کے زمانہ میں اس کی تنظیم دوبارہ کی گئی۔ اس کا کام ندوۃ العلماء کا تعارف اس کے مقاصد کی اشاعت، سرمایہ کی فراہمی، سفراء اور وفود کی ترتیب ان کے کاموں کی نگرانی اور ان کی علمی واخلاقی رسد رسانی، نیز دار العلوم کے دوسرے تعمیری و ترقیاتی کاموں کی دیکھ بھال ہے۔[۳]

۱؎ مولوی شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم ص ۴۲۲

۲؎ " " " " " " ص ۴۴۴

۳؎ " " " " " ص ۴۲۸

یکم اگست ۱۹۵۸ء کو مولانا محمد معین اللہ صاحب اس شعبہ کے مستقل نگراں مقرر کیے گئے۔ [1]

جنھوں نے اپنی ذمہ داریاں بخوبی ادا کیں۔ شعبہ کے تمام کاموں میں ان کے مددگار کی حیثیت سے مولانا عبد السمیع صاحب ندوی نے بہت سے کام انجام دیئے۔

تعمیر مسجد دار العلوم

ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں ہی دارالعلوم کے احاطے میں ایک بڑی مسجد کی تعمیر کی گئی جس کے چندہ کے لئے مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے بہت کوشش کی اور بڑے حسن و سلوک سے اس کی تعمیر کی نگرانی کی پھر اس کے ساتھ ساتھ شعبہ حفظ بھی قائم ہوا۔ جو اس وقت تک دارالعلوم میں نہیں تھا۔ [2]

پچاسی ۸۵ سالہ جشن تعلیمی

تحریک و دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے قیام کے اول دن سے ہی بہت سے اہم امور انجام دیے ہیں۔ مثلاً یکے بعد دیگرے عربی اردو

---

[1] مولوی شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم ص ۴۲۹

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ص ۴۲۹

ماہناموں "الضیاء" اور "الندوہ" کا اجرار بعد ازاں "البعث الاسلامی" اور پندرہ[۱۵] روزہ "الرائد" کا اجرار جو نہ صرف ہندوستان میں عربی صحافت کا ایک مبارک آغاز تھا بلکہ یہ صحیح اسلامی فکر و دعوت کے نقیب و وکیل اور وقت کے فتنوں کے مقابلہ میں ایک مجاہد کی حیثیت کے حامل ہیں۔ [۱]

اس کے علاوہ ملک کے مختلف اہم مقامات پر دارالعلوم کے پس منظر میں شاندار اجلاسوں کا انعقاد، لیکن پچاسی[۸۵] سالہ جشن تعلیمی ندوۃ العلمار لکھنؤ کی سرگرمیوں میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

اس جشن تعلیمی کا انعقاد ۲۵ تا ۲۸ شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۳۱ اکتوبر تا ۳ نومبر ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلمار لکھنؤ کے وسیع سبزہ زار پر ہوا۔ اس جلسہ کی تحریک ندوۃ العلمار کی مجلس انتظامیہ نے اپنے جلسہ منعقدہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء زیر صدارت مولانا عبد الماجد دریا آبادی مرحوم ایک قرارداد کی صورت میں منظور کی اور ناظم اجلاس کا انتخاب مجلس انتظامیہ کے دوسرے جلسہ منعقدہ ۱۸ اگست ۱۹۷۴ء کو عمل میں آیا۔ مولانا حافظ محمد عمران ندوی رکن انتظامی ندوۃ العلمار و امیر تاج المساجد بھوپال ناظم اجلاس مقرر کئے گئے۔ دفتر اجلاس قائم ہوا۔ ناظم ندوۃ العلمار کی جانب متوجہ کیا گیا۔ اعلان کی طبع شدہ کاپیاں ملک کے تمام علمی دینی، تعلیمی اور ادبی و صحافتی حلقوں کو روانہ کی گئیں۔ بیرون ممالک خاص طور سے پاکستان اور عرب اسلامی ملکوں کی اہم شخصیات سے رابطہ پیدا کیا گیا۔

بعض ایسے کام جن کا براہ راست اس اجلاس سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن ان امور کا اجلاس سے پہلے پورا ہو جانا ضروری تھا مثلاً مسجد کی توسیع بعض

---

[۱] سید محمد الحسنی، روداد چمن ص ۱۵۹

عمارات کی تعمیر اور تکمیل اور علمی و تعلیمی نمائش کی تیاریاں وغیرہ ان پر خصوصی توجہ دی گئی۔ جشن کی مختلف ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے مختلف کمیٹیاں تشکیل کی گئیں۔ ایک موقع پر لکھنؤ کے منتخب اور نمائندہ حضرات کی ایک نشست بھی کی گئی۔

اتنے بہت سے کاموں اور پروگراموں کا انجام پانا بظاہر دشوار نظر آرہا تھا۔ لیکن پرجوش اور مخلص کارکنان کی بدولت، جس میں دارالعلوم کے سب چھوٹے بڑے استاد اور طالب علم اور ہر شعبہ، ہر مرتبہ اور ہر صلاحیت کے لوگ شامل تھے۔ اللہ کے فضل وکرم سے سارے انتظامات مکمل ہو گئے۔

دارالعلوم سے نکلنے والے مجلّات و جرائد، ماہنامہ "البعث الاسلامی" پندرہ روزہ "الرائد" اور اردو پندرہ روزہ "تعمیر حیات" نے خصوصی نمبر شائع کئے۔ اس موقع پر پریس اور حکومت نے بھی تعاون دیا اور اس وقت کے یو پی کے وزیر اعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا نے بہت زیادہ دل چسپی اور تعاون کا مظاہرہ کیا۔[1]

الغرض وہ دن بھی آیا جس کے لئے ساری تیاریاں اور دوڑ دھوپ کی جارہی تھی۔ جمعہ کی نماز کے بعد پہلا اجلاس شروع ہوا۔

ندوۃ العلماء کے اس پلیٹ فارم پر (جہاں تعلیم و تربیت اور فکری اسلامی کے میدان میں سب سے بڑا انقلابی قدم اٹھایا گیا اور جس نے ایک زمانہ میں ملک کے طول و عرض میں زندگی کا صور پھونک دیا تھا) آج نہ صرف ندوۃ العلماء بلکہ ملت اسلامیہ ہند کی وہ سب سے دل آویز فکر انگیز اور ایمان افروز کہانی تحریر کی جارہی تھی جس کے لئے آج پورا

---

[1] محمد الحسنی، روداد چمن ص ۱۷، ۲۳، ۵۶، ۵۷، ۶۲، ۶۳

عالم اسلام گوش بر آواز ہے۔ یہ اسلام سے وفاداری اسلام کے لئے جاں نثاری روح اسلامی کی حفاظت اور مادیت و مغربیت کی طوفانی موجوں میں رہتے ہوئے شعائر دین پر استقامت مزاج نبوت سے فکری و ذوقی مناسبت، علوم نبوت اور دعوت دین کی صحیح ترجمانی اور اشاعت، فکر و عمل کے امتزاج اور دین و دنیا کی جامعیت کی وہ کہانی ہے جس کا سب سے اہم باب عصر جدید میں یہاں لکھا گیا اور نبوت محمدی اور رواں دواں زندگی کی اس مصنوعی خلیج کا کھل کر انکار کیا گیا جو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور علوم دینیہ کے مرکزوں اور دینی تعلیم کے قلعوں کے لئے ایک چیلنج بن چکی تھی۔

اس برصغیر کی تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب علم و فضل اور جمال و کمال کی یہ کہکشاں یہاں دیکھی گئی۔[1]

یہاں دنیائے اسلام کی سب سے قدیم یونیورسٹی الازہر کے وائس چانسلر صدر اجلاس شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کے ساتھ دنیائے اسلام کی سب سے بابرکت یونیورسٹی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، ریاض یونیورسٹی، امام محمد بن سعود یونیورسٹی، جدہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سربراہ یا معزز نمائندگان ایک ساتھ تشریف رکھتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، جامعہ رحمانیہ مونگیر، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعہ سلفیہ بنارس باقیات الصالحات ویلور، دارالسلام عمرآباد، کاشف العلوم اورنگ آباد۔ جامعہ سلفیہ دربھنگہ، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، شمس الہدیٰ پٹنہ۔ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ، دارالعلوم چھاپی، فلاح دارین ترکسیر، مفتاح العلوم مئو،

---

[1] محمد الحسنی، روداد چمن ص ۷۹

دارالعلوم مئو، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ شاہی مراد آباد، مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر، نیپال، مدرسہ نورالاسلام سنسری نیپال، مدرسہ فتح پوری دہلی۔ مظہر العلوم بنارس، مدرسہ حسینیہ راندیر، مدرسہ امدادیہ مراد آباد، حیات العلوم مراد آباد اور دوسرے اہم مدارس عربیہ و مکاتب اسلامیہ کے ذمہ داران و منتظمین علماء و مشائخ، اساتذہ و اصحاب درس اور اہل کمال و اصحاب فضل کی بڑی تعداد اس تاریخ ساز اجلاس میں شریک تھی۔[1]

ان سب کے علاوہ اس جشن تعلیمی میں سعودی عرب، مصر، متحدہ عرب امارات، کویت، قطر، عراق، اردن، بحرین، شام، یوگنڈا، الجزائر، روس، ایران، بنگلہ دیش، مشرقی افریقہ، تھائی لینڈ اور نیپال کے علمی و ثقافتی وفود اور باکمال حضرات نے بھی شرکت فرمائی۔[2]

جشن تعلیمی کے چار روزہ پروگرام میں صبح اور شام سات اجلاس ہوئے۔ تعلیمی وثقافتی نمائش کا افتتاح ہوا اور لائبریری کے لئے نئی تعمیر ہونے والی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

ان اجلاسوں میں مختلف مسائل پر اظہار خیال کیا گیا۔ تعلیمی مسائل، ندوۃ العلماء کی پچاسی سالہ رپورٹ ملت اسلامیہ کا منصب و مقام اور ان کے لئے کرنے کے کام، ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت اور ان کی ذمہ داریاں اور اسلامی ممالک میں نظام تعلیم کی اہمیت وغیرہ۔

آخری دن کے صبح کے اجلاس میں چند تقاریر کے بعد چودہ قراردادیں عربی زبان میں اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کی گئیں۔

---

[1] محمد الحسنی روداد چمن ص ۸۳، ۸۸

[2] " " " "

ان قرار دادوں میں اہم ترین باتیں یہ تھیں :۔۔۔ مغربی سامراج کی تہذیبی اور فکری غلامی اور بالادستی سے مسلمانوں کی مکمل آزادی، تحقیق و تدقیق کا کام کرنے کے لئے ایک علمی اکاڈمی کی تشکیل، عالم اسلام نصاب تعلیم میں ایسی نمایاں تبدیلیاں لائے کہ جو روح شریعت سے ہم آہنگ ہو۔۔۔ ان کوششوں کی مذمت جو بیت المقدس، مسجد اقصیٰ اور فلسطینی قوم کی جائدادوں پر قبضہ کرنے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ حکومت ہندوستان کا اسرائیل سے سفارتی تعلقات نہ قائم کرنے پر شکریہ، لبنان کے مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی ریشہ دوانیوں پر اظہار تشویش، اور آخری قرار داد میں تمام شرکا، اور معاونین کا شکریہ۔ [1]

دار العلوم ندوۃ العلماء کے اس پچاس سالہ جشن تعلیمی کے بارے میں ملک اور بیرون ملک کے اہل الرائے اور اہل نظر حضرات کا یہ احساس ہے کہ یہ جشن کئی اعتبار سے بہت اہم اور مفید تھا۔

---

[1] محمد الحسنی، روداد چمن ص ۲۶۰، ۲۶۵

ندوہ کی بعض اہم اور معروف شخصیات

مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی

مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی یکم دسمبر ۱۸۹۳ء ہنسوہ ضلع فتح پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر رہ کر مختلف علماء سے حاصل کی بعد ازاں دار العلوم ندوۃ العلماء سے دین کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد عصری تعلیم کی جانب توجہ کی اور لکھنؤ کے کرسچن کالج سے ۱۹۲۱ء میں سائنس سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے امتیاز کے ساتھ بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے والد مولانا حکیم سید عبد الحیٔ حسنی ناظم ندوۃ العلماء کے انتقال کے باعث ڈاکٹر صاحب ۲۰ر دسمبر ۱۹۲۳ء کو ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی منتخب ہوئے، اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں نائب ناظم اور ۱۹۳۱ء میں ناظم منتخب ہوئے۔

مولانا سید عبد العلی مسلسل تیس ۳۰ سال تک ندوۃ العلماء کے انتظامات سے وابستہ رہے اور آپ کا دور نظامت ندوۃ العلماء کے لئے ہر طرح ایک کامیاب دور نظامت کہا جاسکتا ہے۔ ۔ر مئی ۱۹۶۱ء کو قلبی عارضہ میں مبتلا ہوکر مولانا کا انتقال ہوا۔

مولانا سید عبدالعلی مرحوم میں بہت سی دوسری علمی صفات و کمالات کے علاوہ ایک بڑی صفت اور زندگی کا جوہر ان کی دینی حمیت، عالم اسلام کی فکر اور دعوت اسلام کا جذبہ اور ذوق تھا۔[1]

مولانا محمد عمران خاں ندوی

مولانا محمد عمران خاں ندوی اپنی انتظامی صلاحیت قوتِ عمل اور ڈسپلن کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلمار کی ایک معروف و ممتاز شخصیت ہیں۔ مولانا دارالعلوم کے عہدہ اہتمام پر تقریباً اٹھارہ ۱۸ سال تک فائز رہے۔ اپنے اس دور میں مولانا موصوف نے ندوۃ العلمار کی مالی ترقی کے لئے بہت سرگرم کوششیں کیں اور اس کے لئے دورے بھی کئے۔

مولوی شمس تبریز خاں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر سید الحبد العلی) کے عہد نظامت کا ایک قابل ذکر پہلو مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی کا دور اہتمام بھی ہے۔

مولانا محمد عمران خاں ندوی ۱۹۴۲ء میں دارالعلوم کے مہتمم مقرر ہوئے اور ۱۹۶۰ء تک اس سے وابستہ رہے پھر اپنے تبلیغی رجحان اور اس میں عملی مشغولیت و مصروفیت کے سبب دارالعلوم سے الگ ہو گئے۔ لیکن دارالعلوم ندوۃ العلمار سے ان کا قلبی تعلق پھر بھی برقرار رہا، اور ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلمار کے پچاسی ۸۵ سال جشن کو کامیاب بنانے میں بھرپور حصہ لیا۔[2]

---

[1] شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلمار حصہ دوم ص ۳۹۲، ۳۹۶، ۴۰۱، ۴۵۴، ۴۵۶

[2] " " " " " ص ۴۴۳، ۴۴۴

علامہ سید سلیمان ندویؒ

علامہ سید سلیمان ندوی ایک باخبر اور صاحب نظر عالم، باکمال مصنف اور داعیٔ دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک متوازن اور معتدل طبیعت کے مالک تھے۔ وہ کتاب وسنت اور مسلک اہل سنت سے انحراف کو سخت ناپسند کرتے تھے، اور اسلام کے جادۂ اعتدال پر ثابت قدمی اور اس سے وفاداری واستواری کو اصل ایمان سمجھتے تھے۔[1]

سید صاحب کی پیدائش ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء میں پٹنہ کے مردم خیز قصبہ دینہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اس کے بعد بہار کے دوسرے شہروں میں انھوں نے تعلیم پائی اور پھر ایک طالب علم کی حیثیت سے ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور اپنی سات سالہ مدت تعلیم کو پورے علمی انہماک کے ساتھ گزار کر ۱۹۰۷ء میں فارغ ہوئے۔[2]

آپ زمانہ طالب علمی ہی میں اپنے وقت کے مشہور علمی رسالہ "الندوہ" کے نائب مدیر اور مدیر رہے۔ جو ایک بڑا اعزاز تھا۔ اس زمانے میں آپ کے علم وقلم کی شہرت کا آغاز ہوا اور آپ نے مغرب اور مادی افکار ونظریات کے رد میں اہم علمی خدمات انجام دیں۔[3]

---

[1] شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم ص ۴۶۵

[2] " " " " " ص ۴۶۶، ۴۶۷

[3] " " " " " ص ۴۶۹

سید صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ کے ناظم بھی رہے آپ نے علامہ شبلی نعمانی اور دار المصنفین کے ایک بڑے کارنامے "سیرۃ النبی" کی تکمیل کی یہ کتاب ادارہ کے مالی استحکام کے لئے ایک بڑا سبب ثابت ہوئی۔

نواب سید علی حسن خاں کے دور نظامت میں علامہ سلیمان ندوی، ندوۃ العلمار میں معتمد تعلیم منتخب ہوئے اور انھوں نے ایک بیدار مغز اور وسیع المطالعہ عالم دین اور ماہر تعلیم کی طرح ندوۃ العلمار کی تعلیمی و تعمیری مقاصد کی تکمیل و تحصیل میں سرگرم حصہ لیا۔ اس کے نصاب و نظام تعلیم کی تجدید کی اور عصری تقاضوں کے پیش نظر مفید اضافے کئے اس کا نیا دستور العمل اور آئین بنایا اور اس کے مختلف شعبوں کی ترقی و استحکام میں سرگرم حصہ لیا۔[1]

غرض سید سلیمان ندوی کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ سراپا علم تھے، علم سے ان کی زندگی کا کوئی پہلو خالی نہ تھا۔ جو ایک حقیقی عالم اور مثالی مسلمان کی پہچان ہے۔[2]

اہم تصنیفات:

۱۔ تاریخ ارض القرآن ۲۔ سیرت نبیؐ ۳۔ سیرت عائشہؓ
۴۔ نقوش سلیمانی۔

---

[1] شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلمار حصہ دوم ص ۷۷،۴۴

[2] " " " ص ۴۶۳

مولانا عبدالسلام ندوی

مولانا عبدالسلام ندوی ایک اچھے انشا پرداز، بلند پایہ عالم اور فلسفی مزاج مصنف تھے۔ ان کے رشحات قلم نے علم و ادب کے مختلف شعبوں کو سیراب کیا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی ۱۸۸۲ء کو علماء الدین نامی گاؤں، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد کانپور، آگرہ اور مدرسہ چشمہ رحمت (غازی پور) میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی۔ پھر ۱۹۰۶ء میں بہ حیثیت طالب علم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور فارغ ہوکر ۱۹۱۰ء میں وہیں عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے۔

مولانا عبدالسلام صاحب تا حیات تصنیف و تالیف میں لگے رہے اور جب ۴؍ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے اپنی بہت سی تصانیف چھوڑیں جن میں سے چند مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں۔

۱۔ اسوۂ صحابہؓ (دو جلدیں)
۲۔ اسوۂ صحابیاتؓ
۳۔ سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ
۴۔ تاریخ اخلاق اسلامی
۵۔ تاریخ فقہ اسلامی
۶۔ شعرالہند (دو جلدیں)
۷۔ حکمائے اسلام (دو جلدیں)

۸۔ ابن خلدون
۹۔ اقبال کامل
۱۰۔ امام رازی
۱۱۔ انقلاب الامم [1]

شاہ معین الدین ندوی مولانا عبدالسلام ندوی کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کرتے ہیں کہ ـــــ

"ادب و انشا میں وہ نہایت ممتاز تھے اور علامہ شبلی کی یہ روایت ان کے حصہ میں زیادہ آئی تھی۔ چمنستان ادب میں ان کا قلم بڑا سبک خرام تھا۔ ذہن بڑا اخاذ پایا تھا۔ سرسری مطالعہ سے کتابوں کا جوہر کھینچ لیتے تھے۔" [2]

ڈاکٹر خورشید نعمانی مولانا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ـــــ

"انگریزی ادب کے مصنفین میں ان کا مقابلہ گولڈ اسمتھ سے کیا جا سکتا ہے اور یہ قول کہ ـــــ He writes like an angel and speaks like a poor paul.
بالکل صادق آتا ہے

مجھے مولانا کی خدمت میں رہنے کا شرف تقریباً دس سال رہا اور میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی جیسی معصوم شخصیت اور نیک سیرت کا انسان مشکل سے ملے گا۔" [3]

---

[1] ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات ص ۵۳، ۵۴

[2] " " " " " " " " ص ۵۶

[3] " " " " " " " " ص ۵۷

مولانا مسعود علی ندوی

مولانا مسعود علی ندوی اپنی انتظامی صلاحیت اور حسن تدبیر کے لئے بہت ممتاز تھے۔

شاہ معین الدین ندوی اپنی کتاب "حیات سلیمان" میں مولانا مسعود علی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ———

"دارالمصنفین کو پروان چڑھانے میں دونوں (سید سلیمان ندوی اور مسعود علی ندوی) کا حصہ ہے سید صاحب اگر اس کی روح تھے تو مولانا مسعود علی صاحب جسم، سید صاحب کی ذات سے ہند اور بیرون ہند میں دارالمصنفین کی علمی شہرت ہوئی تو مولانا مسعود علی ندوی نے اس کا مقامی وقار قائم کیا اور اس کے انتظامی امور کو سنبھالا۔" [۱]

مولانا کو قومی اور ملی امور میں بھی بہت دلچسپی تھی۔ جمعیت العلماء ہند، مجلس خلافت اور کانگریس کے جلسوں میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے قومی کارکنوں اور سیاسی لیڈروں سے ان کے بڑے گہرے اور دوستانہ تعلقات تھے۔

الغرض آپ کا علمی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں میں زندگی بسر کرتے ہوئے آخری وقت آگیا اور ۲۰ / اگست ۱۹۶۷ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ [۲]

۱؎ ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات ص ۵۰

۲؎ " " " " ص ۵۰

مولانا اکرام اللہ خاں ندوی

مولانا اکرام اللہ خاں ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ان فضلاء میں سے تھے جنھیں علم و ادب کا خاص ذوق حاصل تھا اور جنھوں نے علامہ شبلی نعمانی کی صحبت میں رہ کر تربیت حاصل کی تھی ۔

مؤلف تاریخ ندوۃ العلماء لکھتے ہیں کہ ـــــ

"مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی، مطیع اللہ خاں صاحب شاہ جہاں پوری کے فرزند تھے اور ۱۹۱۳ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے ۔ عرصہ تک دفتر ندوۃ العلماء سے منسلک رہے ڈھائی سال (جولائی ۱۹۱۴ء دسمبر ۱۹۱۶ء تک) "الندوہ" کے ایڈیٹر رہے ۔ ۱۹۱۵ء میں طلباء قدیم کی طرف سے ندوہ کی مجلس انتظامی کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۴۸ء سے آخر عمر تک براہ راست رکن انتظامی منتخب ہوتے رہے اور ۱۶ جنوری ۱۹۵۴ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا ۔" [۱]

نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا اکرام اللہ خاں کے بارے میں اپنے تاثرات و جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ـــــ

"محنت و انہماک کے ساتھ مولوی صاحب کی نظر بالغ ہے تحریر بلیغ، مورخانہ واضح، مسلسل اور فضول نویس سے پاک

---

[۱] ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات، ص ۵۸

ہے۔ ان کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ صدہا صفحے پڑھیں، نگاہ کو
ثابت قدم رکھیں، کار آمد باتیں اخذ کرلیں اور بیکار باتوں
سے متاثر نہ ہوں۔" ۱؎

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی انتہائی نیک طبیعت انسان تھے
دنیاوی نام ونمود اور شہرت سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے لیکن اس کے باوجود
اللہ ربّ العزت نے ان پر بڑا کرم فرمایا تھا۔
شاہ صاحب کی پیدائش ۱۹۰۳ء کو ردولی میں ہوئی ابتدائی تعلیم اپنے
نانا شاہ شرف الدین سے حاصل کرکے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا
یہاں سے فارغ ہوئے تو علاّمہ سید سلیمان ندوی کی خواہش پر ۱۹۲۴ء
میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہو گئے اور پچاس۵۰ سال سے زیادہ
اس ادارہ کی خدمت انجام دی۔ ۲؎
یوں تو مولانا شاہ معین الدین صاحب تاریخ و ادب کے شہ سوار
تھے اور زیادہ تر اسی میدان میں اپنے شہ سواری کے جوہر دکھاتے رہے
لیکن انھوں نے اس سے الگ بھی کچھ لکھا ہے۔ وہ بھی ان کی علمی اور تحقیقی
بصیرت کا بہترین نمونہ ہے۔
شاہ معین الدین احمد ندوی کی بعض مشہور تصانیف یہ ہیں۔

۱؎ مقدمہ وقار حیات ص ۷ بحوالہ شمس تبریز خاں تاریخ ندوۃ العلماء حصّہ دوم ص ۴۹۴
۲؎ ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولی، دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات ص ۶۰، ۶۱

۱۔ تاریخ اسلام (چار جلدیں)
۲۔ سیرت الصحابہ (جلد ششم و ہفتم)
۳۔ مہاجرین (جلد اوّل)
۴۔ تابعین
۵۔ دین رحمت
۶۔ حیات سلیمان
۷۔ اسلامی و عربی تمدن
۸۔ ادبی نقوش

اس کے علاوہ شاہ صاحب انجمن ترقی اُردو ہند اور ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے لائف ممبر تھے۔ اور اُردو اکادمی لکھنؤ، جامعہ اُردو علی گڑھ اور مختلف یونیورسٹیوں میں شعبہ مذہبیات و عربی و اسلامک کلچر کے بھی رکن رہے۔

شاہ صاحب کا انتقال ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ہوا، اور اپنے وطن ردولی میں سپرد خاک کیے گئے۔ [1]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جو عام طور سے مولانا علی میاں کے لقب سے مشہور ہیں۔ اس وقت عالم اسلام کی معروف و معزز شخصیت ہیں اور نہ صرف آپ کا، آپ کے بزرگوں کا بھی ندوۃ العلماء سے گہرا تعلق رہا ہے آپ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی ناظم ندوۃ العلماء کے صاحبزادے اور ڈاکٹر

---

[1] ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات ص ۶۲، ۶۳

سید عبدالعلی ناظم ندوۃ العلماء کے چھوٹے بھائی ہیں اور اب آپ خود بھی ایک عرصہ سے ندوۃ العلماء کے ناظم ہیں۔

ندوۃ العلماء کے پچاسیؔ سالہ جشن تعلیمی ۱۹۷۵ء میں مولانا علی میاں صاحب کی دور نظامت میں ہی منعقد ہوا ہے۔ جس کی ملک و بیرون ملک بہت پذیرائی ہوئی۔ اس جشن تعلیمی کے انعقاد کے سلسلہ میں بعض اہل علم اور صاحب نظر حضرات کا احساس ہے ــــــ

"ہندوستان کے مسلمان کچھ دنوں سے جس بے دلی اور بے مقصدی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ آپ (یعنی علی میاں) نے اس تقریب کی غیر معمولی کامیابی سے اسے دور کر دیا ہے اور مسلمان پھر سے حوصلہ مند اور تازہ دم محسوس ہونے لگے ہیں۔" [۱]

مولانا علی میاں صاحب ایک بالغ نظر تاریخ داں، صاحب دل ادیب اور پرجوش مقرر ہیں۔ مولانا اردو کے علاوہ عربی زبان و ادب کے بھی ایک بہترین اور صاحب طرز ادیب ہیں۔ آپ نے اب تک بہت سی اہم ترین کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔

چند اہم اردو تصنیفات:۔

۱۔ تاریخ دعوت و عزیمت (۴ جلدیں)
۲۔ سیرت سید احمد شہید بریلوی
۳۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
۴۔ نبی رحمتؐ
۵۔ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین

۱؎ محمد الحسنی روداد چمن ص ۲۸۴

۶۔ نقوش اقبال
۷۔ پرانے چراغ
۸۔ کاروان زندگی (۴ جلدیں)
۹۔ دستور حیات
۱۰۔ مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
۱۱۔ ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں
۱۲۔ معرکہ ایمان و مادیت
۱۴۔ دریائے کابل سے دریائے یرموک تک وغیرہ

مولانا علی میاں صاحب اپنے علم وعمل، تقدس و پاکیزگی اور سیرت کی بلندی کے باعث اس وقت عالم اسلام میں بڑی قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ملک کے اندر ہندوستانی مسلمانوں کی آبرو بن گئے ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا منصب و مقام

جب بھی کوئی نئی تحریک یا نیا ادارہ وجود میں آتا ہے تو لوگوں کا ردعمل بھی یکساں نہیں ہوتا کسی ایک جانب سے حمایت و معاونت اور داد و تحسین کا معاملہ ہوتا ہے تو دوسری جانب سے مخالفت اور عدم تعاون کی بات سامنے آتی ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سلسلہ میں بھی یہی چیز سامنے آئی ہے اس کو عزت و توقیر کی نظر سے بھی دیکھا گیا اور اس کی مخالفت بھی ہوئی ہے۔

اس کی مخالفت میں ایک خاص مکتب فکر کے لوگ شامل تھے ابتدا میں دبی زبان سے تنقید کی گئی۔ پھر جیسے جیسے دارالعلوم کے کاموں میں اضافہ ہوا، کھل کر تنقید کی جانے لگی اور بات تکفیر تک پہنچ گئی۔

ندوۃ العلماء کی تحریک کا ملک میں مدتوں سے غلغلہ بلند ہے۔ اور ہندوستان سے لے کر عرب اور مصر و شام تک کے علماء کرام نے اس کے اغراض و مقاصد سے اتفاق فرمایا ہے۔ مگر ہر کام خواہ کتنا ہی مناسب اور مستحسن ہو، اس کے مخالف پیدا ہو جاتے ہیں۔ ندوۃ العلماء کی بھی مخالفت شروع ہوئی اور بریلی کے جلسہ سے اس میں کافی شدت پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ شرکار ندوۃ العلمار کی تکفیر کی گئی۔[1]

---

[1] مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلمار حصہ اوّل، ص ۳۱۵

مولانا احمد رضا خاں صاحب کی جانب سے دار العلوم ندوۃ العلماء کی مخالفت اور اس پر تنقید و تبصرہ کے باوجود اس دار العلوم کے اغراض و مقاصد اور بہتر کارکردگی کے سلسلہ میں جس بڑے پیمانے پر اس کی حمایت ہوتی رہی ہے۔ اس حمایت، تعاون اور ملک و بیرون ملک اس کے وجود کو مستحسن قرار دینے سے اس کے مقام و منصب کا تعین ہوتا ہے۔

شیخ الازہر مصر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود نے جشن تعلیمی کے موقع پر اپنے خطبہ صدارت میں دار العلوم کی مساعی کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

> "اللہ تعالیٰ نے ندوۃ العلماء کو آغاز ہی سے اس کے پروگرام اور مقاصد میں اس کی جد و جہد اور مساعی میں برکت و توفیق عطا فرمائی ہے اور اس کو اس حیرت انگیز نتائج تک پہنچایا ہے کہ اس نے ہر میدان میں ممتاز اور بے نظیر شخصیتیں پیدا کیں، اس نے محدثین پیدا کئے، فقہاء بھی اس درس گاہ سے تیار ہو کر نکلے۔ کتاب اللہ کے عالم و مفسر بھی یہاں تیار ہوئے۔ غرض علوم اسلامیہ کے ہر شعبہ میں یہ ادارہ برگ و بار لایا۔
>
> آج پورا عالم اسلام ندوہ کی قابل تحسین و آفرین مساعی کا احساس رکھتا ہے اور ان کوششوں و خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو یہاں انجام دی جا رہی ہیں اور راہ خدا میں ہر طرح کی کوشش کر رہے ہیں۔" [1]

---

[1] محمد الحسنی، روداد چمن ص ۱۲۴

وائس چانسلر قطر یونیورسٹی اور صاحب فکر عالم یوسف القرضاوی دارالعلوم کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ایک زمانے میں ہم لوگ ندوی کو خاندانی نسبت سمجھتے تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے جب قاہرہ میں (۱۹۵۱ء) میں ہمارا تعارف ہوا۔ ہم لوگ طالب علم تھے اور وہ اپنی تازہ تصنیف 'ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین' کے ذریعہ اچھی طرح روشناس ہو چکے تھے۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ یہ ایک درس گاہ کی نسبت ہے جس کا شہرہ آج ساری دنیا میں ہے۔" [۱]

تحریک ندوۃ العلمار اپنے نصاب تعلیم اور دارالعلوم ندوۃ العلمار اپنے نظام تعلیم کی وجہ سے بہت معروف رہے ہیں اور اس سلسلہ میں اس تحریک اور دارالعلوم کی منفرد حیثیت رہی ہے اور اس باعث اس دانش گاہ سے بہت سی نادر روزگار شخصیات تیار ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر احتشام احمد ندوی لکھتے ہیں۔

"ندوہ نے سب سے پہلے نصاب تعلیم بدلا۔ جدید عربی علوم اسلامیہ کی نئی کتابوں کو درس میں شامل کیا اور ان فرسودہ کتابوں جو منطق اور فلسفہ قدیم سے متعلق تھیں۔ نصاب سے خارج کر دیا۔ انگریزی زبان، معاشیات اور سیاسیات کے مضامین نصاب میں داخل کئے اس طرح ندوہ نے روشن خیال علمار کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا۔ جس نے آگے چل کر ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تعمیری مقاصد کا اسلامی لٹریچر عطا کیا۔" [۲]

---

[۱] محمد الحسنی، روداد چمن ص ۱۹۶

[۲] ڈاکٹر احتشام احمد ندوی، عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں ص ۱۵۱

ڈاکٹر احتشام صاحب ندوی مزید لکھتے ہیں ـــــ

"اردو ادب میں بھی علمائے ندوہ کا حصہ دوسرے تمام اداروں اور تعلیم گاہوں سے زیادہ ہے۔ "الہلال" جیسا انقلاب انگیز رسالہ بھی ندوہ کی دین ہے کیوں کہ اس کے اسٹاف میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی وغیرہ ندوہ ہی کے تعلیم یافتہ تھے۔ خود مولانا ابوالکلام آزاد ندوی ثقافت کے حامل تھے۔ پھر "معارف" اور "صدق جدید" بھی ندوہ سے متعلق ہیں۔ بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی ندوہ کے علماء ایک مخصوص طرز تحریر کے مالک ہوتے ہیں جن کو وہ "ندوی العلم" اور "ندوی الفکر" کہا کرتے تھے۔" [1]

جناب شیخ صادق حسن بیرسٹرایٹ لا دارالعلوم کے نئے نصاب کے بہتر نتائج کے ذیل میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

"میں دلی مسرت کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ ندوی سند یافتہ طلباء نے اپنی قابلیت اور اپنے طرز عمل سے نہ صرف ندوہ کے وقار کو چار چاند لگا دئے ہیں بلکہ اپنی اعلیٰ ترین لیاقت سے علمائے کرام کے احترام و اعتبار کا پایہ بھی بہت بلند کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی روشن خیال اور رواداری کی وجہ سے کسی فرقہ کے ساتھ جزوی اختلاف، ملی مناقشات کی بنا پر کوئی بے جا پرخاش نہیں کی۔" [2]

---

[1] ڈاکٹر احتشام احمد ندوی، عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں ص ۱۵۶

[2] شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ دوم ص ۳۵۵

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سند یافتہ حضرات ملت کے لئے کیسا گراں مایہ سرمایہ بنتے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی تحریر کرتے ہیں :-

"تاہم یہ بتلایا جاسکتا ہے کہ ـــــ ملک کے مختلف حصص میں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کے وجود کے آثار و منافع (کس قدر) محسوس ہو رہے ہیں۔ مولوی شبلی صاحب اور مولوی عبدالرحمٰن صاحب سرائے میر ضلع اعظم گڑھ کے مدرسہ عربی میں دو سَو طلباء کو درس دے رہے ہیں۔ مفتی محمد یوسف، مولوی محمد یوسف منطقی، حافظ فضل الرحمٰن اور مولوی عبدالودود خود دارالعلوم میں درس دے رہے ہیں۔ مدرسہ الٰہیات کانپور میں دارالعلوم کے عالم ہیں۔ مولوی عبدالباری پونا کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں، مولوی نجم الہدیٰ بہاری، مولوی قمرالدین صاحب، مولوی سید عبدالمتین دیوی، مولوی سید عبدالحفیظ اور چند دوسرے فارغ طلباء مختلف مقامات کے گورنمنٹ اسکولوں میں ہیڈ مولوی اور سکینڈ مولوی ہیں، مولوی خلیل بن محمد صاحب عربی مدرسہ عالیہ کلکتہ میں فن ادب کے مدرس ہیں، مولوی خواجہ عبدالواجد کلکتہ امپیریل لائبریری میں کام کر رہے ہیں۔" [1]

ان کے علاوہ پروفیسر اجتبا ندوی، صدر شعبہ عربی، الٰہ آباد یونیورسٹی ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی، ریڈر (صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ) ڈاکٹر شفیق احمد خاں ندوی، ریڈر شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر سالم قدوائی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی، ریڈر

---

[1] شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم ص ۲۰۱، ۲۰۲

ریڈر شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر احتشام ندوی، صدر شعبہ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی، پروفیسر عبد الحلیم ندوی، شعبہ عربی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی، شعبہ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر محسن عثمانی، شعبہ ویسٹ ایشین اسٹڈیز جواہر لال نہرو یونیورسٹی، اور بہت سے دیگر فضلاء ندوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں خدمت انجام دے رہے ہیں نیز بیرون ہند میں بھی ندوہ کے ممتاز علماء خدمت علم و دین میں مصروف ہیں۔ مثلاً ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ کے سابق پروفیسر ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی صاحب وغیرہ۔

پھر دار العلوم ندوۃ العلماء کی جانب سے ۱۹۷۵ء میں پچاسی[۸۵] سالہ جشن کا انعقاد خود ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے جس بڑے پیمانے پر یہ پروگرام ہوا اور اس میں ملک و بیرون ملک کی سیکڑوں اہم ترین شخصیات نے شرکت کی، اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور دار العلوم کی کوششوں کو مستحسن قرار دیا۔

اس سلسلہ میں بہت سے آراء اور تاثرات میں سے چند یہ ہیں۔

کویت کے موقر ہفتہ وار " البلاغ " کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ:

" لکھنؤ پہنچ کر جس چیز نے سب سے زیادہ مجھے متاثر کیا وہ عالم اسلام کی وسیع نمائندگی تھی۔ ندوۃ العلماء کی دعوت کو جس ذوق و شوق سے عالم اسلام نے قبول کیا۔ وہ وفود کی کثرت اور وفود کے حجم و ضخامت دونوں سے عیاں ہے۔ خاص طور پر ممالک اسلامیہ کی تعلیمی وزارتوں کی مکمل نمائندگی تھی۔ اس کانفرنس کو یقیناً ایک کامیاب جشن قرار دیا جا سکتا ہے ـــــ

اور انھوں نے ندوۃ العلماء کو جامعۃ الخیر سے تعبیر کیا ہے اور جلی حروف میں لکھا ہے کہ اس نے اسلام اور مسلمانوں کو بہت

کچھ دیا ہے۔" [1]

شیخ ابراہیم شقرہ (وزارت اوقاف شرق اردن) نے اُردن کے مشہور اخبار "الدستور" میں لکھا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا جشن تھا۔ جس میں بیرون نمائندوں کے سوا بہت بڑی تعداد میں مسلمان شریک ہوئے۔ اس کے (جہاں تک میں سمجھتا ہوں) دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ ندوۃ العلماء کے اہم تعلیمی تجربات سے عالم اسلام کو روشناس کرایا جائے۔ دوسرے یہ کہ تعلیمی میدان میں ان کے تجربات سے جہاں تک ہوسکے فائدہ اٹھایا جائے۔

شیخ عبدالمعز عبدالستار نگراں امور شرعیہ وزارت اوقاف حکومت قطر نے اپنے مکتوب میں اپنے تاثرات بہت تفصیل سے تحریر کئے ہیں۔ وہ جشن تعلیمی کو بہت زیادہ خیر و برکت کا سبب قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ کا آپ پر بڑا احسان و کرم ہے کہ آپ نے تعلیم و تربیت کے میدان میں اتنا کامیاب تجربہ کیا ــــ اور آپ نے اس ادارہ کا جو معیار قائم کیا ہے اور جو فضلاء یہاں تیار ہوئے ہیں وہ ایک ایسا سرمایہ ہیں جس سے پورے عالم اسلام کے ماہرین تعلیم و تربیت کو فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ [2]

الغرض ان سارے حقائق کی موجودگی میں یہ بات پوری طرح سے واضح ہوجاتی ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء یقیناً ایک بلند منصب اور مقام پر فائز ہے۔

---

[1] محمد الحسنی ، روداد چمن ص ۲۸۵

[2] ایضـــاً ص ۲۸۸

باب ششم

اسلامی تحریکوں کے مسلم معاشرے پر اثرات کا جائزہ

اسلامی تحریکوں کا ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی زندگی پر اثر

اس سے پہلے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی پر اسلامی تحریکوں کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان حالات سے آگاہی حاصل کرلی جائے کہ ان اسلامی تحریکوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہندوستانی مسلمان جن حالات سے دوچار تھے اور جو ناگفتہ بہ حالات ان اسلامی تحریکوں کے احیار اور قیام کا سبب بنے۔

ایران کی فتح کے موقع پر اسلامی فوجوں کے سپہ سالار حضرت عمرو بن العاص نے اپنی فوجوں کو مشورہ دیا تھا۔

"تم ہمیشہ اس بات کو یاد رکھنا کہ تم محاذ جنگ پر ہو، اور اسلامی سرحد کے محافظ ہو۔ اس لئے کہ دشمنوں کے دل ابھی تمہارے خیال سے خالی نہیں ہوئے ہیں۔"

اسلامی سپہ سالار کا یہ ایک ایسا مشورہ اور نصیحت ہے جس میں قوموں کی زندگی اور اس کی بقا مضمر ہے۔ مسلمان جب تک اس اصول یا

مشورہ پر عامل رہے۔ ان میں بھی زندگی اور اس کی ساری توانائی باقی رہی اور جب اس نصیحت سے کنارہ کشی اختیار کی تو پھر زوال انحطاط اور ذلت و پستی ان کا مقدر بن گئی۔

تیرھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے مسلمان کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار تھے۔ سیاسی زوال کے علاوہ دینی، اخلاقی اور تہذیبی زوال بھی ان پر پوری طرح مسلط ہو چکا تھا۔

محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:

ملک میں مسلمانوں کی اخلاقی حالت، اتنی گر چکی تھی کہ فسق و معصیت کی بہت سی باتیں آداب و تہذیب میں داخل ہو گئی تھیں اور اس پر علانیہ فخر کیا جاتا تھا۔ شراب نوشی کوئی نہ روا بات نہ تھی، ارباب نشاط کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ امراء اور متوسط طبقہ سے لے کر غربا تک اسی معاشرت کا شکار تھے۔ اخلاقی انحطاط اور قومی بے حسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کہ تیرھویں صدی کے آغاز میں انگریزوں کے قدم ابھی پوری طرح جمے نہ تھے۔ متعدد عورتیں یورپین تاجروں اور حکام کے گھروں میں تھیں۔ شرک و بدعت مسلمانوں میں کثرت سے موجود تھی، قبروں اور مُردوں سے متعلق ایک مستقل شریعت وجود میں آ گئی تھی۔ بزرگان دین سے متعلق وہ سارے عقائد و خیالات دلوں میں گھر کر چکے تھے جن کے لئے نصرانی، یہودی اور عرب مشرکین بدنام ہیں۔ ہندوؤں اور شیعوں کے بکثرت رسوم اہل سنت کے معاشرہ کا جز بن گئے تھے۔ سنت و شریعت کو لوگ بھولتے جا رہے تھے۔ اسلامی شعائر اٹھتے جا رہے تھے۔

اچھے اچھے دین دار اور علمی گھرانوں میں قرآن وحدیث کے احکام کا لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ نکاح، میراث میں لڑکیوں کو حصہ دینا اور سلام مسنون کو بہت جگہ معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح حج جیسے اسلام کے اہم رکن کی، راستہ کی تکلیف اور بدامنی کی بنا پر فرضیت ساقط کردی گئی تھی۔

قرآن شریف ایک چیستاں سمجھا جانے لگا تھا۔ جس کا سمجھنا اور سمجھانا، اس پر غور وتدبر کرنا غیر علماء کے لئے ناممکن اور 'شجرِ ممنوع' قرار دے دیا گیا تھا۔" [1]

ہندوستان کے زوال پذیر مسلمانوں پر آخری ضرب ۱۸۵۷ء میں انقلاب کی ناکامی سے لگی۔ اس ناکامی نے ان کی ہمتوں کو پست کر دیا۔ دلوں میں مایوسی اور ذہنوں پر احساس ذلت کی تاریک گھٹائیں چھا گئیں اور قومی خودداری کا نام ونشان نہیں رہا۔

ایسے بدترین اور روح فرسا حالات میں اسلامی تحریکوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ۱۸۶۶ء میں تحریک دارالعلوم دیوبند اور ۱۸۹۲ء میں تحریک ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۱۹ء میں جمعیت علماء اور ۱۹۳۴ء میں تبلیغی جماعت وجود میں آئیں اور ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی ہند کی داغ بیل پڑی۔

---

[1] مولانا علی میاں ندوی، جب ایمان کی بہار آئی۔ مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ ص ۱۲

اسلامی تحریکوں کی ہندوستانی مسلمانوں میں مقبولیت

یہ ایک فطری امر ہے کہ کوئی چیز کتنی بھی سود مند اور فوز و فلاح کا باعث کیوں نہ ہو، انسانی مزاج کا خاصّہ ہے کہ کسی نہ کسی جانب سے اور کسی نہ کسی پہلو سے اس کی مخالفت ضرور ہوا کرتی ہے۔ خاص طور پر دینی تحریک اور دینی دعوت کا معاملہ ہر زمانہ میں بڑا عجیب و غریب رہا ہے پھر بھی یہ بات پورے یقین و اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ ان اسلامی تحریکوں کو اپنے اپنے وقت میں مسلم عوام کے درمیان قابل لحاظ مقبولیت حاصل رہی ہے اور اس باعث ان تحریکوں کو عوام کا خاصا تعاون اور حمایت ملی ہے۔

تحریک دارالعلوم دیوبند :

ہندوستان کی یہ پہلی دینی درس گاہ ہے جو حکومت وقت کے مالی تعاون، نوابوں اور جاگیرداروں کی سرپرستی اور اوقاف کے سہارے چلنے کے بجائے صرف عوام کے چندے اور اعانت سے قائم ہوئی اور اس کے سہارے ترقی کی منزلیں طے کیں۔

آج سے سوا سو ۱۲۵ سال پہلے بلا شبہ یہ ایک عجیب و غریب اور نئی بات تھی کہ عوامی چندے کی بنیاد پر ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جو حکومت کے اثرات سے آزاد ہو ۔۔۔۔ اور اب جبکہ بڑی بڑی ریاستیں خواب و خیال بن چکی ہیں اور زمینداریاں ختم ہو گئی ہیں۔ مگر کشمیر سے آسام تک ہزاروں دینی مدرسے (عوام کے چندے) سے چل رہے ہیں۔ [1]

دارالعلوم دیوبند کی تحریک کو مسلمان عوام نے نہ صرف اپنے بھرپور مالی تعاون سے نوازا بلکہ اپنی نوخیز نسل کو بھی اس کے دامن میں لاکر ڈال دیا۔

چنانچہ دارالعلوم نے قائم ہوتے ہی حیرت انگیز طور پر ترقی کی جانب قدم بڑھانا شروع کر دیا، قرب و جوار کے علاوہ دور دراز مقامات بنارس پنجاب اور افغانستان سے طلبارِ علم آنا شروع ہو گئے اور چند ہی دنوں میں یہ معمولی مدرسہ ایک اقامتی درسگاہ میں تبدیل ہو گیا۔ مدرسین میں بھی اضافہ کیا گیا۔ [2]

دارالعلوم دیوبند کی پہلے سال کی روداد میں لکھا ہے کہ :

"الحمد للہ کہ ۱۲۸۳ھ بخیریت تمام ہوا۔ یہ وہ مبارک سال ہے جس میں بنارِ مدرسہ عربی دیوبند قائم ہوئی اور اس عرصہ قلیل میں اتنی رونق پکڑی کہ ہرگز امید نہ تھی، ابتداء میں خیال بھی نہ آتا تھا کہ اس قدر طلبار جمع ہوں گے، چندہ اور خرچ اتنا ہو جاوے گا۔ جمعیت چند تو درکنار لوگوں

---

[1] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اوّل ص ۱۵۱، ۱۵۲

[2] " " " " " ص ۱۵۷، ۱۵۸

کو تامل تھا کہ پڑھنے والے عربی کہاں سے آئیں گے ــــ مگر عنایت الہٰی سے بغور شروع ہونے کے طالب علم اطراف و جوانب سے اور ممالک دور دراز سے ایسے جمع ہو گئے کہ گویا منتظر بیٹھے تھے ـــــ اور شرکاء چندہ نقد نے نہایت خوشی اور اخلاص سے چندہ ۱۲۸۳ء پیشگی دیا اور چندہ سال آئندہ بکمال کشادہ پیشانی دے رہے ہیں اور جن سے چندہ ہنوز ادا نہیں ہوا ان کو روز و شب فکر ادا ہے۔ [1]

دارالعلوم دیوبند کی مسلم عوام میں مقبولیت کے سلسلہ میں ۱۹۴۷ء کے بعد مسلم عوام کی اعانت کا ایک واقعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد کچھ خاص اسباب کی بنا پر دارالعلوم نے اپنے آمد و خرچ کو متوازن رکھنے کے لئے ایک نئی اسکیم کا آغاز کیا اور وہ یہ کہ قرب و جوار کے مسلمان کاشتکاروں اور زمین داروں کا ایک نمائندہ اجتماع بلا کر ان کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی کہ دارالعلوم کی ایک سال کی ضرورت کے لئے پانچ ہزار من غلہ کی فراہمی اُن کی جانب سے ہونا چاہیئے۔

چنانچہ اس تجویز پر عمل شروع کر دیا گیا اور باوجود یہ کہ پہلے سے کام کا تجربہ نہ تھا۔ ادھر فصل کٹنے کا زمانہ ٹھیک رمضان المبارک کا مہینہ تھا مگر اس کے باوجود ساڑھے تین ہزار من غلہ فراہم ہو گیا۔ اس سے دارالعلوم کو اس نازک اور ہوش رُبا گرانی کے دور میں بڑی تقویت پہنچی۔ [2]

---

[1] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اوّل ص ۱۵۸

[2] " " " " " ص ۳۴۴

اب ایک صدی گزر جانے پر بھی جبکہ دارالعلوم کا بجٹ تیس[۳۰] لاکھ روپے سالانہ ہے، محض اللہ کے توکل اور عوام کے چندہ سے چل رہا ہے[۱]۔

تحریک ندوۃ العلماء:۔

تحریک ندوۃ العلماء کے قیام سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کے دو تعلیمی ادارے علی گڑھ اینگلو اورینٹل کالج (موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) عصری تعلیم کا ادارہ، اور دارالعلوم دیوبند دینی تعلیم کا ادارہ وجود میں آچکے تھے اور روز افزاں ترقی پر تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دارالعلوم دیوبند دونوں ہی کو مسلم عوام کا تعاون اور حمایت بھی حاصل تھی۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ قدم قدم پر قدیم و جدید کی کش مکش بھی تھی۔ مسلمان آپس میں قدیم وجدید دو واضح طبقوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک سرے پر وہ طبقہ تھا جس نے ہر ناجائز کو جائز کر رکھا تھا۔

چنانچہ اس کش مکش سے بچنے اور چند دوسرے اسباب کی بنا پر جیسے ہی تحریک ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا مسلم عوام وخواص نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

طبقہ علماء کی خاصی تعداد نے اس تحریک وتجویز کی تائید کی اور اسے ایک انقلابی قدم سے تعبیر کیا۔[۲]

اور جب اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہوا تو ——— اس نے تحریک ندوۃ العلماء سے زیادہ (عوام وخواص میں) شہرت ومقبولیت حاصل کر لی۔

---

[۱] مولانا محمد اسلام قاسمی، دارالعلوم دیوبند کی ایک صدی کا علمی سفرنامہ ص ۶۹

[۲] مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اوّل ص ۱۴۰

یہی وجہ تھی جب ملک کے مختلف مقامات پر تحریک اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعارف کے لئے بڑے پیمانے پر عوامی اجتماعات کئے جاتے تو اجتماعات ہمیشہ مسلم عوام کے تعاون و شرکت کا ایک مثالی نمونہ ہوتے۔ مسلمان تحریک ندوۃ العلماء سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ان جلسوں میں شرکت بھی کرتے اور بھرپور مالی تعاون سے بھی نوازتے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ۱۹۷۵ء میں پچاسی سالہ جشن تعلیمی کا انعقاد مسلمانوں کے تعاون اور اس تحریک کی مقبولیت کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

جمعیۃ العلماء ہند :

جمعیۃ علمائے ہند اگرچہ علماء کی جماعت ہے لیکن تحریک دارالعلوم دیوبند کی بنیاد اور اس کے نظریات پر قائم ہوئی ہے اور اس جماعت نے ہندوستان کے مسلمانوں کے تعاون سے ہی اپنی تمام سرگرمیوں کو ہمیشہ جاری رکھا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے ہندوستان کے مسلمانوں کے ایمان واخلاق کو تباہ ہونے سے بچانے کے لئے نہ صرف بہت زیادہ جدوجہد کی ہے بلکہ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور ان کی معاشی حالت درست رکھنے کے لئے بھی کام کیا ہے۔

مسلم معاشرہ کی اصلاح کے لئے ہر بستی اور ہر محلہ میں اصلاحی کمیٹیاں قائم کر کے مسلم عوام کو دین کی طرف متوجہ کیا، نماز، روزہ کے علاوہ آپس میں سلام کا رواج صورت وسیرت کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی ترغیب دی اور گھروں میں دینی ماحول قائم کرنے کے لئے پوری پوری توجہ دلائی اور اصلاحی جلسوں کا انعقاد بھی کیا۔

مسلمانوں کی معاشی حالت درست کرنے کے سلسلہ میں مسلم فنڈ اور امدادی فنڈ کے نام سے جگہ جگہ کمیٹیاں قائم کرائیں، گھریلو دستکاریوں اور چھوٹی صنعتوں کے قائم کرنے اور چلانے کا ایک رواج پیدا کیا۔

ان ساری کوششوں اور جدوجہد کے نتیجے میں مسلم عوام کا تعاون بھی حاصل ہوا اور مقبولیت بھی ملی۔

تبلیغی جماعت :

مندرجہ بالا تحریکوں اور جماعت علماء کے مقابلہ میں تبلیغی جماعت کو مسلم عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور اگر دیکھا جائے تو صحیح معنی میں تبلیغی تحریک، عوامی دینی تحریک ہے۔

مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے مسلم عوام کی اصلاح کے لئے دینی مکاتب کو زیادہ سودمند نہ سمجھتے ہوئے اور فتنۂ ارتداد سے بچانے کے لئے پہلی بار علماءِ دین کے بجائے مسلم عوام کو دین کی تبلیغ کے کام پر لگایا، اور ابتدا میں ایک ایسی اُجڈ قوم سے یہ کام لیا جو اس وقت صرف نام کی مسلمان رہ گئی تھی لیکن ابتدا ہی میں مولانا الیاس صاحبؒ کی کوششوں سے عوام نے جو تبلیغ دین کا کام شروع کیا تو چند ہی دنوں میں یہ حالت ہوگئی۔

میواتیوں کی کثیر تعداد آپؒ (مولانا الیاس صاحبؒ) کے ساتھ ہوگئی۔ ان کے قافلے جوق در جوق اپنے علاقوں سے نکل کر نظام الدین، سہارن پور اور دوسرے مقامات کو جانے لگے اور ہفتوں و مہینوں تک ان (میواتیوں) کی زندگیاں دینی تعلیم و تربیت کے سائے میں گزرنے لگیں۔[1]

اب تعاون و مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ لوگ قریہ قریہ بستی بستی شہر در شہر

---

[1] وحیدالدین خاں، تبلیغی تحریک، مکتبہ الرسالہ دہلی ص ۱۳

اور ملکوں ملکوں جاتے ہیں تاکہ دین کے لئے محنت ومشقت کی عادت پڑے اور خود دین سیکھیں اور دوسروں کو دین سکھائیں۔ ان میں بوڑھے بھی ہوتے ہیں۔ جوان اور نوعمر بھی، تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں اور ان پڑھ جاہل بھی، کالج اور یونیورسٹیوں کے طلباء بھی ہوتے ہیں اور دینی مدارس کے طالب علم بھی۔

مولانا وحیدالدین خاں لکھتے ہیں کہ :

"اس طرح بے شمار قافلے آج ساری دنیا میں اپنے قدموں کو دین کی راہ میں گرد آلود کر رہے ہیں۔ شاید چوبیس گھنٹے میں کوئی وقت ایسا نہ ہوگا جبکہ دین کے لئے یہ نقل وحرکت کہیں نہ کہیں جاری نہ ہو۔[1]

غرض مسلم عوام میں تبلیغی جماعت نے جس قدر مقبولیت حاصل کی ہے اس کی مثال اب تک مفقود ہے اور کوئی دوسری تحریک یا جماعت اس معاملہ میں اس کی ہم پلہ نہیں ہے۔

جماعت اسلامی ہند :

جماعت اسلامی ہند پورے دین کی اقامت کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے آئی اور اس نے پہلی بار اسلام کو ایک مکمل نظام کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

فریضہ اقامت دین اور اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ یہ بات ایک عرصہ دراز سے علماء دین ہی نے بھلا رکھی تھی، مسلم عوام اور دوسروں کے لئے تو یہ ایک بالکل اجنبی اور غیر مانوس چیز تھی۔

---

[1] وحیدالدین خاں، تبلیغی تحریک ص ۸

والد محترم وصی اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ ــــــ

" اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے یہ بات غیر مسلموں کو ہی نہیں خود مسلمانوں کو بھی اجنبی اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے اور پھر نہ جانے کیسے کیسے سوالات کئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اسلامی تعلیمات سے عدم واقفیت اور دلچسپی نہ ہونے کے باعث ہوتا ہے ورنہ اس ذیل میں اتنا کچھ ذخیرۂ علم موجود ہے کہ ایسے سوالات کرنے اور اس طرح کے اظہار تعجب کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔" [1]

پھر ایک غیر اسلامی نظام حکومت میں چند عبادتی اور کچھ رسمی امور پر عمل کرنے کی گنجائش تو نکلتی ہے لیکن ایک نظام کے مقابلہ میں دوسرا نظام کبھی بھی برداشت کے قابل نہیں ہوتا۔

لیکن اس سب کے باوجود جماعت اسلامی ہند اور اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اقامت دین کا نعرہ دیا اور اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش کیا تو یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

علمائے دین کے مقابلے میں عام مسلمانوں نے جماعت اسلامی کی اس پکار پر زیادہ بلند آواز سے لبیک کہا۔ جماعت اسلامی ہند کی دین کی دعوت نئی نسل، خاص طور پر کالج اور یونیورسٹیوں کے طلباء کے لئے دل کی آواز بن گئی۔ مسلم عوام نے صدیوں بعد پہلی مرتبہ اس حقیقت سے واقفیت حاصل کی کہ دین صرف علماء کے ہی لئے نہیں بلکہ عام مسلمانوں کے

---

[1] وصی اقبال، اسلامی نظام ایک نظر میں، مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی، ص ۴

لئے بھی ہے۔ امت مسلمہ کے ہر فرد کا دین اسلام سے تعلق ہے۔

تبلیغی جماعت نے ابتدائی مرحلہ کے طور پر صرف عباداتی امور کو مسلم عوام کے سامنے رکھا؛ ور اس میں اس کو قبول عام حاصل ہوا، اور جماعت اسلامی ہند نے اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت میں مسلمانوں کے سامنے رکھا! اور انھوں نے اسے قبول کیا۔

جماعت اسلامی ہند نے دین کی دعوت نہ صرف اپنے اجتماعات میں پیش کی بلکہ بہت بڑی تعداد میں لٹریچر کو بھی اس کا ذریعہ اور وسیلہ بنایا۔

آج نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی جماعت اسلامی کے لٹریچر کو ہر سال لاکھوں کی تعداد میں خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ جو عوام میں مقبولیت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

غرض یہ کہ ان ساری اسلامی تحریکوں نے اپنے اپنے وقت اور اپنے اپنے پہلو سے مسلم عوام میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل کی ہے۔

مذہبی زندگی پر اثرات

وہ ساری اسلامی تحریکیں، جماعتیں اور ادارے جن کے قیام و اجراء کا اوّلین مقصد اسلام کا احیار اور مسلمانوں کے ایمان و عمل کو صحیح سمت عطا کرنا ہو وہ یقینی طور پر اپنے مقصد اور نصب العین کو بروئے کار لانے کے لئے مسلمانوں کی مذہبی زندگی پر اپنے غیر معمولی اثرات مرتب کریں گے۔

چنانچہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے کہ ہندوستان کی ان تمام اسلامی تحریکوں اور جماعتوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی پر نمایاں اور قابل قدر اثرات مرتب کئے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند نے برصغیر کے مسلمانوں کی دینی زندگی میں ان کو ایک ممتاز مقام پر پہنچانے کا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ نہ صرف ایک بین الاقوامی تعلیمی ادارہ ہے بلکہ ذہنی نشوونما، تہذیبی ارتقار اور ملّی حوصلہ مندیوں کا ایک ایسا مرکز بھی ہے جس کے صحیح علم اور بلند کردار پر مسلمانوں کو ہمیشہ بھروسہ اور فخر رہا ہے۔[1]

دارالعلوم دیوبند کے علمار کی تبلیغی اور اصلاحی کوششوں سے ملک کے گوشے گوشے میں آباد مسلمانوں کی زندگیوں میں سے بدعات اور غلط رسم و رواج کا خاتمہ ہوا ہے اور عقائد درست ہوئے ہیں۔

کلکتہ، کا ایک موقر روزنامہ "عصر جدید" لکھتا ہے کہ :

"دارالعلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے اور مغربی تہذیب و تمدن کے

---

[1] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، حصہ اوّل - ص ۳۴۰

سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامی ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے اور اس کی روحانیت کی کشش کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف پشاور اور رنگون بلکہ قفقاز، موصل بخارا اور اسلامی دنیا کے ہر حصے سے فدائیان قرآن وحدیث، آآکر پروانہ وار اس کے گرد مجتمع ہوتے ہیں۔ ؎۱

دارالعلوم دیوبند نے قرآن و حدیث سے مسلمانوں کو از سرِ نو وابستہ کرکے اور مسلمانوں میں ان دونوں، دین کی اصل بنیادوں سے شغف پیدا کرا کر ہندوستانی مسلمانوں کی زندگیوں کو توہم پرستی اور شرک و بدعت سے پاک کیا۔ ان کے مذہبی جسم میں دین کے عقائد کا گرم اور تازہ خون داخل کیا۔

ظاہر ہے کہ افراد اور جماعتوں کی راہ کا تعین ان کے اپنے افکار و نظریات سے ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث پر مبنی افکار و نظریات یقیناً ذہنوں میں پاکیزگی، زندگیوں میں صلاحیت پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

دارالعلوم دیوبند نے اپنے وقت میں مسلمانوں کی زندگیوں میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دی اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ تحریک دارالعلوم دیوبند نے پہلی بار دین اور دینی تعلیم کے سلسلہ میں دوسروں کی محتاجی کے بجائے مسلمانوں میں خود انحصاری کی صلاحیت پیدا کر دی۔ جس کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر نے بڑی حسرت اور آنکھوں میں آنسو بھر کر فرمایا تھا کہ ــــــ

؎۱ سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول ص ۱۵۲

"سو برس بعد دھکے کھا کر ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں، حیرت ہے کہ یہ بزرگ (بانیانِ تحریک دارالعلوم دیوبند) پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔" [1]

تحریک ندوۃ العلماء نے ایک ہی دین کے ماننے والوں کو باہمی نزاع سے بچانے یعنی اتحاد ملت اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا اپنے مقاصد میں شامل کیا تھا کیونکہ اس وقت مسلمانوں اور ان کے علماء کے باہمی نزاع کی یہ حالت تھی کہ ـــــ

"وہ صلاحیتیں جو (دین کے معاملے میں) زیادہ بہتر خدمت اور اعلیٰ قیادت کا مظاہرہ کرتیں، باہمی اختلاف تکفیر و تفسیق فروعی بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کی نذر ہونے لگی تھیں اور تحریک ندوۃ العلماء کے وجود میں آنے سے پہلے ہندوستان میں نہیں پورا عالم اسلام ایک دنگل کا روپ اختیار کر چکا تھا" [2]

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے تحریک ندوۃ العلماء کی جانب سے ایک منصوبہ بنایا گیا۔ جس کے تحت یہ طے پایا کہ ایسے علماء اور مبلغین پیدا کئے جائیں جن میں سادگی، جفاکشی اور جاں نثاری کے اوصاف ہوں تاکہ مسلمان فروعات میں الجھنے کے بجائے دین کی اصل بنیاد اور روح سے وابستہ ہوں اور ان کے درمیان اخوت اسلامی کے جذبات پیدا ہوں۔

جناب شیخ صادق حسین بیرسٹرایٹ لا نے ندوۃ العلماء کی اس کوشش اور کامیابی کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے۔

"میں دلی مسرت کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ

---

[1] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اوّل ص ۱۵۲

[2] تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اوّل ص ۸۶

ندوی سند یافتہ طلباء نے اپنی قابلیت اور اپنے طرز عمل سے نہ صرف ندوہ کے وقار کو چار چاند لگائے ہیں بلکہ اپنی اعلیٰ ترین لیاقت سے علماء کے احترام و اعتبار کا پایہ بھی بہت بلند کر دیا ہے انھوں نے اپنی روشن خیالی اور رواداری کی وجہ سے کسی فرقہ کے ساتھ جزوی اختلافات ملی مناقشات کی بنا پر کوئی بے جا پرخاش نہیں کی ہے۔"[1]

جزوی اختلافات اور ملی مناقشات سے پرہیز کرنے والے علماء کا جو اثر مسلمانوں کے دینی مزاج پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی کا باعث بنے گا۔ چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سند یافتہ علماء ملت کے لئے ایک گراں مایہ سرمایہ بنے اور عام مسلمانوں کی زندگیاں ان سے متاثر ہوئیں۔

تحریک ندوۃ العلماء نے اپنے ایک دوسرے مقصد کے تحت مسلمانوں کے مذہب کے سلسلہ میں محدود تصور کو وسعت اور جلا بخشی۔

ہندوستان کے مسلمان ایک عرصہ دراز سے اپنے اصل دین سے بے تعلق رہنے کے سبب مذہب کے معاملات میں بہت زیادہ تنگ نظر اور بڑی حد تک احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایسے مسلمانوں کے لئے ہر جدید شے "شجر ممنوعہ" تھی اور دینی مدارس سے وابستہ لوگ اس معاملہ میں بہت پیش پیش تھے۔

لہٰذا دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے نصاب تعلیم میں متعدد بار ایسی انقلابی تبدیلیاں کیں جس نے قدیم اور جدید کی وسیع خلیج کو بڑی حد تک پاٹ دیا۔

ڈاکٹر احتشام احمد لکھتے ہیں کہ ـــــ

---

[1] شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلماء حصہ ص ۳۵۵

"ندوہ نے سب سے پہلے نصاب تعلیم بدلا۔ جدید علوم اسلامیہ کی نئی کتابوں کو درس میں شامل کیا اور ان فرسودہ کتابوں کو جو منطق اور فلسفہ قدیم سے متعلق تھیں۔ نصاب سے خارج کردیں۔ انگریزی زبان، معاشیات اور سیاسیات کے مضامین نصاب میں داخل کیئے۔ اس طرح ندوہ نے روشن خیال علمار کا ایک ایسا گروہ پیدا کردیا۔ جس نے آگے چل کر ہندوستان کے مسلمانوں کے لیئے تعمیری مقصد کا اسلامی لٹریچر فراہم کیا۔"[1]

یہ تعمیری مقصد کا اسلامی لٹریچر وہ ہے جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں اور مذہب کی تنگنائیوں سے نکال کر دین کی وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے۔

جمعیتہ علمار ہند دارالعلوم دیوبند کے فارغین کی جماعت کا نام ہے اور دین کے معاملے میں یہ جماعت دارالعلوم دیوبند کے ہی مکتب فکر کی حامل ہے چنانچہ اس جماعت نے عملاً مسلمانوں میں سے شرک و بدعت کے بہت سے نیئے طریقوں کو ختم کیا۔ ان کی مذہبی زندگی میں توحید خالص کا واضح تصور پیدا کیا۔

پھر صدیوں کے انحطاط، زوال، غلط پروپیگنڈے اور غلامی کے باعث مسلمانوں میں یہ تصور در آیا تھا کہ دین داری، خستہ حالی شکستگی عزت وافلاس اور فقر و فاقہ کا نام ہے۔ دنیا اور دنیا کے ذرائع وسائل سے بے نیازی، بے توجہی اور اس کی تحقیر و تذلیل دین کی معراج ہے۔

جمعیتہ علماء ہند نے عام مسلمانوں کے اس غلط خیال کی تردید کی اور

---

[1] ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں ص ۱۵۱

بتایا ـــــ

"یہ ایک نہایت ہی غلط تصور دین ہے جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں رائج ہوگیا ہے نہ قرآن اس کی تائید کرتا ہے۔ نہ حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے نہ اسوۂ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اس کی تائید ہوتی ہے ـــــ بلکہ قرآن وسنت کی واضح ہد تو یہ بتاتی ہیں کہ دنیا کی نعمتوں کا حصول وسائل کی فراہمی، زندگی کے لئے جدوجہد اور مادی قوت حاصل کرنا ممنوع نہیں بلکہ مطلوب ہیں البتہ حلال اور جائز طریقوں سے ہر طرح کی مادی وسائل فراہم کرنے کے باوجود اس یقین وایمان کے ساتھ زندگی گزاری جائے۔ کہ یہ دنیا عارضی ہے اور ابدی قیام گاہ تو جنت ہے"[1]

جمعیتہ علماء نے مسلمانوں کو یاد دہانی کرائی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : ـــــ

"دو ہی انسان قابل رشک ہیں، ایک وہ جس کو خدا نے قرآن کا علم دیا ہے اور وہ صبح وشام اس علم کو پھیلانے میں لگا ہوا ہے۔ دوسرا وہ جس کو خدا نے مال و دولت سے نوازہ ہے اور وہ صبح وشام خدا کی راہ میں (اپنا مال) لٹا رہا ہے"[2]

غرض جمعیتہ علماء ہند کی جانب سے مذہب اسلام کی اس طرح وضاحت و تشریح سے مسلمانوں کے مذہبی رجحانات میں ایک بڑی اور نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔

---

[1] مولانا محمد اسرار الحق قاسمی، اصلاح معاشرہ اور معاشی جدوجہد، شعبہ نشر واشاعت جمعیتہ العلماء ہند، نئی دہلی ص ۱۹، ۲۱

[2] " " " " " " " " " " " " ص ۵۴،

تبلیغی جماعت خالصتاً اسلام کے عبادتی پہلو کی حامل ایک جماعت ہے اور اس نے اوّل دن سے نماز اور اذکار و نوافل پر بہت زور دیا ہے۔ عقیدے کی درستگی کے ساتھ ساتھ اس کے نزدیک قیام اور اہتمام نماز اوّلین چیز ہے اس کے لئے وہ مسلمانوں کو مسجد میں بلاتی ہے، گشت کراتی ہے، تعلیم کا اہتمام کرتی ہے اور چلّے لگانے کی زبردست تلقین کرتی ہے۔ جس کے سبب چلّے دینا اس جماعت کی پہچان بن گیا ہے۔

ہر سال اہتمام سے چلّہ لگایا جائے اور عمر میں کم از کم تین چلّے۔ (دوسروں کو بھی) عمر میں کم از کم تین چلّوں کی دعوت خوب جم کر دی جائے۔ اس کے بغیر زندگی کے رُخ نہیں بدلیں گے۔[1]

تبلیغی جماعت نے ایمان کی درستگی کے ساتھ ہی اعمال کی بنیاد پر زندگیوں میں تبدیلی لانے کی ہمیشہ کوشش اور جدوجہد کی ہے اور وہ بہر حال مسلمانوں کو برابر اس امر کی تبلیغ بھی کرتی ہے۔

چنانچہ ہندوستان میں تبلیغی جماعت کی اس جدوجہد اور کوشش کے نتیجے میں مسلمانوں کی مذہبی زندگی پر بہت زیادہ نمایاں اثرات مرتب ہوئے ہیں اور ان اثرات کا دائرہ صرف مردوں تک محدود نہیں ہے اس دائرہ میں خواتین بھی آتی ہیں۔ نوجوان اور خاص طور پر طلبا بھی آتے ہیں۔

مولانا محمد الیاسؒ (ربانی جماعت) جس طرح مردوں میں دینی دعوت کا کام ضروری سمجھتے تھے اسی طرح عورتوں میں بھی اس کام کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے اس لئے کہ عورتوں کی درستگی سے مردوں اور بچوں میں دینی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے اور عورتوں کی مخالفت سے ہی مردوں

---

[1] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسفؒ ص ۵۳۰،

کی تساہلی دور ہو کر اس کام میں لگنے کی راہیں کھلتی ہیں۔[۱]

طلباء اور نوجوانوں کو بھی تبلیغی جماعت نے اپنا نشانہ بنایا اور خاص طور پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دین کی دعوت کے کام کو بہت فروغ دیا۔

مولانا وحیدالدین خاں تبلیغی جماعت کے کام کے ابتدائی اثرات کا جائزہ ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں۔

پورے علاقہ میں دین کی رغبت پیدا ہوگئی۔ جہاں میلوں تک کوئی مسجد نظر نہیں آتی تھی وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بن گئیں ـــــ گاؤں کے گاؤں ایسے ہوگئے جہاں ایک بچہ بھی نمازی نہیں تھا۔ اب مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتی ہیں۔ اسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک بزرگ ستمبر ۱۹۳۹ء میں میوات کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک جاہل میواتی کو روک کر پوچھا ـــ "یہ تبلیغی دورے تم کس لئے کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا۔

ہم جہالت میں پڑے ہوئے تھے نہ ہم کو خدا کی خبر تھی نہ رسول کی اس مولوی کا خدا بھلا کرے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں تک بھی یہ نصیحت پہنچائیں جو ہمیں ملی ہے۔[۲]

مولانا موصوف مزید لکھتے ہیں:

"صرف چند سال پہلے کی بات ہے کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب وہاں (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) تقریر کرنے کے لئے تشریف لائے لیکن اس وقت طلباء میں دین کے استخفاف کا ایسا ذہن تھا کہ فقرہ بازی اور شور و غل کی وجہ سے مولانا محترم

---

[۱] سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسفؒ ص ۴۲،

[۲] مولانا وحیدالدین خاں، تبلیغی تحریک ص ۱۳، ۱۴

اپنی تقریر مکمل نہ کر سکے اور قبل از وقت اٹھ کر چلے گئے۔
پچھلے سال دوبارہ یونیورسٹی میں آئے اور ڈھائی تین ہزار کے مجمع میں ان کی تقریر ہوئی مگر سارا مجمع آخر تک بالکل خاموشی اور دل چسپی سے سنتا رہا۔ یونیورسٹی کی فضا میں یہ تبدیلی تبلیغی جماعتوں کا ثمرہ ہے۔ ہر ہوسٹل میں باقاعدہ مسجد، امام اور مؤذن کا انتظام، دینی امور کی نگرانی کے لئے ایک مستقل ناظم کا عہدہ ہے۔ سیکڑوں طلبا رہیں جن کے اندر خدا ترسی، نماز باجماعت نوافل، خدمت خلق، انفاق دعا، ذمہ داری اور اسلامی وضع قطع کی صفات پیدا ہو گئی ہیں۔ [۱]

جماعت اسلامی ہند کی تشکیل کے وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں عقیدہ اور عبادت کے پہلو سے بڑی تبدیلی آگئی تھی لیکن دین کا وہ آفاقی عالم گیر تصور مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ جس کا اسلام اپنے ماننے والوں سے متقاضی ہے۔ بانی جماعت اسلامی ہند مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ دین کے اس آفاقی اور عالم گیر تصور سے مسلمانوں کو وابستہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت مدلل طریقے سے لکھا:

"اسلام محض ایک عقیدہ نہیں ہے نہ وہ محض چند "مذہبی" اعمال اور رسموں کا مجموعہ ہے بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی کے لئے ایک مفصل اسکیم ہے۔ اس میں عقائد، عبادات اور عملی زندگی کے اصول و قواعد الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک ناقابل تقسیم مجموعہ بناتے ہیں جس کے

---

[۱] مولانا وحیدالدین خاں، تبلیغی تحریک ص ۷۰

اجزا کا باہمی ربط بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک زندہ جسم
کے اعضاء میں ہوتا ہے ـــــــ آپ غور فرمائیں کہ اس
وقت اپنی اسی ہندوستان کی دنیا میں اسلام کو کس حال
میں دیکھ رہے ہیں ؟ قوانین اسلامی قریب قریب معطل
ہیں، اخلاق میں، معاشرت میں اور زندگی کے سارے معاملات
میں اصول اسلامی کا نفاذ پانچ ۵ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے
غیر اسلامی ماحول، غیر اسلامی تربیت اور غیر اسلامی تعلیم نے
دماغ کو کہیں بالکل اور کہیں کچھ کم و بیش غیر مسلم بنا دیا ہے۔"[۱]

مولانا مودودی صاحبؒ آگے لکھتے ہیں ـــــــ

ہم جو انقلاب چاہتے ہیں اس کے لئے کوئی نئی صورت
تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ انقلاب اس سے پہلے
برپا ہو چکا ہے۔ جس پاک انسان نے (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلی
مرتبہ یہ انقلاب برپا کیا تھا، وہی اس کی فطرت کو خوب جانتا
تھا اور اس کے اختیار کئے ہوئے طریقے کی پیروی کر کے
آج بھی یہ انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے (یعنی مکمل دین اسلام
کا نفاذ) اس پاک ہستی کی سیرت ایک لحاظ سے معجزہ ہے
مگر دوسرے لحاظ سے اسوہ بھی ہے وہ اخلاق، وہ
تقویٰ، وہ حکمت، وہ عدالت، وہ طاقت ور شخصیت،
وہ انسانیت کبریٰ کی عظیم الشان خصوصیات اب کوئی
انسان کہاں سے لا سکتا ہے ؟ اس لئے اب کوئی انسان
اتنا کمال درجہ کا انقلاب بھی کہاں برپا کر سکتا ہے ؟ اس

---

[۱] علامہ مودودی، تنقیحات، مرکزی مکتبہ اسلامی۔ نئی دہلی، ص ۳۰۴، ۳۰۵

لحاظ سے وہ معجزہ ہے اور قیامت تک کے لیے معجزہ ہے
لیکن اس انسانِ کبریٰؐ نے جو نمونہ چھوڑا ہے اس کا طبعی خاصّہ
وہی انقلاب انگیز ہے جس کی نظیر ساڑھے تیرہ سو برس (۱۳۰۰)
پہلے دنیا کے سامنے آچکی ہے۔ اس نمونہ کی جتنی زیادہ پیروی
کی جائے گی اور جس قدر زیادہ اس سے مماثلت پیدا کی
جائے گی۔ اسی قدر زیادہ انقلاب انگیز نتائج بھی ظاہر
ہوں گے۔" [1]

اسلام کے سلسلہ میں جماعت اسلامی ہند کی یہ انقلابی فکر مسلمانوں سے ان کی اپنی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی کی خواہاں ہے لیکن بقول حکیم امت علامہ اقبالؔ مایوسی کی بھی کوئی بات نہیں رہی ہے

نومید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

جماعت اسلامی ہند کی دعوت اور لٹریچر کی اشاعت نے مسلمانوں کے تصورِ مذہب اور مذہبی زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ مسلمانوں کے فکر و نظر میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اس فکر و نظر کی تبدیلی نے ان کی مذہبی زندگی کو متاثر کیا ہے۔

سید اسعد گیلانی جماعت اسلامی ہند کے اس اثر کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"لاکھوں دلوں میں اسلام کی گہری محبت اور روشنی پیدا
کر دی ہے۔ ان کی زندگیوں کا رُخ بدل دیا ہے ــــ انھوں
نے مدت سے قائم شدہ جمود توڑا ہے اور منجمد، افسردہ

---

[1] علامہ مودودیؒ، تنقیحات، ص ۳۱۳، ۳۱۴

اور بے مقصد دلوں کو متحرک، پرجوش اور بامقصد بنایا
ہے، اور اپنے انقلابی قلم اور مشن کی قوت سے دلوں میں
اسلام (کی آفاقی اور عالم گیر حیثیت) کے لئے گہرا جذبۂ محبت
وایثار وقربانی پیدا کر دیا ہے۔" [1]

گیلانی صاحب نے جماعت اسلامی ہند کے اثر کے ذیل میں مزید لکھا ہے:

"مولانا کی دعوت نے جدید وقدیم دونوں طبقات کے
تصور دین پر بھی نمایاں اثر ڈالا ہے۔ جدید ذہن اسے ایک
زائد از ضرورت زندگی کا پرائیویٹ معاملہ سمجھتا تھا۔
قدیم ذہن اسے رسومات کا پختہ لگا بندھا ضابطہ سمجھتا تھا
مولانا مودودیؒ نے دین کے ان دونوں تصورات کو درست
کر کے اعتدال پر قائم کر دیا ہے۔ دین اسلام زندگی کا نام ہے
اور اسلامی زندگی وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا
کے سامنے پیش کی ہے بس یہی نجات کا سیدھا راستہ ہے۔" [1]

غرض اس طرح ساری اسلامی تحریکوں سے ہندوستان کے مسلمانوں
کی دینی اور مذہبی زندگی پر بہت دور رس اور گہرے اثرات مرتب ہوئے
ہیں۔

---

[1] اسد گیلانی "مولانا مودودی سے ملیے"، مکتبہ تجلی دیوبند، ص ۱۸۱

ثقافتی اثرات

ہندوستان میں اسلامی تحریکوں کے ثقافتی اثرات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ جان لیں کہ اسلامی ثقافت کیا ہے۔ اس کی سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ جب خوب و ناخوب کے معیار بدل جاتے ہیں، جب کوئی فرد یا پوری قوم اغیار کی فکری محکومیت اور ذہنی مرعوبیت میں مبتلا ہو جاتی ہے تو پھر الفاظ محاورے اور بہت سی اصطلاحیں بھی اپنے اصل معنی اور مفہوم کھو دیتے ہیں اور ان کی جگہ نئے معنی اور مفہوم لے لیتے ہیں۔ اسلامی ثقافت کی اصطلاح بھی آج اس فکری محکومیت اور ذہنی مرعوبیت کا شکار ہے۔ آرٹس کونسل سے لے کر کرکٹ کے میدان تک اسلامی ثقافت کے مظاہر قرار دئے جا رہے ہیں اور حقیقت میں جو ثقافت اسلامی ہے، جو گان پر رکھ کر اچھال دی گئی ہے ـــــ جبکہ اسلام کی علمی و فکری اور عملی ثقافت نے قرآن و سنّت کے علم اور اسوۂ نبی سے تشکیل پائی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ اسلامی ثقافت کا اصل نام علوم قرآن و سنّت اور اسوۂ نبی ہے ـــ لہٰذا جب کبھی اور جہاں کہیں اسلامی ثقافت کی بات آئے گی اس کی واحد شکل اتباعِ سنّت اور اسوۂ نبوی کی پیروی ہوگی۔ [1]

---

[1] افتخار احمد بلخی (ترجمہ) تاریخ افکار و علوم اسلامی، جلد اول، مکتبۂ اسلامی دہلی ص ۱۸، ۲۶

اسلامی ثقافت کے اس اصل مفہوم کی روشنی میں اب دیکھیں کہ ہندوستان کی اسلامی تحریکوں نے مسلمانوں پر بہ حیثیت مجموعی کیا ثقافتی اثرات مرتب کئے؟

قوم کے نوجوان اسلامی تعلیم سے کورے، اسلامی تہذیب میں خام، انگریزی حکومت سے مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو انھوں نے انگریزی مدرسہ کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور ان کی طبیعت کا رُخ مذہب سے پھر گیا کیوں کہ اس آب و ہوا کی اولین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامل آمَنّا وَصَدّقنا کہیں اور قرآن و حدیث یا ائمہ کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول و فروع اکثر و بیشتر اسلام کے اصول اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔

اسلام میں مذہب کا یہ تصور ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔[1]

ہر اسلامی تحریک اپنے اپنے وقت میں مسلمانوں خاص طور پر نئی نسل میں احساس کمتری کے اس مرض سے پہلے ہی واقف و آگاہ تھی۔ اس لئے اسلامی تحریکوں نے اس مرض کے لئے وہ علاج تجویز کیا جو اس کے سدباب کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔

تحریک دارالعلوم دیوبند نے مدرسہ قائم کرکے قرآن وحدیث اور دوسرے علوم اسلامی کی تعلیم کو رواج دیا تاکہ اسلام، اسلامی علوم

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی، تنقیحات ص ۲۹، ۳۰

اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی معاشرت کی حفاظت کی جا سکے۔

تحریک دارالعلوم ندوۃ العلماء نے قرآن و حدیث کی تعلیم کو اور زیادہ بامعنی بنایا اور اپنے اہم مقاصد میں ایسے علماء کی تیاری شامل کی جو روشن خیال ہوں، زمانہ کی نبض پر جن کا ہاتھ ہو اور جن کی نگاہ قدیم وجدید کی مصنوعی اور سطحی تقسیم سے بالاتر ہو۔

تبلیغی تحریک نے مسلمانوں کو یہ شعور دیا کہ تمھارے تمام امراض کا علاج یہ ہے کہ اپنے اندر ایمان پیدا کرو، اللہ کی طرف رجوع ہو، اور شب و روز میں ہر کام حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیات طیبہ کی اتباع میں کیا جائے۔

تحریک جماعت اسلامی ہند نے مسلمانوں سے مطالبہ کیا کہ تم سب میں یہ جذبہ پیدا ہونا چاہیئے کہ ہر ہر شخص اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھے تاجر اپنی تجارت میں، کسان اپنی زراعت میں، صناع اپنے پیشے کے کام میں اور ملازم اپنی ملازمت میں اس مقصد کو نہ بھولے۔ اپنے اقوال میں، اپنے افعال میں، اپنے اخلاق اور معاملات میں اسلامی اصولوں کی پابندی کرے۔

یہ بات علم میں آ ہی چکی ہے کہ ——

نہ صرف قرآنی علوم و معارف اسلامی ثقافت قرار پاتے ہیں بلکہ وہ اعمال بھی اسلامی ثقافت میں داخل ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد صحابہ کرامؓ پھر تابعین نے قائم فرمایا نیز ان لوگوں نے جو ان کے بعد پیدا ہوئے اور کتاب اللہ و سنّت رسول اللہ کی روشنی سے منوّر ان کی راہ میں عمل پر گامزن ہو کر معاملا زندگی کی کجی کو سیدھا اور راستوں کو روشن کیا۔ [1]

---

[1] راغب الطباخ، الثقافۃ الاسلامیہ، مطبوعہ دمشق، شام، ص ۴۴، ۴۵

چنانچہ اسلامی تحریکوں سے وابستہ لوگوں نے ہمیشہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "علیکم بسنتی" پر عمل پیرا ہونے کی خود کوشش کی اور دوسرے مسلمانوں کو اس جانب پوری قوت سے متوجہ کیا۔ انھوں نے صراط مستقیم پر چلنے کے لئے اس طریق کو نہ صرف خود اپنایا بلکہ دوسرے مسلمانوں کو بھی اس طریق پر لانے کی جد وجہد کی جو اسلام کے مزاج کے مطابق ہے۔

اسلامی تحریکوں کے صحیح موقف اور ان کے قائدین اور پیروکاروں کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک خاص تعداد متاثر ہوئی اور اپنی تہذیب و ثقافت کو اپنایا۔ قرآن و حدیث اور ان سے متعلق علوم میں دل چسپی لی، انھیں "العلم" سمجھا۔ ذہنی مرعوبیت اور فکری محکومیت سے اپنے دل و دماغ کو پاک کیا۔ تہذیب فرنگ کی خیرگی سے اپنی نگاہوں کو بچایا، اور شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہونے سے باز رہے اور اس صداقت کو پوری طرح ذہن نشین کرلیا کہ ——

جس قوم کو اپنی کوئی چیز اچھی نہ لگے اور دوسروں کی ہر ادا پر فریفتہ ہو۔ وہ کیا زندہ رہ سکتی ہے۔ قوم چند بے جان افراد کا مجموعہ نہیں ہوتی، وہ معتقدات، تاریخ، عصبیت، ثقافت اور انفرادیت پر اصرار سے وجود میں آتی ہے اور ان کے استحکام سے پروان چڑھتی ہے۔ افراد اس وقت ہر طرح کی قربانی کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔ جب انھیں قوم کی حیات میں ان قدروں اور روایات کی بقا نظر آئے جو جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ ورنہ آرام و آسائش، اچھے کپڑوں، لذیذ خوراک، نفیس ساز و سامان اور غیر ملکی آلات کی حفاظت کے لئے نقد جان کون گنواتا ہے۔

اور اپنی ثقافت سے محرومی قوم میں خود غرضی، سہل نگاری، فرض ناشناسی، اخلاقی کمزوری اور بدترین قسم کی کردار میں پستی پیدا کر دیتی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں اور خاص طور پر نئی نسل میں یہ احساس و شعور اسلامی تحریکوں کا ہی مرہون منت ہے۔ اس احساس و شعور نے مسلمانوں کی اکثریت کو ہمیشہ مغرب کی الحادی اور ہندوستان کی برہمنی تہذیب میں جذب ہونے سے روکے رکھا، اور مسلمانوں کی اس انفرادیت کے باعث کہ

خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی

ہندوستان کی جنگ آزادی کے آخر مرحلہ میں کانگریس کے ایک سرکردہ لیڈر سردار ولبھ بھائی پٹیل کو کہنا پڑا کہ مسلمانوں کی انفرادیت کے باعث اب انھیں اپنے ساتھ رکھنا دشوار ہے چنانچہ ——

"ماؤنٹ بیٹن کا ملک کی تقسیم کا پلان سب سے پہلے سردار ولبھ بھائی پٹیل نے منظور کیا۔" [۱]

پھر ان ہی اسلامی تحریکوں کی بدولت مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ میں اپنی تہذیب و ثقافت سے وابستگی میں اضافہ ہوا ہے۔ ان میں شریعت کے حدود کا احترام بڑھا ہے۔ کھانے پینے میں، اٹھنے بیٹھنے میں، رہنے سہنے میں، پہننے اوڑھنے میں، رفتار و گفتار میں، ملاقات اور مجلسوں میں، بازاروں میں مکانوں میں، سڑکوں پر، دکانوں میں، دفتروں میں اور درس گاہوں میں غرض ہر جگہ اور ہر عمل میں بندگیٔ رب کے تصور نے جلا پائی ہے۔ اب اس یقین نے بھی ذہنوں میں راہ پالی ہے اور اس میں پختگی پیدا

---

[۱] ڈاکٹر مجیب اشرف، جدید ہند کے سیکولر معمار ص ۲۲۴

ہوئی ہے کہ اللہ کی سنّت یہ ہے کہ جو قوم اللہ اور رسولؐ پر ایمان لائے اور اپنے اس ایمان کے تقاضے اور مطالبے پورے کرے، وہی افراد اور قومیں اس دنیا میں بھی کامیابی حاصل کرسکتی ہیں اور اخروی سعادت بھی انھیں کا مقدر رہے۔

غرض ہندوستان کی اسلامی تحریکوں نے قرآن وسنت کو بنیاد بناکر حالات وکوائف کو سامنے رکھ کر اپنے اپنے انداز اور طریقے کے مطابق مسلمانوں میں دینی رفعت تعلیمی وعملی ثقافت اور اسلامی معاشرت کا احیاء کیا ہے اور ان کے پھیلاؤ اور استحکام کے لئے کوششیں جاری ہیں۔

معاشرتی اثرات

اسلام کا معاشرتی نظام جن عناصر ترکیبی سے ترتیب پاتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ اسلامی معاشرہ میں افراد کی تمام تر جدوجہد کا ماحصل رضائے الٰہی کا حصول ہوتا ہے۔

۲۔ اسلامی معاشرہ امن وسلامتی کا اعلیٰ منظہر اور بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ قتل چوری، زنا اور بدامنی پھیلانے سے باز رکھتا ہے۔

۳۔ اسلامی معاشرہ عیش کوشی کا مخالف ہے اور اسے حرام ٹھہراتا ہے جنسی بے راہ روی کا مخالف ہے اور اسے روکتا ہے۔

۴۔ اسلامی معاشرہ میں اسراف، فضول خرچی اور عیش پسندی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

۵۔ اسلامی معاشرہ میں باہمی تعاون اور جذبہ محبت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

چنانچہ علم و عرفان، ایمان و ایقان، فکر و دانش، زہد و تقویٰ، شرافت و شجاعت، رحمت و راحت، انابت و للٰہیت، تعاون و محبت، شرم و حیا، طہارت و پاکیزگی خدا پرستی و خدا چاہی حق گوئی و بے باکی، امن وسلامتی جفاکشی و قناعت پسندی، صبر و استقامت، جرأت و ہمت، آخرت طلبی کشادہ دلی، فیاضی اور فراخ دستی، اسلامی معاشرہ کی بنیادی قدریں ہیں۔

لیکن ہندوستان کے مسلمان زوال سے دوچار ہوئے تو ان میں کسی ایک پہلو سے زوال نہیں آیا بلکہ ہمہ پہلو زوال اور انحطاط میں مبتلا ہوئے، ان کا معاشرہ بھی زوال کا شکار رہا۔

غیر اسلامی رسم و رواج اور طرح طرح کی خرافات، شادی، بیاہ ختنہ اور دیگر تقریبات میں خودنمائی اور فضول خرچی، عداوت وشقاوت، بغض وکینہ اور حسد، زر پرستی، دنیا طلبی اور مفاد پرستی، بے حیائی اور بے حجابی، نشہ خوری شراب نوشی، چوری، رہزنی، ڈاکہ اور خوں ریزی اور اس طرح کی بہت سی دوسری برائیاں مسلم معاشرہ کا جز بن گئیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس واضح ہدایت کے باوجود کہ ـــــ

"تم میں سے جو برائی کو دیکھے اس کو چاہیے کہ طاقت سے اس کو دور کرے اگر اس پر قدرت نہ ہو تو زبان سے اس کو روکے اور اگر اس پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو دل میں اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔"

مسلمانوں نے اس جانب سے اپنی آنکھیں بند رکھیں اور مسلم معاشرہ آئے دن نت نئی برائیوں کے بھنور میں ڈوبتا گیا۔

شرک وبدعت مسلمانوں میں کثرت سے موجود تھی۔ قبر اور مردوں سے متعلق ایک مستقل شریعت وجود میں آگئی تھی۔ ہندوؤں اور شیعوں کے بکثرت رسوم اہل سنت کے معاشرہ کا جز بن گئے تھے۔ سنت و شریعت کو لوگ بھولتے جارہے تھے۔ اسلامی شعائر اُٹھتے جارہے تھے۔ اچھے اچھے دین دار اور علمی گھرانوں میں بھی قرآن وحدیث کے احکام کا لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ بیوہ کا نکاح، میراث میں لڑکیوں کو حصہ دینا اور سلام مسنون کو بہت سی جگہ پر معیوب سمجھا جاتا تھا[1]

---

[1] مولانا ابوالحسن علی ندوی، جب ایمان کی بہار آئی، ص ۱۲

یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس نے دردمندوں کو ہمیشہ مضطرب اور بے چین رکھا اور اپنے امکان بھر مسلم معاشرے کے اس بگاڑ کو دور کرنے کی سعی و جہد کی، ہندوستان کی اسلامی تحریکوں نے بھی مسلم معاشرہ کے اس بگاڑ اور انحطاط کو اپنا نشانہ بنایا۔

لیکن ہر اسلامی تحریک کا اپنا ایک انداز اور طریقہ کار تھا۔ بانیانِ تحریک دارالعلوم دیوبند نے محسوس کیا کہ اسلام اور مسلمانوں کی بقا کا انحصار اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ دینی تعلیم کے ذریعہ اسلام اور مسلمانانِ ہند کا تحفظ کیا جائے اور تعلیم و تربیت کی راہ سے ان کی فکر و نظر کی اصلاح کر کے ان کی بقا کا سامان کیا جائے۔

اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ایک درس گاہ قائم کی جائے۔ جس میں علوم نبویہ پڑھائے جائیں اور ان ہی کے مطابق مسلمانوں کی دینی، معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلامی سانچوں میں ڈھالی جائے۔[1]

قائدین جمعیۃ العلماء ہند کا احساس تھا کہ مسلم معاشرے کے بگاڑ کو درست کرنے کے لئے دینی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاح کی تحریک چلانا ہوگی۔

ایسے ماحول میں تمام ہی مسلمان خاص کر علماء کرام پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی پوری طرح انجام دہی کریں۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل طریقے اپنانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

(الف) ہر بستی اور ہر محلہ میں اصلاحی کمیٹیاں قائم کر کے عوام کو دین کی طرف متوجہ کیا جائے۔ نماز، روزہ کے علاوہ آپس میں سلام کا رواج،

---

[1] مولانا محمد طیب صاحب، دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی، ص ۱۴

صورت و سیرت کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی ترغیب اور گھروں میں دینی ماحول قائم کیا جائے۔

(ب) پردے کی طرف خاص توجہ دی جائے۔

(ج) شادی بیاہ، ختنہ وغیرہ میں اسراف بے جا سے بچا جائے[1]

بانی تبلیغی جماعت کو اس امر پر یقین تھا کہ ——

نہ تو صرف بچوں کی تعلیم سے دینی انقلاب آسکتا ہے نہ خواص اور عمائدین کی اصلاح سے کوئی نتیجہ بر آمد ہو سکتا ہے بلکہ ایک عوامی دینی تحریک کی ضرورت ہے اور یہی موجودہ فساد اور دینی بے راہ روی کا صحیح علاج ہے۔[2]

جماعت اسلامی ہند کے بانی و قائد اول اس نظریہ کو بروئے کار لانے کے حق میں تھے کہ صرف اسلامی تعلیمات کی زبان سے خوبیاں بیان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا جب تک کہ وہ بالفعل مسلمانوں کی زندگیوں میں نافذ نہ ہوں۔

ان حالات میں محض عیسائی مشنریوں کے ڈھنگ پر اسلام کی تبلیغ کر دینا لا حاصل ہے۔ عقائد کی اصلاح کے لئے ایک رسالہ نہیں ہزاروں رسالے اگر لاکھوں کی تعداد میں شائع کر دئے جائیں تو یہ حالات نہیں بدل سکتے۔ محض زبان و قلم سے اسلام کی خوبیاں بیان کرنے سے کیا فائدہ ؟ ضرورت تو اس کی ہے کہ ان خوبیوں کو واقعات کی دنیا میں سامنے لایا جائے۔ محض یہ کہہ دینے سے کہ اسلام کے اصولوں میں زندگی کے مسائل کا حل موجود ہے، سارے مسائل خود بخود حل نہیں

---

[1] مولانا اسرار الحق قاسمی، اصلاح معاشرہ اور معاشی جد و جہد ص ۱۵

[2] سید محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا محمد یوسف صاحبؒ کاندھلوی ص ۱۴۰

ہو جائیں گے ۔ اسلام میں بالقوۃ جو کچھ موجود ہے اس کو بالفعل بنانے کی ضرورت ہے ۔ یہ دنیا کشمکش اور جدوجہد کی دنیا ہے اس کی رفتار محض باتوں سے نہیں بدل سکتے ۔ اس کو بدلنے کے لئے انقلاب انگیز جدوجہد کی ضرورت ہے ۔[1]

غرض ہندوستان کی تمام ہی اسلامی تحریکوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق اصلاح معاشرہ کی جانب توجہ دی اور اپنی جدوجہد سے اس پر اثر انداز ہوئیں اور بہت زیادہ گئے گزرے حالات میں بھی اسلامی تحریکوں نے مسلم معاشرہ کو یکسر کفر و الحاد کی گود میں جانے سے بڑی حد تک روک دیا ۔

پھر مسلم معاشرہ میں جو خرابیاں راہ پا گئی تھی اور جو بگاڑ آگیا تھا ۔ اس کو بھی بڑی حد تک دور کیا ۔ بہت سے مسلم گھرانوں نے شرک و بدعت کی لعنتوں سے نجات پائی ۔ ہندوانہ رسم و رواج میں کمی آئی ۔

تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی نے خواتین تک اپنا دائرہ کار بڑھا کر اور ان کے حلقے قائم کر کے اصلاح معاشرہ کے سلسلہ میں ایک اور اہم کردار ادا کیا ۔ اسلامی تحریکوں کی کارکن خواتین کی بدولت معاشرہ سے بہت سی خرابیاں دور ہوئیں ۔

لیکن بدلے ہوئے حالات کے تحت مسلم معاشرہ روز جن نت نئی خرابیوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے ۔ اسے یقیناً وعظ و تبلیغ سے نہیں بدلا جا سکتا ۔ اس کے لئے عمل کی ضرورت ہے ۔ شیخ صاحب کو توفیق کی ضرورت ہے ، ہر اسلامی تحریک کا قائد و کارکن جب تک اسلامی معاشرہ کی

---

[1] سید مودودی ، تنقیحات ، ص ۳۱۲ ، ۳۱۳

تشکیل جدید کے لئے مثالی نمونہ نہیں بنیں گے تھوڑی بہت اصلاح تو یقیناً ممکن ہے۔ لیکن مسلم معاشرہ مکمل طور پر غیر اسلامی افکار و نظریات فرسودہ رسم و رواج، شرک و بدعات اور روز نت نئی خرافات سے پاک ہو جائے ممکن نہیں ہے اور اسلامی معاشرہ کے ہر شعبہ کے لئے یہی اصول لازم ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ــــ

"ہمارے نوجوانوں کو اپنے والدین اور بزرگوں کی زندگی میں اسلام نظر نہیں آتا تو وہ اپنے آبائی دین کی عظمت کو کیسے سمجھیں؟ ہماری درس گاہیں جو بے جان ہیں، جہاں نہ علم ہے، نہ کردار، نہ دین، نہ جذبہ، ان سے تعلیم پاکر نوجوان جوش و ولولہ کہاں سے لائیں؟ ان کے دل پر جب اغیار کی عظمت کے نقوش ثبت ہیں تو وہ اپنی کس چیز پر فخر کیسے کریں؟ لہذا ان کے دل اگر ارتداد کی طرف مائل ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔" [1]

---

[1] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، اسلامی نظریہ حیات۔ شائع کردہ کراچی یونیورسٹی ، ص ۱۹

باب ہفتم

اختتام

اختتام
(Conclusion)

ہندوستان کی اسلامی تحریکوں کے مطالعہ سے کئی اہم ترین باتیں سامنے آئی ہیں یہ کہ :۔

- اسلام ایک مکمل نظام حیات کا نام ہے۔
- اسلام محض ایک نظریہ نہیں بلکہ وہ ایک زندۂ جاوید تحریک اور انقلاب کا نام ہے۔
- اسلامی تحریک کو تنہا یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے ماخذ کا مکمل ریکارڈ موجود ہے۔
- اسلام ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کرنے اور ہر منزل پر تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
- اسلام کی بقا اور تسلسل کے لئے ہمیشہ زندۂ جاوید شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔
- مسلمانوں کے عروج وزوال کا معاملہ پوری طرح اسلام سے وابستہ ہے۔
- ہندوستان کی ان تمام اسلامی تحریکوں میں باہمی طور پر ایک معنوی ربط اور نظم پایا جاتا ہے۔
- ہندوستان کی اسلامی تحریکیں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی پیش رفت ہیں۔

اسلامی تحریکوں کے مطالعہ، تجزیہ اور تحلیل سے سب سے پہلے جو

بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام دوسرے مذاہب کی طرح اسلام محض چند مذہبی اعمال اور رسموں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اسلام زندگی کا ایک ہمہ گیر نظام اپنے اندر رکھتا ہے، جس کے دائرے میں انسان کے جسمانی و روحانی، مادی و اخلاقی، انفرادی و اجتماعی غرض پوری زندگی کے سارے ہی معاملات آتے ہیں۔

اسلام زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہے۔ فکر و نظر اور فہم شعور ہے، صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہے، کج روی سے بچاتا ہے اور راہ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی قوت و توانائی بخشتا ہے۔ انسان کو سعادت و خوش بختی کے بلند مقام پر فائز کرتا ہے۔

اسلام وسیع النظر اور ہمہ گیر طریق زندگی ہے جس میں فرد کا جماعت سے، جماعت کا معاشرہ سے اور معاشرہ کا فرد سے تعلق استوار کرنے کا پورا ضابطہ موجود ہے اور اس کی مکمل رہنمائی ہے۔ وہ انسانوں کو عقیدہ کے ساتھ ساتھ تعزیری اور مدنی قوانین و احکام بھی دیتا ہے، نیز ترتیب و تنظیم کے اصول و ضوابط بھی دیتا ہے۔

اسلام ہی وہ تنہا نظام زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے اور اللہ ہی نے اسے انسانوں کے لئے پسند کیا ہے۔

ترجمہ:-

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین (ایک مستقل نظام فکر و عمل) کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

(سورہ المائدہ، آیت ۳)

لہٰذا اسلام نے انسانی زندگی کے رُخ کو بدلا ہے اور انسانی سماج

میں ایک ایسا مکمل اصولی اور ہمہ گیر انقلاب برپا کیا ہے۔ جس نے جاہلی افکار اور جاہلی اخلاق اور معتقدات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔

اس طرح اسلام کا نظام حیات تجریدی نظریات کے بالمقابل ایسا نظام ہے کہ جس کے اصول ومبادی نے عملی زندگی کا جامہ پہنا۔ جس کے سائے میں لوگوں نے زندگی گزاری اور جسے تاریخ نے اب تک محفوظ رکھا ہے۔

اسلام ایک نظریہ، ایک تحریک اور ہمہ گیر انقلاب کا نام ہے۔ اسلام کا نظریہ ہے —— ایک اللہ پر ایمان لانا، جو پوری کائنات کا خالق اور رب ہے اور وہی مدبّر کائنات ہے اور وہ اپنے بندوں کے ایک ایک عمل پر نظر رکھتا ہے۔

اللہ کے نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانا، جن کو اللہ نے انسانوں تک اپنی مرضی ومنشار پہنچانے کے لئے مبعوث فرمایا ہے جو سب کے سب انسان تھے۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔ آپ کی دعوت تمام انسانیت کے لئے ہے اور آپ کی پاکیزہ زندگی آپؐ پر ایمان لانے والوں کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے۔

آخرت کے دن پر ایمان لانا، ہر انسان کو مرنے کے بعد ایک دن اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ دنیا میں کئے ہوئے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے۔ اس وقت اللہ اور بندہ کے درمیان کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔ برائی کا بدلہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ اور بھلائی کا بدلہ اللہ کی رضا اور خوشنودی کا گھر جنت ہوگا۔

اسلام ایک تحریک —— یہ ہے کہ اسلامی نظریات پر مبنی تعلیم وتربیت کا ایک نیا نظام قائم کیا جائے۔ اس سے مسلمان سائنس داں، مسلمان فلسفی مسلمان مورخ، مسلمان ماہرین مالیات ومعاشیات، مسلمان ماہرین قانون، مسلمان

ماہرین سیاست غرض ہر علم وفن میں ایسے اشخاص پیدا ہوں جو اپنی فکر و نظر کے اعتبار سے مسلم ہوں جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمہ فکر کے مقابلے میں اپنے عقلی و ذہنی تفوق کا سکہ جما دیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ گرد و پیش میں پھیلے ہوئے غلط نظام زندگی کے خلاف جو جد و جہد ہوگی وہ اسلامی تحریک کہلائے گی۔

اسلام ایک تحریک کا مطلب یہ بھی ہے کہ اسلام ایک گوشہ نشین زندگی گزارنے کا نام نہیں ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو کسی خانقاہ یا کسی عبادت خانہ میں محبوس کر دے۔ بلکہ وہ حرکت و عمل اور جہاد و کشمکش کا دین ہے وہ اپنے ماننے والوں کو رات کا عابد اور دن کا شہسوار بنانا پسند کرتا ہے۔

اسلام ایک انقلاب ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام زندگی کے کسی ایک پہلو تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے دائرہ میں انسان کی پوری زندگی آتی ہے اور وہ زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اسلام ایک ایسا انقلاب ہے کہ کوئی لفظ یا کوئی نعرہ اس کی صحیح اور مکمل تعبیر نہیں کر سکتا بلکہ یہ معاشرہ کی ایک کیفیاتی تبدیلی و تفسیر کا نام ہے اور یہ معاشرہ کی بنیادوں اور اصولوں کی بنیادی تبدیلی سے عبارت ہے۔

تنہا شریعت اسلامی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے اصل ماخذ و مصادر کا مکمل ریکارڈ موجود ہے یعنی اسلام اس دنیا کا وہ واحد دین ہے کہ جس کے بارے میں آج بھی بآسانی یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ پہلی بار یہ دین کب برپا ہوا۔ کس طرح شروع ہوا۔ کن کن ہتھیاروں

سے یہ دین لیس تھا، کن کن مراحل سے گزرا اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ اس دین کا بنیادی نصب العین کیا تھا اور اسے جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا۔

شریعت اسلامی کے دونوں بنیادی ماخذ قرآن پاک وحدیثِ رسولؐ اپنی اصل شکل وصورت میں موجود ہیں۔

قرآن پاک اوّلین ماخذ کی حیثیت سے دین اسلام کی روح اور مزاج ہے۔ اللہ کی یہی وہ آخری اور مکمل کتاب ہے جو دین اسلام کا صحیح مزاج افراد کے اندر پیدا کرتا ہے اور افراد کو دوسرے تمام انسانوں کے مقابلے میں ممتاز بناتا ہے وہ ان کے اندر دوستوں کے لئے ریشم اور دشمنوں کے لئے فولاد کی خاصیت پیدا کرتا ہے۔

یہ کتاب تمام انسانوں کے لئے کتاب ہدایت ہے اور کرۂ ارض کے سب انسانوں سے اس کا سیدھا خطاب ہے۔ یہ دین اور سیاست میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے، یہ غلاموں پر اسرار شاہنشاہی کھولتا ہے۔ اس کی دعوت علم وعقل کی بنیاد پر ہے اور یہی وہ کتاب ہے جو اپنے اوپر ایمان لانے والوں کے اندر حق و باطل کے درمیان ایک مستقل کشمکش کا تصور پیدا کرتی ہے۔

شریعت اسلامی کا دوسرا مستند ترین ماخذ حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے۔ آپ کے طریقے میں لوگوں کے لئے بہترین رہنمائی ہے۔ آپؐ محسن انسانیت اور رحمت عالم ہیں۔ آپ کی رہنمائی ہر فرد کے لئے ہے اور زندگی کے تمام گوشوں کے لئے ہے۔

حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم گوشہ نشینی کے بجائے جہاد مسلسل کے داعی اور دین اسلام کو دوسرے تمام باطل ادیان پر غالب کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔

اس لئے دین اسلام اپنی خصوصیات اور اپنی فطرت میں دوسرے تمام ادیان سے مختلف ہے اس دین کے مقاصد دیگر سیاسی، گروہی اور قومی و نسلی تحریکوں کے مقاصد سے یکسر جدا اور الگ ہیں۔ اسلام اپنے عقائدی تصور اور تحریکی پروگرام میں ہم رنگ اور ہم آہنگ رہتا ہے۔

اسلام ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کرنے اور ہر منزل پر تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ محض ایک کھوکھلا دعویٰ نہیں ہے بلکہ واقعتاً یہ ایک ایسی حقیقت اور صداقت ہے جس کو سمجھ لینا زیادہ دشوار نہیں ہے ۔ اللہ رب العالمین کا ارشاد ہے کہ ــــ

"آج کے دن میں نے تمھارے لئے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمھارے لئے پسند کر چکا"

(سورۃ المائدہ۔ آیت ۳)

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو مکمل کرنے اور تمام انسانوں کے لئے پسند کر لینے کے ساتھ ساتھ اس میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دینے کی بھی صلاحیت رکھی ہے۔

اس دین کی بنیاد اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہے مگر یہ زندگی سے پر ہے اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے۔ اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے۔ یہ کسی خاص دور کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہے جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو اور اپنی زندگی کھو چکا ہو بلکہ ایک زندہ دین ہے۔

بات بہت سیدھی سی ہے۔ اسلام اللہ کا آخری دین ہے، مکمل ہو چکا ہے اور قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے لئے پسند کیا جا چکا ہے۔ پھر یہ اس علیم و خبیر ہستی کا بھیجا ہوا دین ہے جس کی نظر ہر حرکت اور تغیر پر رہتی ہے۔

ان سارے حقائق کی بنا پر ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام میں ہر دور کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھی ہے۔

محترم عبدالقادر عودہ شہید مصری اپنی کتاب "قانون الٰہی یا انسانی" میں تحریر کرتے ہیں :

> "اسلامی شریعت کسی ایک وقت، کسی ایک دور یا کسی ایک زمانہ کے لئے نہیں ہے بلکہ رہتی دنیا تک ہر وقت، ہر دور اور ہر زمانے کے لئے مشعل راہ ہے۔ شرعی احکام اس طرح وضع کئے گئے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی تر و تازگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر ان کے بنیادی قواعد و ضوابط میں کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ قواعد و ضوابط اتنے ہمہ گیر ہیں کہ کوئی بھی نئی صورت حال ان کے دائرہ کار سے باہر نہیں رہ سکتی۔" [1]

اسلام کی بقاء اور تسلسل کے لئے ہمیشہ زندۂ جاوید شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں یہ ایک ایسی صداقت ہے کہ جس کو کسی طرح نہیں جھٹلایا جا سکتا۔

اسلام اور مسلمانوں پر شروع ہی سے داخلی اور خارجی بہت سے حملے

---

[1] عبدالقادر عودہ شہید مصری، "قانون الٰہی یا انسانی" ص ۳۶

ہوئے ہیں۔ ایک طرف باطنیت نے اسلام کی روح اور اس کے نظام عقائد پر سخت حملے کیے، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی کے میدان سے بے دخل کرنے کے لئے صلیبوں اور وحشی تاتاریوں نے جان لیوا حملے کیے، پھر تحریفات، تاویلات، بدعات، مشرکانہ اعمال ورسوم، مادیت، نفس پرستی اور عقلیت پرستی کا اسلام پر بار بار حملہ ہوا لیکن اسلام نے ان سب داخلی اور خارجی حملوں کو برداشت کیا اور اس نے اپنے وجود کو باقی رکھا۔ اپنی روح کو فنا نہیں ہونے دیا۔

تاریخ اسلامی کے ہر دور میں ایسی زندہ جاوید ہستیاں پیدا ہوئیں۔ جنھوں نے حقیقت اسلام اور دین خالص کو تر وتازہ رکھا۔ ایسے ہی مرحلے بارہا ہندوستان میں بھی پیش آئے اور ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کی کوششوں نے سرزمین ہند میں اسلام اور مسلمانوں کو باقی رکھا۔

جس طرح دور اکبری میں حضرت مجدد الف ثانیؒ پیدا ہوئے، اور انھوں نے اسلام کی گرتی ہوئی عمارت کو تھام لیا۔ اسی طرح اورنگ زیب عالم گیرؒ کی وفات سے چار سال پہلے یعنی ۲۱ر فروری ۱۷۰۳ء کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رونق افزائے عالم ہوئے اور آپ نے بھی وہی کام کیا جو حضرت مجدد صاحبؒ نے اپنے عہد میں کیا تھا۔ [1]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد آپ کے صاحبزادوں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے مغلیہ سلطنت کے زوال اور خاتمہ کے بعد بھی اسلام کو ہندوستان میں زندہ رکھا۔

سید احمد شہیدؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ نے ہندوستان میں اسلام

---

[1] مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مسلمانوں کا عروج وزوال، ص ۳۳۶

کو زندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ سر بلند کرنے کی بھی کوشش کی اور اس سرزمین پر ایک بار پھر خلافت راشدہ کے طرز کی حکومت قائم کرنے کے لئے جہاد کیا۔

اسی روح وجذبہ نے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمد رشید احمد گنگوہیؒ کو اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے آگے بڑھایا اور تحریک دار العلوم دیوبند وجود میں آئی۔ مولانا سید محمد علی مونگیری اور علامہ شبلی نعمانیؒ نے دار العلوم ندوۃ العلماء کو قائم کر کے ہندوستان میں اسلام کی بقاء کے مزید اسباب مہیا کئے۔

مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے تبلیغی تحریک چلا کر اور اسلام کی تبلیغ واشاعت کا کام مسلمان عوام کے حوالے کر کے اسلام کی جڑوں کو اس ملک میں مضبوط کیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک ایسی اسلامی تحریک کی داغ بیل ڈالی جس نے اس ملک میں ایک کثیر تعداد میں ایسے مسلمان پیدا کر دئے۔ جو اس سرزمین پر اقامت دین کے لئے مصروفِ کار ہیں۔

مسلمانوں کے عروج وزوال کا معاملہ بھی پوری طرح اسلام سے وابستہ ہے یعنی مسلمان جب بھی اسلام سے اپنا تعلق مضبوطی کے ساتھ استوار کریں گے۔ اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنائیں گے۔ حقیقی سربلندی اور کامیابی وکامرانی حاصل کریں گے اور جب اسلام سے اپنے تعلق کو کمزور کر لیں گے اور صرف اس سے اپنی وابستگی آباء واجداد کی میراث سمجھ کر رکھیں گے تو زوال وانحطاط ان کا مقدر بن جائے گا۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اسلامی تاریخ کے اوراق الٹنے سے بار بار سامنے آتی ہے۔

خلاف پیغمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

یہی وجہ ہے کہ تباہ حال اور ذلت و پستی سے دوچار مسلمانوں کو اسلام پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی جاتی ہے اور اسلام سے ان کے کمزور و ناتوان تعلق کو مضبوط اور توانا کیا جاتا ہے کہ وہ پھر سے عزت و سربلندی حاصل کر لیں۔

مسلمان کی ایک امتیازی شان اور شخصی حیثیت ہے۔ اس امتیازی شان کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کے لئے نمونہ بنائے۔ توکل علی اللہ اور خوف خدا کی صفت پیدا کر دے، اعمال رذائل سے اجتناب کر کے تقویٰ کی شان اختیار کرے اور من کان اللہ لہ' کے زمرہ میں داخل ہو جائے۔ [1]

مسلمانوں کو عظمت صرف اسلام کی بنیاد پر حاصل ہو سکتی ہے اس کی معقول وجہ بھی ہے۔ ہر فرد اور قوم کے لئے ایک رویہ زندگی ہے۔ مسلمان کے لئے رویۂ زندگی یہ ہے کہ وہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی و اطاعت اختیار کرے اور اس کے قانون کی پیروی کرے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسولؐ کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ چونکہ یہ ساری کائنات اللہؐ کی سلطنت ہے اس میں بھی اس کا بنایا ہوا قانون جاری و نافذ ہے اور مسلمان نے اس صداقت کو قبول کر لیا ہے۔ اس لئے اب اسے اس رویۂ زندگی کو اپنا کر عزت و سربلندی حاصل ہو سکتی ہے اور انحراف کے نتیجے میں اسے ذلت و محرومی ہی ملے گی۔

ہندوستان کی ان تمام اسلامی تحریکوں کے درمیان ایک معنوی ربط اور نظم ہے۔ یہ معنوی ربط و نظم ان تحریکوں کے نصب العین میں

---

[1] مولانا صدرالدین انصاری، مسلمان کیا کریں، مکتبہ جمعیۃ علماء ہند دہلی، ص ۸

بھی ہے اور مقاصد میں بھی ہے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور یقیناً پیدا ہونا چاہیئے کہ ایک ہی نصب العین اور ایک ہی مقاصد کے حصول کے لئے یہ الگ الگ تحریکیں کیوں برپا کی گئی ہیں؟ ایک ہی اسلامی تحریک کے پرچم کے تلے سب کیوں جمع نہیں ہوجاتے؟

سوال معقول اور درست ہے کہ ایک ہی نصب العین اور ایک ہی مقصد کے لئے ایک تحریک ہونا چاہیئے اور ابتداءً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں سب لوگ ایک ہی مقصد کے تحت مل جل کر کام کرتے تھے لیکن اس حقیقت کو بھی ذہن نشین رکھنا ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

اس پاک ہستی کی سیرت ایک لحاظ سے معجزہ ہے۔ مگر دوسرے لحاظ سے اسوہ بھی ہے وہ اخلاق، وہ تقویٰ، وہ حکمت، وہ عدالت، وہ طاقتور شخصیت، وہ انسانیت کبریٰ کی عظیم الشان خصوصیات اب کوئی انسان کہاں سے لاسکتا ہے؟ اس لئے اب کوئی انسان (یا کوئی جماعت) اتنا کمال درجہ کا انقلاب بھی کہاں برپا کرسکتا ہے؟ اس لحاظ سے وہ معجزہ ہے اور قیامت تک کے لئے معجزہ ہے۔ [1]

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کمال درجہ کی ساری صلاحیتوں کا حامل بنا کر اس دنیا میں بھیجا تھا جو ایک طرح سے معجزہ ہے اور معجزہ صرف انبیاء اور رسل ہی کے لئے مخصوص ہے۔ غیر نبیوں اور رسولوں کے لئے نہیں ہے۔ چاہے کوئی انسانی ذات مجدد الف ثانی ہی کیوں نہ ہو، ایک مجدد اور ایک امام کو اللہ تعالیٰ صرف اتنی صلاحیتوں سے نوازتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں دین اسلام کے کسی ایک شعبہ کی تجدید

---

[1] مولانا مودودی۔ تنقیحات ص ۳۱۳، ۳۱۴

کر سکے۔ اور تمام اماموں اور مجددین کے ذریعہ ایسا ہی ہوا ہے۔
کہنے کا مطلب یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کبھی بھی اور کسی بھی زمانہ میں پورے دین اسلام کے احیار کو ایک فرد یا کوئی ایک جماعت قائم نہیں کر سکتی۔ کوئی ایک جماعت پورے دین کی اقامت کا دعویٰ تو کر سکتی ہے لیکن عملاً ناممکن ہے اور پورے دین اسلام کی اقامت مسلمانوں کے لئے ایک فریضہ ہے اس لئے یہ کام اسی طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ متعدد اسلامی تحریکیں اس فریضہ کو انجام دیں اور ہر اسلامی تحریک اپنے ذوق اور صلاحیت کی بنیاد پر دین کے کسی ایک شعبہ کا انتخاب کرے اور اس کا احیار یا تجدید کرے۔
تحریک دارالعلوم دیوبند سے لے کر جماعت اسلامی ہند تک یہی انداز اور یہی رویہ ہے ان تحریکوں کے درمیان جو بظاہر فرق نظر آتا ہے وہ بعض تحریکی قائدین اور ارکان میں تحریکی شعور نہ ہونے کے سبب پیدا ہوا ہے اور مصنوعی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان کی ساری اسلامی تحریکیں ایک ہی روح اور ایک جذبہ کی حامل ہیں کہ اس ملک میں اسلام اور مسلمان نہ صرف زندہ رہیں بلکہ غالب ہو کر رہیں۔
ہندوستان کی اسلامی تحریکیں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی پیش رفت ہیں یوں تو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ایک ایسا ملک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی بات کہی جائے۔
لیکن اسلامی تحریکوں کے معتبر لوگوں کا کہنا ہے کہ اس میں نہ تعجب کی بات ہے اور نہ ایسا ہونا ناممکن ہے بلکہ ذرا تفصیلی جائزہ کی ضرورت ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ ساری دنیا اب تک دو نظاموں کی گرفت میں تھی۔ ایک اشتراکی نظام جس کی باگ ڈور سوویت یونین کے ہاتھوں میں تھی اور دوسرا سرمایہ دارانہ سیکولر جمہوری نظام جس میں قیادت کا منصب امریکہ کو حاصل ہے۔

اشتراکیت ابھی حال ہی میں اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی۔ ہزار ظلم و جبر کے باوجود سُرخ جنت کا خواب بکھر کر رہ گیا اور آج اشتراکیت کو اپنی اولین انقلاب کی سرزمین پر ہی سر چھپانے کی جگہ میسر نہیں ہے۔

دوسری جانب سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو کر بیحد کمزور ہو چکی ہیں اور اب اس کا وقت کب کا پورا ہو جائے؟ کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب "پندرھویں صدی ہجری" میں تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں۔

"مغربی تہذیب کو پوری طرح گھن لگ چکا ہے۔ وہ اب محض اپنی صلاحیت اور زندگی کے استحقاق کی بنا پر جی رہی ہے بلکہ اس لئے کہ بدقسمتی سے کوئی دوسری تہذیب اس کی جگہ لینے کے لئے تیار نہیں، اس وقت جتنی تہذیبیں یا قیادتیں ہیں یا مغربی تہذیب کی لکیر کی فقیر اور اس کی روکھی پھیکی تصویریں ہیں یا اتنی کمزور اور شکست خوردہ ہیں کہ اس سے آنکھ نہیں ملا سکتیں۔ اب اگر اسلامی ممالک اور عالم اسلام مجموعی طور پر اس خلا کو پُر کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں جو مغربی تہذیب کے خاتمہ کے بعد عالم انسانی میں پیدا ہوگا تو اس کو دنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جا سکتا ہے۔ جو سنۃ اللہ کے مطابق ایک جری و قوی اور تازہ دم ملت یا قیادت کے سپرد کیا جاتا رہا ہے۔" [۱]

---

[۱] سید ابوالحسن علی ندوی، پندرھویں صدی ہجری ماضی و حال کے آئینہ میں، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، ص ۴۶

اس لئے بہت سے اسباب وعلل کے باعث کہا جا رہا ہے کہ اب دنیا کا مستقبل اسلام کے ہاتھ میں ہے۔ تباہ حال اور زخموں سے چور انسانیت کا علاج صرف ایک اسلامی نظام سے ہی ممکن ہے اور چونکہ آج کے دور میں کوئی ملک عالمی حالات سے بے تعلق اور الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اس لئے لازمی طور پر ہندوستان پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔

پھر خود ہندوستان بھی اس وقت جس ہولناک اخلاقی بحران سے دوچار ہے کہ ہر شعبہ زندگی میں جھوٹ، ظلم، بدعہدی و خیانت، کم ظرفی، تنگ نظری خودغرضی، سنگ دلی، فرض ناشناسی، تفرقہ، انتشار، بدنظمی، بے ضابطگی نا اتفاقی اور آپس کی بدخواہی، اس کا لازمی نتیجہ اس سرزمین پر ایک بہت بڑی تبدیلی آنا ہے اور اسلامی کارکنان کا احساس ہے کہ یہ تبدیلی اور انقلاب اسلام کے حوالے سے آئے گا۔

اس ملک میں مسلمانوں کا اقلیت میں ہونا اور ہندو احیاء پرستی اور جارحیت ایک سنگین مسئلہ ضرور ہے لیکن یہ کوئی رکاوٹ نہیں ہے اسلام اور مسلمانوں پر اس طرح کی قوم پرستانہ جارحیت کا بار بار حملہ ہوا ہے۔

مولانا علی میاں صاحب لکھتے ہیں:

میری مراد تاتاریوں کے اس حملہ سے ہے جو ۶۱۶ھ میں اس وقت کی سب سے بڑی شہنشاہی علاؤالدین خوارزم شاہ کی سلطنت پر ہوا۔ تاتاری مور و ملخ کی طرح اٹھے اور عالم اسلام پر چھا گئے۔ ترکستان اور ایران کو زیر و زبر اور پورے پورے شہروں کو انھوں نے تاراج و بے چراغ بنا دیا۔ انسانی سروں اور لاشوں کے مینار بنائے۔ پورے پورے شہر قبرستانوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس واقعہ کی ہولناکی کا اندازہ آپ اس سے کیجئے کہ تاریخ عہد وسطی کے لکھنے والے کو اس واقعہ کی ہولناکی کی تصویر کھینچنے کے لئے اس سے بہتر الفاظ نہیں ملے کہ "آسمان نے زمین پر گر کر سب چیزوں

کو مٹا دیا۔" [1]

لیکن یہی فاتح تاتاری اور مغل جنھوں نے مسلمانوں کو اپنے قدموں میں روندا تھا اور مسلمانوں کی تمام شان و شوکت کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ اسلام سے مغلوب ہو گئے۔

مسٹر آرنلڈ لکھتے ہیں کہ ــــــ

"بالآخر اپنی گزشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے اسلام اٹھا اور واعظین اسلام نے ان وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا۔ مسلمان بنا لیا۔" [2]

مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اللہ کی رحمت سے مایوس تو بس کافر ہی لوگ ہوتے ہیں۔"

(سورہ یوسف آیت ۸۷)

البتہ یہ حقیقت نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ اسلامی نظام حکومت کبھی معجزہ کی شکل میں صادر نہیں ہوتا۔ اسلام انسانی زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ نظام یقیناً ہے لیکن یہ انسانی سعی و جہد کے نتیجے میں قائم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی اس انسانی سعی و جہد کے لئے بنیادی طریق کار کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ــــــ

"پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک بار پھر ذہنی غلامی سے نکالا جائے۔ مغربی مفکرین اور اسلامی ورثہ کے انسانی عنصر دونوں کی غلامی سے، سوچنے والے ذہن، تنقیدی شعور اور

---

[1] سید ابوالحسن علی ندوی، پندرھویں صدی ہجری ماضی و حال کے آئینہ میں ص ۱۴، ۱۵

[2] دعوت اسلام، بحوالہ سید ابوالحسن علی ندوی، پندرھویں صدی ہجری ماضی و حال کے آئینہ میں ص ۱۷

تجربی رویّہ کے احیار کے ساتھ خدا سے وابستگی کی ایسی تجدید عمل میں آنا چاہیئے جس سے اخلاقی اقدار کی تحصیل کا وہ طاقتور رجحان پھر سے بحال ہوجائے جو قرن اوّل کے مسلمانوں کی امتیازی شان تھا۔ تقلیدی مزاج کی جگہ اجتہادی فکر، متعین پیمانوں میں ڈھلنے کی آرزو کی جگہ بامقصد تخلیقی سرگرمی اور صرف داخل کی طرف متوجہ مریضانہ ذہنیت کی جگہ تعمیر عالم کے جذبہ سے سرشار شخصیت جو انسانوں کے درمیان انبیائی مشن کی انجام دہی کے لئے بے چین ہو" [1]

تحریک اسلامی سے وابستہ معتبر حضرات کی یہ ساری گفتگو یقیناً حقائق پر مبنی ہے اور موجودہ حالات و کوائف اس کی تصدیق کر رہے ہیں کہ نظام اسلامی کے امکانات بہت روشن ہیں لیکن ہندوستان کی موجودہ اسلامی تحریکیں سب کی سب اپنا کردار پورا کر چکی ہیں اور اب جماعتوں میں تبدیل ہوچکی ہیں۔ ضرورت ہے ایک نئی اسلامی تحریک کی جو ان ہی تحریکوں کے خاکستر اٹھنا چاہیئے اس احساس اور جذبہ کے ساتھ ــــ

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
ایک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

---

[1] ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، اسلامی نشاۃ ثانیہ کی راہ، مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی، ص ۲۱۶، ۲۱۷

کتابیات اور رسائل

مصنف	کتاب
(مولانا سید) ابوالاعلیٰ مودودیؒ	دعوت اسلامی، صفحات ۱۱۲، مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رامپور یوپی ستمبر ۱۹۵۲ء
؍؍ ؍؍ ؍؍	تحریک اسلامی، کامیابی کے شرائط، صفحات ۶۴، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، دہلی۔ جنوری ۱۹۷۴ء
؍؍ ؍؍ ؍؍	مسئلہ قومیت، صفحات ۱۹۶، مکتبہ جماعت اسلامی دہلی، ۱۹۷۷ء
؍؍ ؍؍ ؍؍	مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، ۲ جلدیں۔ مکتبہ جماعت اسلامی رام پور یوپی، ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۴ء
؍؍ ؍؍ ؍؍	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، صفحات ۳۹ مکتبہ جماعت اسلامی حیدر آباد، ۱۹۴۷ء
؍؍ ؍؍ ؍؍	اسلام کا نظام حیات، صفحات ۴۸، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی مئی ۱۹۷۱ء
؍؍ ؍؍ ؍؍	کارکنان تحریک اسلامی کے لئے اہم ہدایتیں، صفحات ۳۰، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۵۲ء
؍؍ ؍؍ ؍؍	روداد جماعت اسلامی ہند حصہ دوم، صفحات ۵۶، مکتبہ جماعت اسلامی حیدر آباد (سنہ اشاعت نہیں چھپا ہے)
؍؍ ؍؍ ؍؍	تنقیحات، صفحات ۳۲۸، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۶۴ء
(مولانا سید) ابوالحسن علی ندوی	تاریخ دعوت و عزیمت، ۵ جلدیں، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۴ء
؍؍ ؍؍ ؍؍	پندرھویں صدی ہجری ماضی و حال کے آئینہ میں، صفحات ۴۸

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۸۰ء

(مولانا سید) ابوالحسن علی ندوی — سیرت سید احمد شہیدؒ ۲ جلدیں، مکتبہ اسلام، گوئن روڈ لکھنؤ ۱۹۶۸ء

" " " — عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح، صفحات ۱۱۲، دار عرفات، ۴۲ گوئن روڈ، لکھنؤ دسمبر ۱۹۷۸ء

" " " — مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، صفحات ۲۸۰ تنویر پریس، لکھنؤ فروری ۱۹۶۰ء

" " " — جب ایمان کی بہار آئی، صفحات ۲۷۰، مکتبہ فردوس، مکارم نگر لکھنؤ، ۱۹۷۴ء

" " " — ایک اہم دینی دعوت۔

" " " — اسلامیات اور مغربیت کی کش مکش، صفحات ۲۵۰ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ ۱۹۶۴ء

" " " — ہندوستانی مسلمان، صفحات ۲۲۳، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۱ء

(مولانا) ابو اللیث اصلاحی ندوی — جماعت اسلامی کا مقصد اور طریقہ کار، صفحات ۷۱، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی دہلی، اپریل ۱۹۵۱ء

" " " — تشکیل جماعت اسلامی کیوں اور کیسے، صفحات ۱۵۰، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۹۰ء

(مفتی حکیم) انتظام اللہ صاحب سہابی — تاریخ ملت، ۱۰ جلدیں، ندوۃ المصنفین دہلی (سنہ اشاعت دیا ہوا نہیں ہے)

ڈاکٹر احتشام احمد ندوی — عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں، صفحات ۲۴۰، انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ، ۱۹۸۸ء

ڈاکٹر اسرار احمد — تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ، صفحات ۲۳۵، دارالاشاعت الاسلامیہ کرشن نگر۔ لاہور (پاکستان) ۱۹۶۶ء

اسعد گیلانی	مولانا مودودی سے ملئے، صفحات ۴۹۶، مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یوپی) جون ۱۹۶۶ء
اسیر ادروی	تاریخ جمعیۃ العلماء ہند، صفحات ۵۶۹، شعبہ اشاعت جمعیۃ العلماء ہند دہلی، ۱۹۸۲ء، ۱۴۰۳ھ
اشتیاق حسین قریشی	اسلامی نظریہ حیات، صفحات ۱۵۶، کراچی یونیورسٹی کراچی (پاکستان) ۱۹۶۳ء
(کنور) اشرف	ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں (ترجمہ از قمرالدین) صفحات ۱۴۰، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا ۱۹۷۴ء
افتخار بلخی (مترجم)	تاریخ افکار و علوم اسلامی، ۲ جلدیں (ج ۱/۴۸۰ ج ۲/۴۴۸) اسلامک پبلیکشنز لمیٹیڈ لاہور (پاکستان) ج ۱/۱۹۶۸ء ج ۲/۱۹۷۴ء
افتخار فریدی	تبلیغی کام، صفحات ۸۸، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۷۷ء
اقبال حسن خاں	شیخ الہند مولانا محمود الحسن حیات اور علمی کارنامے، صفحات ۴۰۷ اے ایم یو علی گڑھ ۱۹۷۳ء
الٰہی بخش	روداد (۲۲-۲۳-۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء) جلسہ دستار بندی مدرسہ فیض عام کانپور، صفحات ۱۵۹، ندوۃ العلماء لکھنؤ
امین احسن اصلاحی	تدبر قرآن، ۹ جلدیں، تاج کمپنی، ترکمان گیٹ دہلی ۱۹۸۹ء
”	جماعت اسلامی کے خلاف قرارداد جرم، صفحات ۷۲، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ ستمبر ۱۹۸۱ء
(سید) انور علی	رد فتنہ، صفحات ۲۰۸، ادارہ شہادت حق، جامع مسجد دہلی ۱۹۷۹ء
بہار برنی	فسادات ریلیف اور اس کی دشواریوں کا حل، شعبہ نشر و اشاعت تعلیمی ملی کانفرنس۔ نئی دہلی ۱۹۸۴ء

پروین روزینہ — جمعیۃ علماء ہند جلد اوّل، صفحات ۵۰۷، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت اسلام آباد (پاکستان) ۱۹۸۰ء

تابش مہدی — جماعت اسلامی حقیقت کے آئینے میں، صفحات ۵۶ مکتبہ الایمان دیوبند یوپی (سنہ اشاعت نہیں چھاپا گیا ہے)

ثروت صولت — مولانا مودودی کی تقاریر، صفحات ۳۸۸، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور (پاکستان) نومبر ۱۹۷۶ء

(سید) جلال الدین انصر عمری — عورت اسلامی معاشرہ میں، صفحات ۲۳۱، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی دہلی، ۱۹۶۴ء

حبیب احمد — ہندوستان میں مسلم حکومتوں کے اساس (ترجمہ از مسعود الحق) صفحات ۴۶ ترقی اردو بورڈ، ۱۹۸۴ء

حبیب الرحمٰن خاں صابری — مفتاح التقویم، صفحات ۳۸۸، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۷۷ء

(مولانا) حبیب الرحمٰن قاسمی — اسلام میں امامت وامارت کا تصور، ص ۱۱۹، دفتر امارت شرعیہ ہند بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی ۱۹۸۷ء

(مولانا) حسین احمد مدنی رح — نقش حیات دوم، صفحات ۲۸۶، محمد اسعد خادم دارالعلوم دیوبند ۱۹۵۴ء

خالد حامدی — مولانا مودودی، حالات، دینی خدمات، آخری سفر، صفحات ۲۴۰ ادارہ شہادت حق دہلی نومبر ۱۹۷۹ء

خورشید احمد — اسلامی نظریہ حیات ۳ جلدیں، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی کراچی (پاکستان) ۱۹۶۳ء

خورشید احمد — ادبیات مودودی، صفحات ۴۴۸ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۰ء

خورشید مصطفی رضوی — جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، صفحات ۵۷۲، مکتبہ برہان اردو بازار دہلی۔ ۱۹۵ ء

(ڈاکٹر) خورشید نعمانی ردولوی — دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات، صفحات ۳۴۰، اکتوبر ۱۹۷۷ء

جمعیۃ علمار ہند	دستور اساس جمعیۃ العلمار ہند، دہلی (تاریخ اشاعت نہیں ہے)
(شیخ الحدیث مولانا محمد) زکریا صاحب کاندھلوی	دہلی کی تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات، صفحات ۲۲۴ یحیوی کتب خانہ مظاہر العلوم سہارنپور یو پی، ۱۹۷۲ء
راغب الطباخ	الثقافت الاسلامیہ، صفحات ۵۱۲، ادارہ معارف اسلامی کراچی (پاکستان) جولائی ۱۹۶۶ء
(دارالعلوم دیوبند)	روداد ۱۳۲۳ھ دیوبند (یو پی) تاریخ اشاعت درج نہیں ہے)
سر سید احمد خاں	اسباب بغاوت ہند، صفحات ۸۴، یونیورسٹی پبلیشرز، ایم، یو علی گڑھ ۱۹۵۸ء
(مولانا) سعید احمد اکبر آبادی	مسلمانوں کا عروج وزوال، صفحات ۳۵۱، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۳ء
شعبہ تنظیم	جماعت اسلامی ہند کیا ہے اور کیا نہیں، صفحات ۳۱ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی فروری ۱۹۷۲ء
شعبہ تنظیم	دعوت اسلام کیا ہے، صفحات ۵۶، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ مئی ۱۹۷۰ء
شعبہ نشر واشاعت جماعت اسلامی	پالیسی و پروگرام (اپریل ۸۶ ۱۹ء تا مارچ ۱۹۹۰ء) صفحات ۱۶ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔
شمس تبریز خاں	تاریخ ندوۃ العلمار حصہ دوم، صفحات ۵۲۴، دفتر نظامت ندوۃ العلمار لکھنؤ ۱۹۸۴ء
شمس تبریز خاں	صدر یار جنگ، صفحات ۸۴، مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلمار لکھنؤ ۱۹۷۲ء
صدرالدین اصلاحی	تحریک اسلامی ہند، صفحات ۲۸۸، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی، مئی ۱۹۷۰ء
صدرالدین انصاری	الزامات کی اصلیت، صفحات ۱۱ شعبہ نشر واشاعت جمعیۃ العلمار ہند دہلی (سنہ اشاعت نہیں چھپا ہے)

صدرالدین انصاری — ایک ناگزیر فیصلہ اور اس کا پس منظر، صفحات ۲۳، نشرو اشاعت جمعیۃ علماء ہند دہلی (سنہ اشاعت نہیں چھپا ہے)

صدرالدین انصاری — مسلمان کیا کریں، صفحات ۱۲۸، حلقہ ادب لکھنؤ ۱۹۳۹ء

(سید) طفیل احمد منگلوری — مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحات ۲۰، کتب خانہ عزیزیہ دہلی ۱۹۴۵ء

عابد حسین — قومی تہذیب کا مسئلہ، صفحات ۲۰۴، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۵۵ء

عارف دہلوی — جماعت اسلامی ۸۰ علماء کی نظر میں، صفحات ۱۰۴، مکتبہ نشان راہ دہلی (سنہ اشاعت نہیں چھپا ہے)

عبدالقادر عودہ شہید مصری — قانون الٰہی یا انسانی، صفحات ۹۶ فردوس پبلیکیشنز دہلی۔ فروری ۱۹۸۰ء

(مولانا) عبدالقیوم — شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، صفحات ۳۴۴، ادارہ معارف ملی کرنیل گنج کانپور، اگست ۱۹۶۷ء

(پروفیسر) عبدالقیوم — تاریخ ادبیات، مطبوعہ جامعہ کراچی (پاکستان) (سنہ اشاعت کا صفحہ پھٹا ہوا ہے)

(مولانا) عروج قادری — عہد حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح پر ایک نظر، صفحات ۱۱۶، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ۱۹۷۹ء

(مفتی) عزیز الرحمٰن — تذکرہ مشائخ دیوبند، صفحات ۳۴۰، ادارہ مدنی دارالتالیف بجنور ۱۹۶۷ء

عمر حیات خاں غوری — اقبال اور مودودیؒ کا تقابلی مطالعہ، صفحات ۲۸۸ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی مئی ۱۹۸۱ء

غلام حیدر — آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی، صفحات ۲۲۴ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر دہلی مارچ ۱۹۸۷ء

فریڈمان — جمعیۃ العلماء ایک اسرائیلی محقق کی نظر میں: (ترجمہ از عبدالحی فاروقی) صفحات ۳۰ شعبہ نشرو اشاعت جمعیۃ العلماء ہند دہلی۔

سنہ اشاعت نہیں چھپا ہے۔

فیوض الرحمٰن — مشاہیر علماء دیوبند جلد اول، صفحات ۶۶۴، المکتبۃ العزیزیہ، اردو بازار لاہور (پاکستان) ۱۹۷۶ء

(ڈاکٹر) لوتھراپ اسٹارڈ — جدید دنیائے اسلام (ترجمہ از محمد جمیل الدین) صفحات ۲۴۶ عثمانی پریس بدایوں یوپی ۱۹۲۳ء

متین طارق باغپتی — مولانا مودودی اور فکری انقلاب، صفحات ۳۳۸ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، مارچ ۱۹۷۹ء

(ڈاکٹر) مجیب اشرف — جدید ہند کے سیکولر معمار، صفحات ۲۵۶، مجیب اشرف ذاکر نگر اوکھلا۔ نئی دہلی ۱۹۸۹ء

(سید) محبوب رضوی — تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اوّل، صفحات ۵۴۴، ادارہ اہتمام دارالعلوم دیوبند یوپی ۱۹۷۷ء

(سید) محبوب رضوی — تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ دوم، صفحات ۳۴۶، ادارہ اہتمام دارالعلوم دیوبند یوپی ۱۹۷۸ء

(مولوی) محمد اسحاق جلیس ندوی — تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اوّل، صفحات ۳۵۲، دفتر نظامت ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۸۳ء

(مولانا) محمد اسرار الحق — ملی کاوش، صفحات ۳۲، شعبہ نشر و اشاعت جمعیۃ العلماء ہند دہلی ۱۹۸۹ء

" " — اصلاح معاشرہ اور معاشی جدوجہد، صفحات ۳۸۰، شعبہ نشر واشاعت جمعیۃ العلماء ہند دہلی ۱۹۹۱ء

" " — ملی زندگی کا اہم موڑ، صفحات ۳۲، شعبہ نشر واشاعت جمعیۃ العلماء ہند دہلی ۱۹۸۷ء

" " — ملی کردار، صفحات ۳۵، شعبہ نشر واشاعت جمعیۃ العلماء ہند دہلی ۱۹۸۸ء

" " — خونریزی کا سال، صفحات ۴۴، شعبہ نشر واشاعت تعلیمی و ملی کانفرنس۔ دہلی ۱۹۸۳ء

(مولانا) محمد اسلام قاسمی — دارالعلوم دیوبند کی ایک صدی کا علمی سفرنامہ، صفحات ۱۲۰ مکتبہ دانش دیوبند یوپی ۱۹۸۰ء

محمد اکرام — شبلی نامہ، صفحات ۲۶۴ مطبوعہ کا صفحہ پھٹا ہوا ہے۔ ۱۹۴۶ء

" — موج کوثر، صفحات ۳۶۸، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور (پاکستان) ۱۹۸۲ء

محمد الحسنی — پیام ندوۃ العلماء، صفحات ۱۲۸، دفتر اجلاس ندوۃ العلماء لکھنؤ ستمبر ۱۹۷۵ء

" — سیرت مولانا محمد علی مونگیری (بانی ندوۃ العلماء) صفحات ۴۲۴ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۶۴ء

" — روداد چمن، صفحات ۲۹۲، دفتر نظامت ندوۃ العلماء لکھنؤ، جولائی ۱۹۷۶ء

(قاری) محمد ایوب — تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ، صفحات ۱۵۲، مکتبہ معاویہ کراچی (پاکستان) ۱۹۷۱ء

محمد ایوب اصلاحی — عورت تہذیب کے دوراہے پر، صفحات ۱۱۲، اسلامک پبلیکیشنز رام پور ۱۹۷۷ء

(سید) محمد ثانی حسنی — سوانح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ، صفحات ۷۹۲ مکتبہ اسلامی لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۶۷ء

(مولانا قاری) محمد طیب قاسمی — دیوبند کی صد سالہ زندگی، صفحات ۱۲۸، دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند، جون ۱۹۶۵ء

" " — تاریخ دارالعلوم دیوبند، کراچی (پاکستان) ۱۹۷۲ء

" " — فطری حکومت، صفحات ۲۸۸ مکتبہ تاج المعارف، ۱۹۴۹ء

(میاں) محمد عیسیٰ — تبلیغ کا مقامی کام، صفحات ۱۷۴، ربانی بک ڈپو، کٹرہ شیخ چاند لال کنواں۔ دہلی (سنہ اشاعت نہیں چھپا ہے)

مصنف	کتاب
اسید، محمد میاں	علمائے حق، دو جلدیں، صفحات ج ۱/۳۰۴، ج ۲/۳۶۷ دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی، ج ۱/۱۹۴۸ء، ج ۲/۱۹۴۸ء
(مولانا) محمد منظور نعمانی	ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس، صفحات ۱۷۶، الفرقان بکڈپو۔ لکھنؤ۔ ۱۹۷۸ء
(ڈاکٹر) محمد نجات اللہ صدیقی	اسلامی نشاۃ ثانیہ کی راہ، صفحات ۲۲۴، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۷۴ء
(مولانا مفتی) محمد یوسف	مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ ۲ جلدیں، صفحات ج ۱/۴۴۴، ج ۲/۴۳۹، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ ۱۹۷۹ء
مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی	جماعت اسلامی ہند' ایک تعارف، صفحات ۹۶، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی۔ ۱۹۶۷ء
مکتبہ جماعت اسلامی ہند حیدرآباد، دکن	روداد جماعت اسلامی حصہ اول (اجتماع اول و اجتماع دربھنگہ) صفحات ۸۰
مکتبہ جماعت اسلامی ہند حیدرآباد	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم، صفحات ۵۶
مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور	دستور جماعت اسلامی ہند (اپریل ۱۹۵۶ء/ مارچ ۱۹۵۷ء/ جنوری ۱۹۵۸ء) صفحات ۴۸
(مولانا) مناظر احسن گیلانی	تذکرہ شاہ ولی اللہ، صفحات ۲۲۸، اسلامک اکاڈمی لائل پور (پاکستان) ۱۹۶۵ء
؍؍ ؍؍ ؍؍	سوانح قاسمی جلد دوم، ص ۵۱۶، نیشنل پریس دیوبند، ۱۳۷۵ء
(صوفی) نذیر احمد (کاشمیری)	جماعت اسلامی کے دین کا خلاصہ، صفحات ۱۲۸، اسلامک پبلیکیشنز۔ سولنیہ، سری نگر۔ کشمیر، ۱۹۷۹ء
نین تارا سہگل	ہندوستان کی تحریک آزادی (ترجمہ از ظہور محمد خاں) صفحات ۱۳۳ نیشنل کونسل آف ایجوکیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ دہلی' اپریل ۱۹۷۳ء
وحید الدین خاں	تبلیغی تحریک، صفحات ۹۴، مکتبہ الرسالہ دہلی، ۱۹۸۵ء

وصی اقبال　　　اسلامی نظام ایک نظر میں، صفحات ۸۸، مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی ۱۹۸۲ء

ماہنامہ "ترجمان القرآن" (حیدرآباد)

ماہنامہ "الفرقان" بریلی، لکھنؤ

ماہنامہ "زندگی" رام پور

روزنامہ سیاست، لاہور (پاکستان)

روزنامہ عصر جدید، کلکتہ

ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (پاکستان)

ماہنامہ "الرشید" لاہور (پاکستان)

سہ روزہ "دعوت" دہلی

روزنامہ "الجمعیتہ" دہلی

ہفت روزہ تعمیر حیات، ندوۃ العلماء لکھنؤ

ماہنامہ "دارالعلوم" دارالعلوم دیوبند

ماہنامہ "برہان" ندوۃ المصنفین۔ دہلی

ماہنامہ "معارف" دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ

ماہنامہ "الحسنات" رام پور

ماہنامہ "حجاب" رام پور

ماہنامہ "ذکریٰ" رام پور

ماہنامہ "جامعہ" جامعہ ملیہ اسلامی، نئی دہلی

ماہنامہ "تحریک" دہلی

ہفت روزہ "ندائے ملت" لکھنؤ

کانتی (ہندی) دہلی